

DYAL SINGH PUBLIC LIBRARY
ROUSE AVENUE,
NEW DELHI-1

ROUSE AVENUE, NEW DELHI-1.

۱۲ شی

Date of release for loan

This book should be returned on or before the date last stamped below. An overdue charge of 0.10 P. will be charged for each day the book is kept overtime.

[illegible]

شیدلہ

ایک معاشرتی ناول

فرزانیہ یاسمین

قیمت :- نو روپیہ پچاس پیسے

ناشر :- جمن بکڈپو، اردو بازار، دہلی

مطبع :- سودیتھو پریس دہلی

”اگرچہ — یہ کیا! —“

اس نے گھبرا کر زور سے بریک لگائی — اس کا دل تیزی سے دھڑکا رہا تھا۔ جسم میں کچا پاہٹ، پیدا ہو گئی تھی اور ہاتھ اور لباس پذیر تھے۔ اس حادثہ نے اسے پریشانی کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ وہ اتنا اناڑی ڈرایٹور بھی نہیں تھا کہ اس قسم کا حادثہ کر مہینا — تو سچ یہ کیا ہو گیا تھا؟ یہ روکی اپنا منہ کہاں سے آکر جہنم زون میں اس کی برلینا کے سامنے پہنچ گئی تھی۔ وہ اس حادثہ کی توقع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن حادثوں کی توقع بے معنی چیز ہے۔ حادثے تو ہوتے ہی توقع کے خلاف ہیں۔ اور بعض حادثے تو انسانی زندگی میں کسی انقلاب کا موجب بن جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت اس کے ذہن کی تہوں میں کسی انقلاب کا تصور نہیں بلکہ خوف کا سایہ لہرا رہا تھا۔ بریک لگنے کے بعد گاڑی رک چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو گیا کیا ہے۔ آخر کار وہ سنبھلا، اپنے حواس مجتمع کئے۔ اور جلدی سے نیچے اترا ہیڈ لائٹس

کی روشنی میں ایک جوان لڑکی کو گرتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے اعصاب ہنوز جھنجھٹا رہے تھے۔ وہ خواب کے سے حلقوں چلتا اس طرف بڑھا۔ جہاں لڑکی گری تھی۔ اس سے پیشتر کہ وہ وہاں پہنچتا لڑکی اٹھ چکی تھی اور گھبرائے ہوئے انداز میں اپنے کپڑے جھاڑ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جو شیشی تھی پختہ سڑک پر گر کر ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ سڑک ویران تھی اور اس سسنان ماحول میں لڑکی نے اپنا ایک اس طرح ساٹنے آجائے پر اسے شدید حیرت جوئی تھی اور وہ اس حادثے سے بے حد پریشان ہو گیا تھا۔ لڑکی کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔

آسمان پر گھنیرے سیاہ بادل اُٹنڈے پڑ رہے تھے اور ان بادلوں کی موٹی سیاہ تہہ کے نیچے بھی آفتابیں لکیر لکیر باسا رہی تھی۔ ہوا بھی تیز و تند تھی یوں لگتا تھا جیسے عنقریب باد و باران کا طوفان آجائے گا۔ اگرچہ یہ طوفان ابھی اٹھا نہیں تھا مگر اس کے دل میں جذبات کے مد و جسز رہ رہا تھے۔ لڑکی نے کس پر سی کے عالم میں اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر گردن جھکالی۔ لڑکیاں ہل کادل دھک سے رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے یہ خاموش کرنے والی نظریں اس کا دل چیر گئی ہوں۔ آنکھیں کیا تھیں۔ غم والی اور شکایت کا ایک سمندر اپنے اندر سمیٹے ہوئے ان کی گہرائیوں میں دبی پھٹی ہلکی سی اداس اور حزن و ملال کے تاثرات نے اسے پریشان کر دیا اس کا غمیرات ملاحت کے نشتر چبوتے لگا۔

جب سکوت کے لمحے ناگوار ہوئے لگے اور لڑکی بھی کپڑے جھاڑ چکی تو بھلا کہنے کے لیے لب ہلائے مگر وہ کوشش کے باوجود سمجھ نہ کہہ سکا جیسے لڑکی کے

سہم آفریں حسن کے جلال نے اس کی قوت گویائی سلب کر دی ہو۔ وہ مٹکی باندھے
لڑکی کی حرکات اور اس کے خاموش احتجاج کو دیکھ رہا تھا۔

ہوا کی سرسراہٹ میں شدت آنے لگی تھی موسم گرما تھا مگر پھر بھی ہوا۔
سکون پہنچانے کے بجائے خوف کا احساس دلاتی تھی۔ لڑکی نے اسے ایک نظر
دیکھا اور پھر اس کی طرف سے نظریں گھما کر شیشے کے ان ریزوں کو دیکھا جو اس
کے ہاتھ میں لی ہوئی شیشی کے ٹوٹنے سے منتشر ہوئے تھے۔ اس نے ایک بھنڈی
گہری سانس لی۔ جیسے ان ریزوں کی طرح اس کی امیدوں کا سلسلہ بھی ٹوٹ
گیا ہو۔

لڑکی کے شہابی بشارتوں پرچے تھے اور وہ بہت ہی منموم دکھائی دے رہی تھی۔
سہیل لڑکی کی بے بسی اور انفرادی کو محسوس کر کے تڑپ اٹھا۔ وہ میڈلائٹس
میں اس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو اچھی طرح محسوس کر چکا تھا۔

بالآخر اس نے حوصلہ کیا — ”آپ — آپ کو چوٹ تو نہیں
آئی۔“

لڑکی نے شکوہ بھری نظروں سے لے ایک لمحہ دیکھا۔ اور پھر نظریں جھپکائیں
سہیل نے محسوس کیا۔ جیسے لڑکی کی نگاہیں، نگاہیں نہ تھیں، بلکہ برجھیاں تھیں۔
جو ایک دم اس کے سینے میں پیوست ہو گئیں تھیں۔ وہ اپنے دل میں ابھرتے
ہوئے درد و کرب اور ملن کو دبا نہ سکا۔

”میں نے“ — وہ رک کر بولا — پوچھا تھا آپ کو چوٹ تو نہیں
آئی۔“

تھوڑی جھپک، قدرے توقف اور رکاوٹ کے بعد لڑکی کے لب، بے
چوٹ! اس کا لہجہ انتہائی زہریلا تھا — گاڑی میرے اوپر سے گزر

جانی تو شاید موت، کا بھی احساس نہ ہوتا، چوٹ تو بہت معمولی چیز ہے۔
 ”اے یوں لگا جیسے سارے جہاں کا درد، بے بسی اور لاچارگی اس
 مترنم آواز میں سمٹ کر ایک پر سوز نغمہ بن گئی ہو۔ اور وہ حزنِ نہ نغمے کی ان لہروں
 میں ڈوب گیا ہو۔

”مجھے افسوس ہے۔۔۔“ اس کے لہجے میں تاسف تھا۔۔۔ میں نے
 آپ کو دکھ پہنچایا ہے۔“

”ہم تو پیدا ہی شاید دکھ پہننے کے لیے ہوئے ہیں۔۔۔“ وہ ایک
 لمحے کے لیے رکی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک رہبر ملی مسکراہٹ پھیلی۔ لیکن جلد ہی
 معدوم ہو گئی۔۔۔ آپ کیا دکھ پہنچائیں گے؟
 ”آپ تو واقعی بہت دکھی معلوم ہوتی ہیں۔“ اس نے ہمدردی
 جتائی۔

”ہمدردی کا شکریہ!۔۔۔“ اس نے رک کر اُسے گہری نظروں سے
 دیکھا۔۔۔ ”یہی کیا کم ہے خیرِ دکھ اٹھانے کے لیے بچ گئی ہوں؟
 ”آپ نے مجھے بھی مرنے سے بچا لیا ہے۔“ وہ غیر ارادی طور
 پر کہہ گیا۔

”آپ کو۔۔۔ جی ہاں، تاکہ پھر کسی سا بگیر کو کچھل سکیں۔“
 طنز کی برہمچی اس کے دل میں اترتی محسوس ہوئی۔
 میں نے معذرت کی ہے۔ شرمندہ ہوں، لیکن یہ سب کچھ دانستہ
 تو نہیں ہوا۔“ سہیل کے لہجے میں تاسف کی گہرائی تھی۔

لڑکی کے رخسار ایک دم شہابی ہو گئے۔ ایک بجلی سی شرم اس کے چہرے
 پر پھیل گئی۔ جو چند لمحوں کے بعد ہی مٹ گئی۔ لڑکی نے اس کی طرف دیکھے پناہ

آگے بڑھا دیئے۔

”وہ چونکا۔ آپ — آپ کہاں جائیں گی؟“ اس نے شیریں آوازیں استفسار کیا۔

”گھر! — لڑکی نے مختصر جواب دیا۔

”چلیے! — میں آپ کو پہنچا دوں۔“

”نہیں — میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“ اس نے تیکسی آوازیں

کہا۔۔۔ میں پیدل چلنے کی عادی ہوں؟

لڑکی رک چکی تھی۔ اس کے قدم ٹھہر گئے تھے۔ سہیل کی آواز نے اسے

روک لیا تھا۔ جب پھر سکوت گہرا ہونے لگا تو لڑکی کے قدم پھر اٹھنے کے

لئے چلنے لگے۔ وہ بے چین ہو گیا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ! — اس دیران شرک پر اس طرح۔

اچانک کیسے آگئی تھیں؟“

لڑکی کے ہونٹوں پر ایک بھکی مسکراہٹ دھواں بن کر پھیل گئی۔ اس کے

خفک لب دو تین بار لرزے۔

”ہاں کہ آپ جیسے بڑے لوگوں کی موٹریں میرے بیکار جسم کو کھل دیں۔“

اس کے بوجہ کی تلخی پھر پلٹ آئی۔۔۔ ”اور مجھے ہمیشہ کے لیے غموں سے نجات

مل جائے؟“

یہ تو میں جان گیا ہوں کہ آپ بہت ہی دکھی ہیں۔ اور اس وقت بڑے

حالات نے بھی دوچار ہیں۔“ وہ پھر تھوڑے وقفہ کے بعد بولا۔

”مگر کیا آپ غمزہ کو چھوڑ کر سنجیدگی سے بات نہیں کر سکتیں؟“

”اوہ نہ! سنجیدگی! — اس نے سہیل کو بنور دیکھا۔ اس نے نظریں

چمکائیں۔ اور وہ اس گرم گرم نظروں کی شاید تاب نہ لاسکا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ یکایک لڑکی کی زہریلی آواز اس کے پردہ سماعت سے ٹکرائی۔

”وہ ڈاکٹر! — اس ڈاکٹر نے بھی یہی کہا تھا کہ سنجیدگی سے بات کرو۔ سنجیدگی بہ سنجیدگی! — آخر بے کیا چیز یہ! — حبیب میں پیسہ نہ ہو مگر میں بیماری ہو۔ ڈاکٹر محض اپنی بھاری فیس کے لیے سنجیدگی کا درس دیتا ہے۔ وہ مجھے صرف سنجیدگی کی تلقین کر کے اپنے آرام کدہ میں چلا گیا۔ وہ میرے ساتھ اس لیے نہ آسکا کہ میں فیس نہ دے سکتی تھی۔ آپ نے مجھے اپنی کار کے نیچے کھل ڈالنے کی کوشش کی اور اب سنجیدگی کا درس دے رہے ہیں سنجیدگی! سنجیدگی! کیا بے بس لوگوں کا ایک ہی علاج ہے سنجیدگی!“

اس کے دل میں کر دئیں لینے ہوئے غم ایک دم باہر آ گئے۔ آنکھوں کے ذریعے انہیں باہر نکلنے کی راہ مل گئی تھی۔ لڑکی بہت ہی جذباتی ہو گئی تھی۔ اس نے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے آنسو ہاتھوں کے نیچے رخساروں پر پھیل رہے تھے۔ جو اس کے انتہائی پریشان حالت کی غمازی کر رہے تھے۔ وہ چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے دکھ بھرے جذباتی ہجے کو دیکھ کر وہ حواس باختہ ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیا کرے۔ وہ بوجھلا گیا تھا۔ لڑکی حسین تھی، بلاشبہ حسین تھی۔ اس کے رخساروں کو سرخ ہونا چاہیے تھا۔ مگر برے حالات نے ان رخساروں کی سرخی کو ایک اداس زرردی میں بدل دیا تھا۔

جانے نہ کیسے خونداک غم تھے جنہوں نے اس گلاب کے پھول کو کھلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے حسن کو خزاں آلود کر دیا تھا۔ اس کے بال سیاہ چمکیلے اور

گئے تھے۔ مگر انھیں نامساعد حالات کی وجہ سے کسی قسم کی تزیین و آرائش سے دور ہی رکھا گیا تھا۔ وہ پریشانی سے ادھر ادھر چہرے کے گرد بکھرے ہوتے تھے لڑکی کی عمر بشکل سترہ سال یا اٹھارہ سال ہوگی۔

وہ رونے چلی جا رہی تھی۔ اور سہیل کے ذہن میں خیالات کے دھاگے الجھ رہے تھے۔ وہ انھیں سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر دھاگے سلجھ نہ پا رہے تھے۔ انھیں سہرا نہ مل رہا تھا۔

آپ! رونے لگیں۔ اس کی آواز میں اپنائیت، ہمدردی اور درد کا احساس تھا۔ یوں رونے سے غم کم نہیں ہوتے اور بڑھتے ہیں۔ ان کا مقابلہ تو مسکراہٹ کے شگوفوں سے کیا جاتا ہے۔

یہ سن کر لڑکی نے آہستہ آہستہ ہاتھ نیچے کیے۔ آنسو بھری آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

میں سمجھ گیا ہوں۔ وہ ایک لمحہ کے لیے رُکا۔ آپ کے والد بیمار ہیں۔ اور آپ ڈاکٹر کے یہاں سے ناکام واپس آ رہی ہیں۔ وہ چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر بولا۔ یہی بات ہے نا۔ وہ بدستور چپ تھی۔

میری بات کا جواب نہیں دیا آپ نے! — وہ بے چینی سے بولا۔

ٹھیک کہا ہے آپ نے — وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ اس کی آواز اس کے سینے میں کسی جگہ اترتی چلی گئی۔ ایسی جگہ جہاں انجانی کسک اور درد کا احساس ہوتا ہے۔ لڑکی کی آواز نشہ آور، سحر خیز بھی تھی۔ اور غم آلود بھی۔

ہوا اب پہلے کی نسبت زیادہ تند ہونے لگی تھی اور بادلوں کی گرج اور
بجلی کی چمک میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ دفعتاً آسمان سے بارش کا پہلا قطرہ ٹپکا۔
وہ چونک پڑی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت سمٹ آئی۔

”بارش! — اس کی آواز میں حیرت اور پریشانی تھی۔
”ہاں بارش! — خدا کی رحمت! — وہ مسکرایا۔ لڑکھائے اُسے
ایک نظر دیکھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر ملتر اور زہر بھری مسکراہٹ پھر سے
پلٹ آئی۔

”خدا کی رحمت! — لڑکی کا لہجہ تلخ جذبات کی شدت سے دکھائی دیا
— جو ہر ایک کے لیے نہیں۔“

”ایسی گناہ ہے! — اس نے شکایت بھرے لہجے میں نرمی سے
کہا۔ ”میرے ساتھ آئیے! ڈاکٹر اب آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔ اور آپ
کو ناکام لوٹنا نہیں پڑے گا۔“

وہ چونکی اور آنسو پونچھ کر اُسے دیکھا۔ مگر وہ وہیں کھڑی رہی — اور
عجیب شش درخ کے عالم میں اُسے دیکھتی رہی۔ جیسے سوچ رہی ہو۔ اس نوجوان
پر بھروسہ کرے یا نہیں۔ اسے قابل اعتماد سمجھے یا نہیں؟

”شاید! آپ کو میرے ساتھ جانے میں غار ہے۔ — سہیل نے سنجیدگی
سے کہا — آپ مجھ پر اعتبار کرنا نہیں چاہتے! — آپ مجھے اعتماد
کے قابل نہیں سمجھتے!“

وہ خاموش ہو گیا۔ بارش کے قطروں میں دھیرے دھیرے اضافہ ہونے
لگا۔ بادل زور سے گرجے۔ بجلی جلدی جلدی روشن لکیریں بنانے لگی۔
اب وہ بارش میں بیٹھنے لگے تھے۔

لڑکی نے اسے غور سے دیکھا۔ شاید وہ آخری فیصلہ کر چکی تھی۔
وہ آگے بڑھی اور اس کے پیچھے چند قدم چلی۔ سہیل نے مطلقاً نشست
کا دروازہ کھول دیا۔ وہ پیچھے بیٹھ گئی سہیل جلدی سے پلٹا اور ڈرائیونگ
سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بارش کے قطرے اس کی تیلون اور بش مشرٹ پر کہیں کہیں چپک
رہے تھے۔ اور آہستہ آہستہ کپڑوں میں جذب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ بالکل اسی
طرح اس کے پریشانی خیالات لاشعور کے کسی کونے میں جا کر جذب ہونے کی
کوشش کر رہے تھے۔

لڑکی بھی اب قدمے پر سکون حالت میں تھی جیسے وہ کسی بہت بڑے
کرنباک جذباتی موڑ سے گزر کر عافیت کے کنارے پہنچ گئی ہو۔ سہیل نے اُسے
ایک نظر دیکھ کر یہی اندازہ لگایا تھا۔

سہیل نے پلٹ کر اسے پھر دیکھا۔ لڑکی کے بالوں پر بارش کے قطرے
موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اور کار کی دھیمی لائٹ میں ستاروں کی طرح دمک
رہے تھے۔ وہ اسے ایک لمحہ کے لیے صحن کی دیوہی دھیس دکھائی دی۔ مگر
دھیس نے اس کے لیے اپنے ذہن میں کوئی خاکہ نہ بنایا تھا۔ اس نے سہیل کے
کسی نفسیاتی نظریے کی تقلید میں کسی قسم کا تاثر نہیں دیا تھا۔ اسے تو صرف اپنے
بیارباب کا ہی خیال تھا اور بس..... اس کے چہرے سے کم از کم
یہی عیاں تھا۔

سار کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔

”آپ کس ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں۔“ سہیل نے پوچھا۔
 ڈاکٹر ریاض کے پاس! — ”لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔“
 یہاں سے تقریباً چار لاکھ کے فاصلے پر ان کی کونسی ہے۔“
 ”ہوں! —“ وہ بولا — ”جیسی آپ اس دیران سڑک پر نکل آئی
 تھیں۔“ مگر مگر اس سڑک پر نہیں آتا چاہیے تھا۔“
 اس سڑک سے واپس لوٹنے میں راستہ ذرا منحصر ہو جاتا ہے۔ لڑکی نے
 مترنم آواز میں جواب دیا۔

ان کے درمیان پھر سکوت پھیل گیا۔
 کار سڑکوں کے موڑ کاٹنے لگی۔ بارش تیزی سے برسنے لگی تھی۔ بادلوں کی
 گرج اور بجلی کی چمک میں بھی تیزی ہو رہی تھی۔
 ”آپ کالج میں پڑھتی ہیں؟ —“ سہیل نے جھجکتے جھجکتے پوچھا۔
 ”پڑھتی تھی! —“ اس نے جواب دیا۔
 ”کہاں تک پڑھا ہے آپ نے؟“

”ایف اے کیا ہے! —“ اس نے جواب دیا اور ذرا تلخ آواز میں
 کہا — ”خدا کے لیے یہ سلسلہ بند کیجئے۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ آپ ..
 گاڑی کی رفتار بڑھائیے!“
 لڑکی کے اس انداز پر اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ اپنے دل میں۔
 ندامت سی محسوس کر رہا تھا۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ اس کا نام پوچھ لے۔
 مگر لڑکی کے لہجے کی تلخی سے وہ اتنی جرأت نہ کر سکا۔ اور اس خیال کو ذہن
 کے پردوں میں دفن کر دیا۔ اس نے ایک سیلیٹر دبا کر گاڑی کی رفتار کو بڑھایا۔
 چند منٹوں میں کار ڈاکٹر ریاض کی کونسی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو چکی تھی

اس نے لڑکی کو وہیں بیٹھنے کی ہدایت کی۔ اور خود پورٹیکو میں گاڑی سے اتر کر آگے بڑھا۔ اور بیل دی،

ٹرن۔ ٹرن۔ ٹرن۔

گھنٹی کی آواز سن کر چند لمحوں بعد ایک نوکر نے آکر دروازہ کھول دیا۔

”ڈاکٹر ریاض ہیں؟“

”جی! — نوکر کچھ سوچتے لگا۔

”سنو! — ڈاکٹر صاحب سے کہو ایک بہت ضروری کیس کی

بنیاد پر اس میں جاننا ہے میں گاڑی لے کر آیا ہوں۔“

سہیل اپنی باتوں کا عکس نوکر کے چہرے پر دیکھنے لگا۔ نوکر کا چہرہ

مطمئن دکھائی دیا۔ اس سے اس نے گہرا سانس لیا۔ اور گیلری میں کھڑے

ہو کر ٹکی سی سیٹی سبانا لگا۔ لڑکی اسے ترجیحی نگاہوں سے اداس انداز میں

دیکھ لیتی تھی۔ بارش کا پانی کاری چھت سے پھسل رہا تھا۔ اور دروازوں کے

شیشوں پر سے ہوتا ہوا نیچے بہ رہا تھا۔ اسے انتظار کرتے ہوئے چند منٹ

ہی گزرے تھے کہ ڈاکٹر اپنا بیگ لے کر آگیا۔ اس نے رین کوٹ پہن رکھا

تھا۔ سہیل نے ڈاکٹر کو گہری نظروں سے دیکھا۔

”چلو! — ڈاکٹر! — وہ بے تابی سے بولا۔

”چلو! — وہ عجلت سے گاڑی کی طرف بڑھے۔ ڈاکٹر نے پورٹیکو

کے بلب کی دھندلی روشنی میں کار کے اندر بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا۔

ایک لمحے کے لیے اس کا رنگ اڑسا گیا۔ لیکن جلد ہی شاطرانہ انداز میں

وہ سنبھل گیا۔ اس نے ایک بار پھر لڑکی کو دیکھا۔ بے فکر سی مسکرایا اور۔

گھر کی کے قریب پہنچ کر بولا۔

”ہیلو لڑکی! کیسی ہو؟“ —۔ ”چند لمحے توقف کے بعد بولا — میں نے تمہیں چند منٹا رکھنے کے لیے کہا تھا، مگر تم خدا ہی بھاگ گئیں۔“ لڑکی کے ہونٹوں پر زہر بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے حیرت تھی — بڑھا ڈاکٹر کتنی ڈھائی سے جھوٹ بول گیا تھا۔
 ”ڈاکٹر! — گاڑی میں تشریف رکھیے! — اب آپ کو نفیس کا شکوہ نہ رہے گا۔“

سہیل نے ڈاکٹر سے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ ڈاکٹر اندر بیٹھ گیا۔ سہیل نے اس کے ہاتھ سے ٹیگ لے کر لڑکی کو ہتھ دیا۔ اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اشارت کر دی۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ کی بہت ہربانی۔ جو اس موسم میں میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے میں جلد ہی پچھلا ادھار بھی چکا دوں گی اور اس وقت کی ہنس بھی آپ کو بہت جلد مل جائے گی۔“ — وہ ممنونیت بھرے لہجے میں کہہ نکلا۔ ڈاکٹر کا ہنسا ہنساں چہرہ ایک دم پھر تاریک ہو گیا۔ اندھیرے پھیل گئے۔ اس نے گھبرا کر نوجوان سہیل کی طرف دیکھا۔ سہیل کے ہونٹوں پر دہی دہی مسکراہٹ تھی۔ وہ ڈاکٹر کی پریشانی سے محفوظ ہو رہا تھا۔ جب وہ کوئٹہ سے کافی دور نکل آئے تو سہیل چونکا۔ ایک لمحے کے لیے مڑ کر لڑکی کو دیکھا جو وزن و مالا کی تصور پر بنی میٹھی تھی۔

”آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ کو جانا کہاں ہے؟“ — اس نے سکین کی طرف دیکھا جس پر دائیہ چل رہے تھے۔ اور پانی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ دائیہ ٹیشے صاف کرتے چلے جا رہے تھے۔
 لڑکی یوں چونکی، جیسے کسی نے اس کے جسم پر ہلکی سی چٹکی لے لی ہو۔

پھر وہ ایک آدم پشیمان سی ہو گئی۔

”اوہ! — میں بھی کتنی بدعاس ہو گئی ہوں۔ آپ کو اپنا پتہ بتانا بھی بھول گئی۔“ — اس کا رنگ شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر نے زہر خند کیا: ”اب تو بتا دیجئے۔“

”بگ کو ارٹرز! — آپ مجھ گئے ہیں نا۔“

”ہاں — میں مکو ارٹرز جانتا ہوں“ — اس نے اسٹیرنگ کو

ایک طرف گھماتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر اس دوران میں لاطعلق سا بیٹھا رہا۔ اس کا پہلے کا سا جوش و خروش ختم ہو چکا تھا۔ اب تو وہ مجبوراً اس سفر کو طے کر رہا تھا اچانک کہیں بجلی گری۔ لڑکی اکھ دم سہم کر کھڑکی سے لگ گئی۔ ڈاکٹر کا رنگ زرد ہو گیا۔ مگر سہل آرام سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

چند ثانیے گزر گئے اور آخر کار ٹرز آ گئے۔ جب گاڑی کا لوئی کے قریب پہنچی۔ تو لڑکی بے حسینی اور اضطراب محسوس کرتے لگی۔ اس کے لب مرتعش ہوتے مگر رک جاتے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ بڑی کوشش سے ایک مرحلے پر پہنچ کر اس نے اپنے میں جرات پیدا کی۔

”دیجئے! —“ وہ آہستہ سے پر اخلاق لہجے میں بولی — ”میں

چاہتی ہوں، آپ مجھے نہیں اتار دیں۔“ اس کے لہجے میں تردد اور جھجک تھی: ”آپ مجھے — بد اخلاق نہ سمجھ لیجئے گا۔ یہاں اترنے کی وجہ یہی ہے۔ کہ آپ میرے ساتھ ہوئے تو ہمایوں کی کسی قسم کی غلط فہمی کا احتمال ہے۔“

”اوہ! —“ وہ اس کا مقصد سمجھ گیا۔ اور اس کے جوتوں پر ایک

پیمکی سی مسکراہٹ اچھیل گئی۔ ”سخت ہے! لیکن بارش ابھی ختمی نہیں۔“

اب بارش کا وجود سرد پڑ گیا ہے۔ سڑک چوار پڑ رہی ہے۔ اس سے

مجھے کچھ نہ ہو گا۔“

”جیسے آپ کی مرضی“ — وہ شانے اچکا کر بولا۔ پھر اس نے گاڑی ٹھہرائی۔ اور ڈاکٹر سے متوجہ ہوا۔

”ڈاکٹر صاحب! — آپ ان کے ساتھ جا بیٹے۔ میں واپسی کے لیے آپ کا انتظار کروں گا۔“

ڈاکٹر طوطا کو ہانچے اتر ا۔ مگر اب سہیل کے وعدے نے اس کی۔ قدرے ڈھارس بندھادی تھی۔

”آئیے ڈاکٹر صاحب! — جلدی کیجئے! —“ وہ نوجوان کی کمرنگی کے قریب پہنچ گئی۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ! — آپ کے اس احسان کو شاید میں کبھی نہ بھول سکوں گی۔“ پھر اس نے پلکیں اٹھائیں۔ اور مترنم آواز میں کہا۔ ”خدا حافظ!“

”خدا حافظ —“ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ ڈاکٹر کے ساتھ چلتی ہوئی دھولان سڑک پر اترنے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی حسین خواب دیکھتے دیکھتے اچانک آنکھ کھل گئی ہو۔ نہ چاہتے ہوئے ایک ٹھنڈی آہ اس کے لبوں سے نکلی۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پکیٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگایا۔ سگریٹ کا دھواں اس کے حلق سے نیچے اتر ا اور وہ غیر ارادی طور پر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں بجلی چمک رہی تھی اور بادل گرج رہے تھے۔ اودان کے ہجوم میں بدستور اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ اس کی نظریں اس سڑک پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے گزر کر لڑکی گئی تھی۔

رڈ کی ڈاکٹر کو سامنے کر نشیبی سڑک پر اترتی چلی گئی۔ پھر وہ ایک طرف
 مڑی۔ اس نے ایک اگلی عجلت میں پارٹی پھر وہ دوسری گلی میں تھوڑی دیر چلی
 اور ایک مکان کے سامنے پہنچ کر رگ گئی۔ اس نے جلدی سے دروازے پر
 دھنک دی۔

کھٹ۔۔۔ کھٹ۔۔۔ کھٹ کی صدا بھیگی ہوئی فضا کا سینہ چیر گئی
 دوسرے ہی لمحے کسی نے دروازے کے قریب آگے بڑھ کر
 "کون ہے؟"۔۔۔ یہ کبھی نعرہ زن کی کی کھٹکتی ہوئی آواز تھی۔
 "میں ہوں شبیلہ!۔۔۔" وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

"اوہ! آپنی!۔۔۔ آپ ہیں۔"
 دوسرے نے دروازہ کھل گیا۔ صحن میں بلب کی مردہ سی روشنی پھیلی ہوئی
 تھی، اٹھس روشنی میں، ایک پندرہ سولہ سالہ حسین لڑکی بڑے اداس انداز میں
 ۲ لے دالوں کے استقبال کے لیے کھڑی تھی، بارش سے بچنے کے لیے دیوار
 کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔

"ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ آپنی! آپ تو بالکل بھیگ گئی ہیں۔"
 لڑکی کے لیے میں پریشانی تھی۔
 "کوئی بات نہیں بھئی!۔۔۔ ابھی کپڑے لوں گی۔" پھر اس نے
 پلٹ کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

"آئیے ڈاکٹر صاحب!۔۔۔"
 ڈاکٹر صاحب کے پیچھے چلے اندر جانے لگا۔ وہ برآمدے سے گزر کر ایک
 کمرے میں آگئے۔ گوارڈز تین کمروں پر مشتمل تھا، کمروں کے علاوہ ایک ٹھنڈا
 تھا۔ ایک ختمہ ٹھنڈی کے لیے یہ کمر کافی تھا۔

کروں کو متوسط طریقے پر آراستہ کیا گیا تھا۔ عسرت کے باوجود کمروں کی آرائش سے — نقاست اور سلیقے کا اظہار ہوتا تھا۔ فرنیچر گو معمولی تھا۔ مگر صاف ستھرا تھا۔ معمولی کپڑے کے اچلے کٹن صوفوں پر پڑے تھے۔ تمام کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ سب کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے پہلی ہی نظر میں سارے مکان کا جائزہ لے لیا۔

جس کمرے میں وہ آئے وہ اس کے والدین کا بیڈ روم تھا۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر لڑکی کی ادیر مگر والدہ اتھ کر کھڑی ہو گئیں۔

”بڑی دیر سے آئی ہو شبیلہ بیٹی! —“ اس کی ماں نے پیار سے شکوہ کیا۔

شبیلہ نے ایک لمحے کے لیے اپنے والد کی طرف دیکھا جو آرام سے بیڈ پر سو رہے تھے۔ ان کے صاف چہرے پر نقابت کے آثار نمایاں تھے۔ کسی زمانے میں وہ ایک وجیہ انسان رہے ہوں گے۔ مگر زمانے کے سر دگرم نے ان کے تمام حسن کو جلا دیا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں بند تھیں۔ مگر ان کا سانس ہوا تھا جس سے شبیلہ نے ایک اطمینان کا سانس لیا۔ اپنے والد کی طرف سے نظریں ہٹا کر اپنی پیاری آنٹی کو دیکھا۔

”امی جان! — دیر ہو ہی گئی بہر حال ڈاکٹر صاحب! —“

میرے ساتھ آگئے ہیں۔۔۔۔۔“ شبیلہ نے ملائم آواز میں کہا۔

اب ان کی ضرورت نہیں رہی! —“ اس کی امی نے اخلاق آمیز

لہجے میں کہا۔

شبیلہ کا دل دھک سے دھک گیا۔ اور اس نے چونک کر پریشان انداز میں دوبارہ اپنے والد کی طرف دیکھا۔ وہ پڑے سو رہے تھے۔ اس سے اس

کی گرتی ہوئی ہمتیں استوار ہو گئیں۔ اور اس نے خود کو سنبھال لیا۔

”ڈاکٹر صاحب کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ امی جان
 —“ وہ تذبذب سے بولی — ”وہ کچھ نہ سمجھ پائی تھی، دفعتاً اس کی نگاہ
 غبی پر پڑ گئی۔ جو نظریں یہ بھی کئے شرمیلے شرمیلے انداز میں مسکرا رہی تھی۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں بیٹی! — تمہارے جانے کے بعد تمہارا
 ابا کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ غبی سنے، ان کی حالت دیکھی نہ کئی اور وہ
 سناٹے والے ڈاکٹر کو بلالائی، جو نے نئے آکر اس کو سٹی میں بٹھڑے تھے بڑے

ہی خاتمہ اور رحمدل انسان ہیں۔ ابھی دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی
 —“ پھر ثنائیے بھر کیلے رنگی اور ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر بولی — ”ابا ان
 ڈاکٹر کو ہی دیکھ لو، اتنی بارش میں ہم غریبوں پر ترس کھانے آگئے ہیں، خدا
 ان کو اس نیکی کا صلہ دے گا۔“

وہ خاموش ہو گئیں اور ڈاکٹر کو یوں محسوس ہوا، جیسے اس پر کسی نے گھڑوں
 پانی ڈال دیا ہو۔ اسے ایک دم پسینہ آگیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔

”میری اب ضرورت نہیں رہی ہے! — اچھا مجھے اجازت دیجئے“
 ”شکریہ ڈاکٹر صاحب! — آپ یہاں تک آئے مہربانی —“

میں دو چار روز میں آپ کے پیسے پہنچا دوں گی۔ — ڈاکٹر لمبے لمبے قدم
 رکھتا باہر آگیا۔ شبیلہ اپنی اتنی کی طرف متوجہ ہو گئی، اسے یاد بھی نہ رہا کسی نے
 اس پر احسان کیا ہے اور کوئی اس کے حسین تصور کو ذہن کے پردوں میں۔
 چھپا سہ گاڑی میں بیٹھا ہے۔

”امی جان! — خدا کا شکر ہے — ابا جی کی طبیعت سنبھل گئی
 — مجھے بوجھلاہٹ میں یاد ہی نہ رہا کہ تھوڑے ہی دن قی ہوئے ہیں بہار

پڑوس میں ڈاکٹر صاحب کو آئے ہوئے — خدا ان کا سبھلا کرے —
وہ اطمینان سے بولی۔

’اُپی! — بڑے ہی اچھے آدمی ہیں — میرے ذرا کہنے پر ہی اتنی
رات گئے بھاگئے ہوئے آگئے تھے۔ ان کی بیگم بھی بڑے ملنسار عورت ہیں۔
اور بچے کتنے گول مٹول اور پیارے ہیں — بچی نے بڑے بھولے انداز
میں ڈاکٹر کی تعریف کی۔

’خدا انھیں نظر بد سے بچائے۔‘ اس کی امی نے ڈاکٹر کے بچوں
کو دعا دی۔ اور شبیلہ اپنے والد کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر وہ
کپڑے بدلنے دو سرے کمرے میں چلی گئی۔

سہیل نے سامنے سے آتے ہوئے ڈاکٹر کو چونک کر دیکھا۔ اور سگریٹ کا
ادھ جلا ٹکڑا مچینک کر ڈاکٹر کیلئے ساتھ والا دروازہ کھول دیا۔ ایک دلمے کے لیے ڈاکٹر
کو اکیلا دیکھ کر اس کے دل میں اہلی سی جھین کا احساس ہوا تھا۔ اور وہ منوم سا ہو
گیا تھا مگر اس نے اپنی کمزوری کو زیادہ ابھرنے نہ دیا۔
’کیوں ڈاکٹر — بڑی جلدی آگئے‘

’واہ پھلے ہی کوئی دوسرا ڈاکٹر ہو کر چلا گیا ہے —‘ ڈاکٹر نے ناگہاں
سے کہا۔

’اوہ! — دیسے مریض کا کیا حال ہے —‘ اس نے ڈاکٹر

سے پوچھا۔

’مارل پوزیشن ہے —‘ اس نے گاڑی، اشارٹ کی اور ڈاکٹر کو
’کو کو بھئی‘ دیا۔ ڈاکٹر اندر جاتے لگا۔ مگر اس نے اُسے روک لیا۔ اور اس کی
’فیس آسے‘ دائرہ دی۔ اور گاڑی لے کر اپنی کو بھئی کی طرف روانہ ہو گیا۔

سہیل

لے گاڑی اپنی کونٹھی کے پورچ میں کھڑی کر دی۔ اور خود
اتر کر اندر چلا گیا۔ رات نصف کے قریب گزر چکی تھی۔ سب اپنے اپنے کمروں میں
چلے گئے تھے۔ اس نے لڑکوں کو دیکھا نامناسب نہ سمجھا۔ اور خود بھی سیر ہیاں چڑھ کر
اپنے بیدروم میں آگیا۔

سہیل ڈر کے بعد عموماً گاڑی میں کھوٹے جاکر بیٹھا۔ آج کی تفریح تو
اس کے لیے دلچسپ حادثہ بن گئی تھی۔ اُسے وہ جذبات ملے تھے جس کی اس
نے ابھی تک آرزو نہیں کی تھی۔ وہ شوخ و زنگ اور کھنڈر انوجوان تھا جس
نے پچھلے سال ایم۔ اے۔ اکتا کس کیا تھا۔ اس کی فطرت میں لاابالی پن تھا
اور شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ زندگی کو ایک کیف سمجھ کر گزارنا
چاہتا تھا۔ اور اسی کیف کے سہارے وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

سہیل ایک خوب صورت اور جیہہ انوجوان تھا۔ اس کا قد لانا اور رنگ
سرخ و سفید تھا جس میں کسرتی معلوم ہوتا تھا۔ گھر میں فراغت تھی، اس لیے وہ ناز و

نغم میں پلاتا تھا۔ اور کبھی کسی چیز کے لیے تردد نہ کرنا پڑتا تھا۔ ذرا سے اشارے پر ہر چیز ہتھیا ہو جاتی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ہر وقت خواب سے تیرتے رہتے تھے۔

اس کے والد افتخار احمد خالص کاروباری آدمی تھے۔ ان کی فطرت اپنے بیٹے سہیل کے بالکل برعکس تھی۔ وہ مکہر متلون مزاج اور سخت گیر انسان تھے۔ وہ دولت کو ایمان سے بھی زیادہ فوقیت دیتے تھے۔ انھیں اپنے غریب عزیزوں سے نفرت تھی۔ وہ انھیں اپنے سامنے بالکل برداشت نہیں کرتے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی وہ سیخ پا ہو جاتے اور ان کی پیشانی پر شکنیں ابھر آتی۔

انھیں اپنی ذات کے سوا کسی دوسرے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور نہ وہ کسی کو اپنے سے زیادہ فوقیت دیتے تھے۔ ان کا شمار شہر کے رزمیوں میں ہوتا تھا۔ لاکھوں کا کاروبار تھا۔ کتنے ہی امپورٹ لائسنس انھیں ملے ہوئے تھے۔ جو ان کی دولت میں روز بروز اضافے کا باعث بن رہے تھے۔ ان کی ٹیڑھی سٹاکس برس کے لگ بھگ تھی۔ مگر ان کی صحت قابل رشک حد تک اچھی تھی۔ رنگ سرخ و سفید اور کاسٹھی مضبوط تھی۔ بال کنپٹیوں پر سے سفید ہو گئے تھے۔ جو ان کے مردانہ حسن میں اضافہ کا باعث بنے ہوئے تھے۔ ان کی شخصیت کافی وجہ یہ تھی۔

سہیل کے علاوہ ان کے تین بچے اور تھے۔ ایک راجیل جو عمر میں سہیل سے بڑا تھا۔ اور سنجیدہ کم گو اور ملنسار انسان تھا۔ افتخار احمد کے تمام کاروبار کانگراں ان دنوں وہی تھا۔ آرم ان کی بڑی لڑکی تھی۔ جو بی۔ اے کی طالبہ تھی۔ خوش شکل اور خوش گفتار۔ اس کے علاوہ نغمی شاہدہ جس کی.. معصوم شرارتوں سے یہ گھر سکرامنٹ کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔

یہ مخمقر سا خاندان عیش و عشرت اور دولت و ثروت کے سایے میں
ہنسی خوشی زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ انھیں نہ فکر فراغتی اور نہ فکر امروز
— ان کے لیے ہر صبح کا سورج خوشی کا پیام لاتا تھا۔

لیکن اس وقت صبح نہیں رات تھی اور سہیل نظروں کے تیر کھا کر
واپس لوٹا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نازک اندام شبیلہ کا من لہرا
رہا تھا۔ کیف دستی کے رنگین زاویے پیش کر رہا تھا جن میں وہ ڈوب ڈوب
جاتا۔ نظر لا پرواہ ہونے کے باوجود وہ ان رنگوں کے زاویے سے باہر نہ
نکل پارہا تھا۔ اس کے دل کی بے گلی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

اس کے اعصاب جھنجھار رہے تھے۔ اس نے بڑی بے دلی سے سیلنگ
سوٹ پہنا تھا۔ اور بیڈ پر پہنچا تھا۔ کہہ کر ایک کنڈیشنڈ تھا۔ جہاں ذرا بھی گرمی کا
احساس نہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بارش ہو جانے کی وجہ سے موسم اتنا گرم بھی
نہ رہا تھا۔

وہ بستر پر لیٹا برقی لمپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بند اس کی آنکھوں سے
بہت دور ہو چلی تھی۔ تصویرات کے زائرے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ رنگوں
کے زاویے لاتنا ہی سلسلوں میں تبدیل ہونے لگے تھے۔ اس کے ذہن نے
آئینے میں بار بار شبیلہ کی خوب و شبیہ منعکس ہو رہی تھی

وہ کتنی حسین اور دلبر باستی۔ اس رنگین تصویر سے اس کے ہونٹوں پر
ایک افسردہ سی آہ دم توڑ دیتی اور اس کے دل میں درد تیزی سے چھپنے لگتا۔
اس نے کتنی ہی شکل آلود کردیں بدل ڈالیں۔ مگر وہ فائدہ کو بلانا نہ سکا۔ آج جس
اچانک پیدا ہوئے تھے وہ سچات نہ حاصل کر سکا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ اس نے کتنی شان بے نیازی سے اس کے ساتھ بہت

گزارا تھا۔ اسے ذرا بھی لعن نہ دی تھی۔ اپنی کسی حرکت سے اسے مُلتفت
جذبوں کا پیغام نہیں دیا تھا۔ بلکہ اسے بچھے ہوئے طریقے پر اپنے راستے
سے الگ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ بھی اس کے راستوں سے الگ ہو جانا
چاہتا تھا۔ مگر چاہنے کے باوجود بھی الگ نہ ہو پا رہا تھا۔ جانے اس نے اسے
یاد بھی کیا ہوگا یا نہیں۔ اجنبی لوگوں کو کون یاد رکھتا ہے۔ اس فقور سے وہ
افسردہ سا ہو جاتا تھا۔

اسی کش مکش میں وہ کروڑوں بدلتے بدلتے آخر کار نیند کی پرسکون دلدلی
میں اتر گیا۔

صبح جب نذر نے اسے میڈنی ٹکے لیے بیدار کیا۔ تو سورج کی سنہری کرنیں
کھڑکیوں اور روشنائیوں سے چھن چھن کر اس کے کمرے کے قیمتی سامان تک پہنچ
رہی تھیں۔

اس نے جلدی جلدی چائے پی۔ اور فوراً ہی باتھ روم میں چلا گیا۔
چند لمحوں بعد وہ لباس تبدیل کر چکا تھا۔ پھر اس نے ڈرائنگ ٹیبل کے
سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارے اور نیچے اتر آیا۔ اس کے قدم بُدائے روم
کا باران اٹھ رہے تھے۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو میز پر ناشتہ لگ چکا تھا۔
اس کے ڈیڑی انتہا راحہ چھری سے ٹوسٹوں پر پلٹن لگا رہے تھے۔ انہوں
نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”آج دیر سے بیدار ہوئے ہو بیٹے!۔۔۔ انہوں نے متانت سے
کہا۔ سپہیل کے چہرے پر خفت سی بھیل گئی۔ مگر اس نے جلدی سے خود کو سنبھال
لیا۔ اس کی نگاہیں اچانک آرام اور شادہ پر پڑیں۔ ان کے ہونٹوں پر دہنی

مسکرائیں زہر رہی تھیں۔ اس نے ان کی طرف دیکھ کر گردن ہلاتی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ کہہ کر افتخار احمد کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

”ڈیڈی اتنی زیادہ دیر بچی نہیں ہوئی۔ ابھی تو ناشتہ لگا ہی ہے۔“ پھر اس نے افتخار احمد کی دوسری طرف والی خالی کرسی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ڈیڈی!۔۔۔ بھائی جان نظر نہیں آئے۔“

”بھائی جان شاید بھائی جان کی تلاش میں صبح ہی گھر سے نکل گئے ہیں۔“ شاہدہ

شوخی سے بولی۔

”چپ! دشریر!۔۔۔“ ارم نے اسے ڈانٹا۔ اس پیار بھری ڈانٹ سے شاہدہ

زور سے ہنسی۔ وہ دس گیارہ سالہ بڑی ہی شوخ دنگ، اند معصوم سی صورت والی لڑکی تھی۔ وہ بڑے انداز میں باتیں کرتی تھی اس کی باتوں سے سب ہی لطف اٹھاتے تھے اور اس کے انداز سے مخاطب پر سب کو پیار آ جاتا تھا۔ شاہدہ کی بابت سے افتخار احمد بھی زیر لب مسکرائے لگے تھے۔ اور شہباز دیا سے ارم کے رخسار نگاہ کی پنکھڑیوں کی طرح دکھائی دینے لگے تھے۔

”بیٹے تمہارے بھائی جان اب کسی ضروری کام کی وجہ سے صبح سویرے ہی گھر سے نکل گئے تھے۔“ افتخار احمد نے فخر سے کہا۔

خالص کاروباری نوجوان جو ٹھہرے۔

وہ اس کی طرف سنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ پہلے بے جلدی سے نگاہیں جھکا لیں۔ اور فوراً ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے کرسی پر بیٹھتے ہی اس کے والد نے اسے پھر گھورا۔

”میں چاہتا ہوں تم بھی ایک اچھے بزنس مین بن جاؤ۔ اور اپنے بھائی کا ہاتھ

ٹپاؤ۔“

• ڈیڈی! — جیری تو یہی کوشش ہے کہ آپ کچھ تیارات کو عملی جامہ پہنا۔

سکول — ”وہ ادب سے بولے۔

• ڈیڈی! — بھیا کو شوخیوں اور شرارتوں سے فرصت ملے تو یہ کاروبار کی طرف

موجہ بولنا — ارم ناشتے کی پلیٹ اپنی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”اجی! — بڑوں کی باتوں میں چھوٹوں کو دخل نہیں دینا چاہیئے آپ آرام

سے ناشتہ کیجئے! — بھائی جان کو آپ نے بچہ سمجھ رکھا ہے کیا؟“

”شاید ایسی معصومیت سے بولی کہ افتخار احمد تہقہ لگا کر بیٹنے لگے۔ سہیل بھی

نعرہ زور سے ہنسنے لگا۔ ارم خفت منانے کی غرض سے پلیٹ سے ٹوسٹ اٹھا کر۔

چبانے لگی۔

”تم کو ناسکم ہو اسی لیے بھائی جان کی حمایت میں جھک رہی ہو۔“

ارم ٹوسٹ چباتے چباتے بولی۔

”خدا ہمارے بھائی جان کو ہمیشہ فروغ ہی رکھے! — شاید ہنسنے بڑی

بوزھوں کی طرح منہ بنا کر کہا۔

”اچھا بڑی بی! — اب زیادہ باتیں نہ بناؤ اور ناشتے کی طرف دھیان دو

۔“ ارم نے تابعدار کومتانت سے ڈانٹا۔

اسی اسی ناشتہ کرتے ہوئے ٹھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ذقنا باہر گلیری میں

ایک مردانہ آواز گونجی — ”ارے سبھی سہیل بھیا کہاں ہیں۔“

یہ ارشد کی آواز تھی۔

”وہ ناشتہ کر رہے ہیں۔“ لوکر نے ادب سے جواب دیا۔

ارشد کی آواز سے کہ افتخار احمد کی چینی ٹھکن آلود ہو گئی۔ ارشد ان کے مرقوم

پرسے بھائی کا لڑکا تھا۔ سہیل اور ارشد ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے۔ ارشد کے والد

اپنی عافیت اندیشی سے اتنی جائیداد چھوڑ گئے تھے جس سے وہ اپنے مصارف، بہ
 آسانی پورے کر سکتا تھا۔ شہر میں وہ ایک چھوٹے سے مکان میں رہائش پذیر تھا۔
 ادربی اے کا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ بیانہ قامت کا اچھا خاصا ٹیکل آدمی تھا۔ ہر
 حال میں خوش رہنے کو زندگی کا نصب العین سمجھتا تھا۔ اسی لیے وہ بڑے سے بڑا
 زخم کھا کر بھی مسکراتا رہتا تھا۔ — زمانے نے اسے بڑے بڑے گھانڈے لگائے تھے
 مگر اس کی مسکراہٹ میں ذق نہ آیا تھا۔

انتھار احمد اس کی آواز سن کر کبیرہ خاطر ہو گئے تھے۔ ان کے چہرے پر
 ناگوار تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ وہ بے چینی سی محسوس کرنے لگے تھے۔

”کبخت، جالے کیا سمجھ کر یہاں آجاتا ہے!! — — — وہ خود ہی تلخی سے
 بڑبڑائے۔ سہیل نے نظر اٹھا کر اپنے والد کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں شکایت
 تھی۔ ایسی ہی نظروں سے ارم نے بھی انتھار احمد کو دیکھا اور اس کے چہرے پر
 تاریکی سی لہرا گئی تھی جیسے اپنے ڈینڈی کی یہ بات اس سے سخت ناگوار محسوس
 ہوئی تھی

”ڈینڈی! وہ اپنے اکل ناگھر سمجھ کر یہاں آتا ہے: — — — چائے کم گونڈا
 حلق سے اتار کر سہیل نے سنجیدگی سے کہا۔

”میرے بھائی کی موت کے بعد یہ رشتہ ختم ہو گیا تھا۔ اب ہمارا اس آوارہ
 اور تلاش لڑکے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ — — — وہ اپنے بیٹے کی طرف تیز
 نظروں سے دیکھ کر بولے۔ انھیں جیسے جوش آ گیا تھا۔

”ڈینڈی! ارشد بھائی! — — — آوارہ نہیں بلکہ بہت سلجھ ہوئے بازو دق
 انسان ہیں۔ اگر وہ تلاش ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آوارہ بھی ہو۔ سہیل
 تلاش لوگ آوارہ نہیں ہوتے۔ — — — سہیل نے نوڈبانہ طریقے سے اپنے خیال

کا اظہار کیا۔

اس کے والد جھٹلا گئے۔ — تم مجھے سمجھانے چلے ہو۔ تم نہیں جانتے ان تلاش لوگوں کو — جہاں ذرا دولت دیکھتے ہیں، جپکاٹے شروع کر دیتے ہیں۔ وہ جوش میں بھر گئے۔

”ڈبڈی آپ ارشد سبائی کے متعلق اس نظریے سے مدد سوچئے! آخر آپ کا خون ہے — سہیل نے دھیسے لہجے میں کہا۔

”خون! — بونہہ! — میں تو سوچ رہا ہوں۔ اس خون پر یہاں

نہ آنے کی پابندی لگا دوں۔“

ایسا غضب نہ کیجئے گا ڈبڈی! — سہیل نے اپنے لہجے میں پریشانی اور بے چارگی لا کر کہا۔ ارم گھبراہٹ کی گھرائی اور منہمک دکھائی دینے لگی تھی۔

”اے بھئی! — کیسے غضب کی باتیں ہو رہی ہیں — ارشد نے —

مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ چہرہ اُسی رک کر اس نے افتخار احمد کی طرف دیکھا۔ — ”اکل سلام عرض کرتا ہوں۔“

افتخار احمد نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ کہن ہے

ایک نانیے کے پلے ہاتھ پونچھے اور پیلے زرد سے ڈانگ ٹیل پر پھینک دیا۔ ٹکنت وغرور اور نفرت سمجھنے والے انداز میں انہوں نے ارشد کو ایک نظر لپٹ کر دیکھا۔ ادباً بر لکل گئے۔ ان کے اس انداز سے ارشد کے بونٹوں پر ایک کھینکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”آئیے! — ارشد سبائی تشریف رکھیے! — سہیل نے مسکراہٹ

سے اس کا خیر مقدم کیا۔

”اے بھئی! جب آہی گئے ہیں۔ تو تشریف کیوں نہیں رکھیں گے —“

اس نے ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
 "ناشتہ کچھ سبھائی جان؟" — شامہ نے اپنی پیاری آواز میں ارشد کو
 ناشتے کی دعوت دی۔

"نہیں ختی گڑیا — میں ناشتہ کر آیا ہوں —" اس نے ایک کرسی
 پر بیٹھ کر شامہ کے سر پر ہار سے ہاتھ مار کر کہا۔ وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے —
 آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ارم بھی گھبرائی گھبرائی چور نظروں سے شرم آلود انداز
 میں اسے دیکھتی تھی۔

ارشد نے ناشتہ کی میز پر اس کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ اوردہ بڑے
 پتھر کلف انداز میں چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔ شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا
 دل کی دھڑکنیں بڑھ گئی تھیں۔ سہیل نے کپ ارشد کے آگے رکھ دیا۔ انداز میں ایک
 ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے لگا۔ سہیل اس کے سوچوں میں ڈوبے ہوئے —
 جہرے کا جائزہ لینے لگا۔

"کہاں کھوئے ہوئے ہو ارشد —" سہیل نے متحجم ہو کر کہا۔

"ایک پھکی مسکراہٹ ارشد کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"کہیں نہیں! — اس نے سہیل کو گہری نظروں سے دیکھ کر خوشگوار لہجے

میں کہا۔

"ڈیڈی کے اٹھ کر جانے کی وجہ تو تمہاری سوچوں کا باعث نہیں بنی ہوئی؟"

ہے۔

پھر ایک لمبے کے لیے رکا۔ اس نے اپنی بات کا رد عمل ارشد کے چہرے پر
 پر تلاش کرنا چاہا۔ مگر وہاں اسے کسی قسم کے جذبات اور کھائی نہ دیئے۔ صرف
 ہلکا سا اندھیرا ایک ثانیہ کے لیے اسے محسوس ہوا۔ پھر یہ سادہ ناشتہ، مگس کی دھند

بن نظریں معاملہ سببان پٹکیش دہ کہنے لگا۔ ٹیلی اکا مزاج آج کل کچھ سہفت
رہنے لگے۔ ان کی بات کا برا ماننا نہیں چاہیے۔ ہم بھی ان کی کسی بات کا برا نہیں
مانتے۔ تم تو اپنے ہو۔۔۔ اپنا خون ہو۔۔۔

”خون کا ہی جوڑا ہے جو مجھے یہاں کھینچ لاتا ہے۔۔۔ الکل میرے
بزرگ ہیں، میں ان کی کسی بات کا برا نہیں مناسکتا۔۔۔ یہ کہہ کر اس نے
ارم کے چہرے پر نظریں لٹکا دیں۔ اس کے گرم گرم نظروں کے لمس کو ارم نے
اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ اور وہ شرم و حیا سے بے خود سی ہو گئی۔ پھر اس نے ترچھی
نظروں سے ارشد کو دیکھا۔ ارشد کو محسوس ہوا جیسے اس کی لٹکا ہوں میں پیار بھری
شکایت مچل رہی ہو۔ نلو سے مجھے۔۔۔ کما آنکھ چوٹی کیل رہے ہوں۔ اگر تم اپنے ہو
تو اپنائیت کا اظہار کیوں نہیں کرتے۔ ان جذباتوں کو اچھال کر سنے کیوں انہیں لاتے
جن میں، جانتا اور اپنائیت ہوتی ہے وہ جذبہ آخر کب تک پڑے سوتے رہیں
گئے کلیاں کب پٹکیں گی۔ بھول کب دیکس گئے۔ چنے خوش گوار قیس میں کب ڈھیلے گئے۔
بہلتی ہوئی زندگی کب سی۔ راد کب دکھانی دے گی جھپتی انگلیوں، تڑپتی آرزوؤں
اور تڑپنے والوں کو سکون کی، راحت کب بغیر یہ ہوگی؟

اس نے خفیہ، ساہو کے نظریں پھیر لیں۔ کہیں اس کے دل کا چور باہر نہ آجائے؟
کوئی اس کے دل کے سربستہ راز کی گہرائی تک نہ پہنچ جائے؟

”مجھے، تپا سے جواب سے بے حد سرت ہوئی ہے۔۔۔ ارشد!۔۔۔ یہی تو
اپنائیت ہے۔ اپنا اپنا ہی ہوتا ہے۔۔۔ سہیل۔۔۔ زلالم آواز میں کہا۔

”اپنا کیا ہوا بھائی جان۔۔۔ ارشد بھائی تو میرے بڑے اچھے بھائی جان ہیں
شادہ نے نوسہ کا کھڑا دانٹوں سے کاٹ کر بڑی معصومیت سے کہا۔

”ارے تمہارا، تڑپا ابھی تک ختم نہیں ہوا۔۔۔ سہیل نے ہنس کر کہا۔

”یہ بڑی پیٹو ہو گئی ہے بھتیجا! — ارم نے شرمیلے انداز میں کہا۔
 ”آپ سے تو کم ہی ہوں باجی!“ — آپ بھی تو ابھی تک کھار ہی پی سے
 شاہدہ ٹوسٹ پلیٹ میں رکھ کر چائے کا گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر بولی۔ ارشد
 اور جیل زور سے ہنسنے لگے۔

”موٹی ہو جاؤ گی — اور موٹی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔ تمہارے
 بھیلے کی بی کہہ رہی ہوں۔ میری بلا سے خوب کھاؤ — آنا کھاؤ کہ تم پھول کر
 کیا ہو جاؤ —“ ارم نے خفت منانے کی غرض سے سفیدی سے کہا شاہدہ
 نے ارم کی طعن نظریں پھیر کر دیکھا۔
 ”باجی! — آپ میری فکر نہ کیجئے! خود پر نظر رکھیے! — ارم نے
 کوئی جواب نہ دیا۔

”اب اس لوک جھونک کو بند کر دیجیئے! — سہیل نے شاہدہ کو پیار
 سے ڈانٹ پلائی۔

ارشاد نے شاہدہ کے سر پر پیار سے ایک دھول جھاڑ دی۔
 ”ادنی! اللہ! بھائی جان! آپ نے کتنے زور سے مارا ہے۔۔۔۔۔ شاہدہ
 نے شوخی سے منہ بنا کر کہا۔
 سب مسکرائے نکلے۔

ناشتہ ختم ہو گیا۔ اور وہ لوگ اکٹھا کر ڈائینگ روم میں آ گئے۔ انہیں مسرت
 بھرے انداز میں ڈائینگ روم میں جاتے افتخار احمد نے اپنے سنڈی روم کی
 کھڑکی سے دیکھا۔ اودان کی پیشانی پر سلوٹیں گہری ہو گئیں۔ جو ان کے دل میں بھیلی۔
 ہوئی نفرت کی غماز تھی۔ نفرت جو انہیں ارشد سے تھی — اس کی غربت سے
 تھی — اس کے یہاں اُس نے سے کتنی — اپنے بچوں کے

ساتھ میل جول سے ملتی — اور ارشاد — اس مغفرت کو..
 محسوس کرتے ہوئے بھی بے پردا ہوتا تھا — وہ جانتا تھا کہ ایک دن
 یہ لغت محبت میں ضرور بدل جائے گی

میں چہین چہین چہین چہین

اباؤ! — ”شبیلہ نے محبت بھرے انداز میں مسرت سے کہا۔
 ”خدا کا شکر ہے آپ کی صحت بحال ہو گئی۔“
 ”ہاں بیٹی خدا لاکھ لاکھ شکر ہے — ذرا قابضت ہے۔ وہ بھی دیر ہو جائے گی۔“

شام کا وقت تھا وہ برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ ہوئے تھے، شبیلہ کھینچے
 سے جھال رہا رہی تھی اسے اپنے کمرے کا قیل میں آراستہ کرنا تھا، بجلی کچن روم میں
 گھسی رات کے کھانے کا بندوبست کر رہی تھی، بجلی الہڑلا پرواہ اور بے فکر لڑکی
 تھی، کالج کا پہلا سال تھا، گھر میں عسرت و نااداری تھی، مگر وہ بہر حال میں خوش
 رہنا چاہتی تھی، اس کی بڑی بڑی مسکون آنکھوں میں ہر وقت شوخی، ناچیت رہتی
 تھی، کالوں پر لا ابالی فطرت کے رنگ، بکھرے رہتے تھے پھیلے رہتے تھے، اور
 بڑھتے رہتے تھے اگر اسے بھی اپنے خاندان کی بے مائیگی، مجبوری اور بے بسی کا
 احساس ہوتا تو وہ شوخ قہقہوں کے بیچ اس احساس کو غبار کی طرح اڑا دیتی تھی۔

اس کے بقیوں سے گھر میں پھنسیوں بسیرا کر لینی تھیں۔ سب ہی اسے محبت۔
کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اندر بچوں کے لیے اپنے تمام احساسات کو بھول جاتے تھے
اس کے برعکس تبیلہ بہت ساس اور جذباتی نڑکی تھی۔ اسے گھر کی ناداری بے
کل رکھتی تھی جو اندر سے گھن کی طرح چاٹ رہی تھی۔ اس کے شرب و
رزق میں گیزر نے تھے۔ بلیوں کے غبار اس کے ذہن کے راستوں پر اڑتے رہتے
تھے۔

غبار جس سے خدا اس کے ذہن کے گرد ویران محیط ہوتا جا رہا تھا۔ اور
اسے غصہ رہا کرتے رہتا تھا۔ وہ ہر وقت خیالوں میں ڈوبی رہتی تھی۔ اس کی امی
و ابو یحیٰم اور اس کے والد ارشاد احمد اس کے قریب تھے۔ مگر وہ ان کی موجودگی
کو کیسے نظر انداز کیے بغور اس میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور ڈوبتے سورج سے پیدا
وے والی گھنٹہ گزشتہ کو حسرت سے بک رہی تھی۔

وہ نے خیالوں میں کھینی ہوئی ہو مٹی! ————— ”ابو یحیٰم نے اسے
ماتر سے ایسا۔

تبیلہ نے چوبک کر ایک ڈنڈی آہ بھری اور اپنی ماں کی طرف حسرت سے
نڈوا سے دیکھا جن میں درد و غم کی جھلک نمایاں تھی۔

امی جان! ————— زندگی کی تلخیوں کے مارے میں سوچ رہی ہوں۔
تبیلہ نے معموم بچے پر کہا۔

ماحبہ کی طرح کا چہرہ کید۔ ”ایم“ ہمارے ہو گیا اور اس پر غصہ تھا۔ تاثرات پھیلنے
لگے۔ مٹھوں نے ایک گہرا انس لیا۔ مگر لب نہ لے سکے۔ ارشاد احمد نے اپنی بیٹی
کو محبت سے پیش قدمی سے دیکھا۔ ایک پھلی اور سوگوار سکوا رہے۔ ان کے بیمار منوں
پر اندھا بھائی اور ایک درد بھرا کھجور گہرا۔

”بیٹی!۔۔۔ جب تک میں زندہ اور ہمتیں کیا سرکاران تلخیوں سے؟
 پھر انہوں نے اپنی آواز میں لاپرواہی لائے کہا۔۔۔ اور اب تو میں بالکل ٹھیک ہو
 گیا ہوں۔ اب تمہیں کسی تردد کی ضرورت نہیں۔“
 ارشاد احمد مسکرائے لگے شبیلہ جانتی تھی اس شفاف لہجہ ہٹ کے پس منظر
 میں کیسے خونخاک غم لہریں لے رہے ہیں۔

”خدا آپ کو جلد صحت دے میرے ابا جان!۔۔۔“ شبیلہ کا ہجوم اداس
 تھا۔۔۔ ”ہش! کوئی ہراساں ہی عزیز ہوتا۔۔۔ ہم بھی کسی کو اپنا کہہ کر پکار
 سکتے۔“

ارشاد احمد کو یوں لگا جیسے کسی نے درد نے ان کا دل چٹکڑا کر اسے کمرشل ڈالا
 ہو ان کے چہرے پر درد کو بکھر گیا۔

”میر ہوں تمہارا بیٹی!۔۔۔“ پھر وہ چند لمحوں کے بعد بولے۔۔۔ ”رشتہ
 پر نہ جاؤ، یہ کبھی کسی کے نہیں ہوتے۔ سب بڑوں کے ہوتے ہوئے بھی انسان بعض
 اوقات اکیلا ہوتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا کوئی کسی کا نہیں بتاتا۔“

”ابا جان!۔۔۔“ میرا مطلب تھا کوئی آپ کا بھائی ہوتا۔ جو اس وقت
 آپ کے دکھ درد میں شریک ہوتا۔ اپنائیت کا احساس دلاتا۔۔۔“ شبیلہ کی آواز
 بھر آتی گئی، اس نے نظریں جھکا لیں۔۔۔ ”اپا کوئی بہادر اچھا بھائی ہوتا جس کے ہوتے
 تو نہ ہم اتنے بلا میں نہ ہوتے۔ ہم ترشیاں ہیں، ہم آپ کے کس کام آ سکتی ہیں
 یہ بھی کوئی بتا ہے۔ آپ کو ڈسک سے دو ایسی میسر نہیں آتی۔ یہ بھی کوئی زندہ گی ہے
 جس میں انسان بے بس ولاچار رہے۔۔۔“ اس کی آنکھوں سے بے اختیار
 آنسو نکل پڑے۔

”بیٹی!۔۔۔ حسرتوں میں ڈوبی ہوئی پیچ۔ ان کے ہونٹوں سے نکلی۔

اور کب بن کر صحن میں کبھر گئی۔ — یہ تم نے کیا کہہ دیا ہے بیٹی! — میں نے
 تو آج تک کوئی شکایت نہیں کی۔ میں نے تو کبھی بھائی نہ بولے گا شکوہ نہیں کیا۔ میں
 نے تو ٹیٹا نہ بولے گا بھی گلہ نہیں کیا۔ میں نے تمہیں اور بھی کوئی بیٹیوں کی طرح سمجھا ہے۔
 ایسی شکایتیں تو مجھے کرنی چاہئیں۔ ایسے گلے تو میری طرف سے بولنے چاہئیں۔ ایسے
 شکوے کرنا تو میرا کام تھا۔ مگر میں نے تو انہوں کو سہی ہمیشہ ہنس ہنس کر اپنا یا ہے۔
 میں نے کبھی محبتوں کے سامنے سرنگوں کیا۔ تمہیں بھی حالات سے ہارنا ہنسی چاہیئے بیٹی۔
 انسان حالات بدلنے کی طاقت رکھتا ہے۔ حالات انسان کو نہیں بدل سکتے۔ سدا یہ
 دن نہ رہیں گے۔ یہ دور ضرور بدلے گا۔ تم اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔ تم پڑھی لکھی لڑکی ہو۔
 تمہیں اس طرح کی باتیں نہ کرنی چاہئیں۔

دہ چنڈ لمحوں کے لیے رُکے اور گہری نظروں سے ماں بیٹی کو دیکھا۔ راجہ بیگم
 کی آنکھوں سے سہی آنسو بہہ نکلے تھے۔

راجہ انم بھی بچی بن گئی ہو۔ تمہیں چاہیئے تھا بیٹی کو حوصلہ دیتا رہا۔ اس کی محبت
 برصغیر تھی۔ تم خود ہی محبت ہار بیٹھی ہو۔ اب رونا بند کرو بیٹی کو دلا سادو۔ مجھے تم سے
 یہ امید نہ تھی، تم بڑی حسرت مند ہو۔ — انہوں نے گھمبیر لہجے میں اپنی بیگم
 سے کہا۔

راجہ بیگم سنبھلیں اور دوپٹے کے پلوں سے آنسو پونچھ کر بیٹی کو سیٹھے لگالیا
 اور اپنے پلو سے ان کے آنسو صاف کر دیئے۔

’تمہارے ابا نے بالکل ٹھیک کہا ہے بیٹی! — تم ہمارے بیٹے
 ہی ہو ہم سب تمہارے ہیں۔ تمہیں گھبرانا نہیں چاہیئے۔ — لو اب سب غم
 اپنے دل سے مٹا دو۔ — ماں کے لہجے میں مامتا بھری ہوئی تھی۔

امی! — میری پیاری امی! — دہ اپنی ماں سے پر جوش طریقے

پر پہنچے ہوئے بلوئی۔ اہی! — میں بزدل نہیں ہوں۔ میں غموں اور مشکلات سے گھبرانا نہیں جانتی۔ مجھے اپنی بے مائیگی کا احساس بے کار رہتا ہے۔ میں اس احساس کو مٹانا چاہتی ہوں جو انسانوں کے ہاتھوں دوسروں انسانوں کو ملتا ہے۔ کیا وہ لوگ بھی ہم جیسے انسان نہیں ہیں جو کاروں میں گھومتے ہیں، بینگوں میں رہتے ہیں کہ دروں میں کھیلتے ہیں۔ ایک ہم ہیں جو دوا کے لیے دوسروں کے محتاج ہیں۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے طرح طرح کے جتن کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ جذبات کی شدت میں پہننے لگی تھی۔ احساس کا تلخی نے اسے دلوانہ سا بنا دیا تھا۔

بیٹی! — ارشاد احمد نے بلند آواز میں کہا۔ ”تم ایسے سوچنا چھوڑ دو۔ چند دنوں کی بات ہے۔ میں بالکل صحت مند ہو جاؤں گا اور تم بی۔ اے میں۔ داخلہ لے لیتا۔ میں چاہتا ہوں تم اپنی تعلیم مکمل کر لو۔ تم ایسے مسائل سوچنے کے لیے پیدا نہیں ہوئی ہو۔ ان کے متعلق سوچنا تو میرا کام ہے۔“

لیکن اباجان! — میں بھی تو سوچنے کا حق ہے۔ آخر اس معاشرے میں ہمارا مقام کبھی بلند نہیں ہوگا کیا؟ شبیلہ نے ٹھہرے ہوئے بوجہ میں کہا۔

تو ارام مقام بہت بلند ہے بیٹی! — اب اس بحث کو چھوڑو۔ اور اندر جا کر دیکھو۔ نجی نے کھانا تیار کیا یا نہیں؟ ایک بھکی مسکراہٹ شبیلہ کے ہونٹوں پر پھیل کر مٹ گئی۔ وہ جانتی تھی ارشاد احمد اس بحث کو سمیٹنا چاہتے ہیں۔ وہ کھڑی ہو گئی۔

رات کی یہی پہلی لگی تھی کمرہ کی تیلیاں روشن کر دی گئیں۔ رات کا کھا اگھایا گیا شبیلہ نے کھانے کے کچھ دیر بعد اپنے والد کے کمرے میں جا کر دعا پڑائی اور باہر آ گئی۔ اس نے جھانک کر نجی کے کمرے میں دیکھا جھپٹ کا پتہ اچھل

رہا تھا اور وہ پڑھنے میں مشغول تھی۔

”آئی! آجانیے! —“ جی نے کتاب سے نظریں اٹھا کر شبیلہ کو دیکھا۔

”نہیں! — تم پڑھو — میں بھی اپنے کمرے میں چلتی ہوں —“

اس نے محبت بھرے انداز میں کہا وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ اور خود کو تھکن، آلود انداز میں بستر پر گرا دیا۔ سانسے کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ آسمان پر ستاروں کی قندیلیں روشن تھیں۔ ستارے کسی ذخیرہ آنکھوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ ایک درباری ماحول پر چھایا ہوا تھا۔ لیکن اس کے دل میں اندھیرا تھا۔ اس کا ذہن تاریک تھا۔ قصورات کے پردوں پر ایک ہی سوال لہز رہا تھا۔ اگر باکی بیاری طول پکڑ لگی تو کیا ہوگا؟ ان کی نوکری چلی جائے گی تو گھر کی ہر چیز بک جائے گی۔ بہر طو خزاں آلود فضا ہوگی۔ گھر بار اجڑ کر رہ جائے گا۔ امیدوں اور تمناؤں کے گلشن مرجھا جائیں گے۔ زندگی دیوانوں میں سکیاں بھرے نلگے گی۔ ارمان بکھر جائیں گے۔

دل کی گہرائیوں سے دوسری آواز بھی ابھری۔ زندگی کے تاریک پہلو کے متعلق ہی سوچنا چاہیے۔ زندگی خوشیوں سے لبریز بھی ہو سکتی ہے۔ امیدیں مسرتوں کا لبادہ بھی اوڑھ سکتی ہیں۔ ارمان لطیف زاولوں میں بھی لہر سکتے ہیں گلشن پہلے سے بھی زیادہ نکھار دے سکتے ہیں۔ دیوانوں میں تہقہ بھی نہائی دے سکتے ہیں انسان کو نیک خواہشات کے سہارے جینا چاہیے۔ اور اپنی جدوجہد کو جاری رکھنا چاہیے۔

— اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کے دل نے جیسے آواز دی۔

مجھے بھی جدوجہد کرنا ہوگی۔ مگر کس قسم کی جدوجہد! — میں کیا کر سکتی

ہوں۔ —؟ اپنے خاندان کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ میں بڑی سوں اور نجی چھٹی — مجھے اس کی ضروریات کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ والدین اور ان کی دیکھ بھال میرا فرض ہے۔ مجھے کچھ کرنا ہوگا، مگر کے مالی حالات بدلنے کے لیے

مجھے اپنی کوششوں میں تیزی لانی ہوگی۔ — کوئی مملوک تم انعام بڑا —۔ کوئی انقلاب لانا ہوگا۔

وہ بڑے سوچ سوار کے بعد اس فیصلے پر پہنچی کہ والدین سے چوری چوری کوئی ملازمت کرا جائے۔ لیکن انھیں علم ہو گیا تو پھر —۔ وہ اپنے والدین کی فطرت کو سمجھتی تھی وہ کبھی یہ برداشت نہ کریں گے کہ ان کی بیٹی نوکری کرتی ہے۔ ان کا دل لوٹ جائے گا۔ ہو سکتا ہے یہ صدمہ انھیں مزید المیوں میں مبتلا کر دے اور وہ پریشانیوں کے استحاہ سمندر میں ڈوبتے چلے جائیں۔

ایک خیال اور آیا —۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ کسی سہیلی کی مدد کا بہانہ کر دے۔ سہیلی سے قرض لینے کے بارے میں بتا دے۔ مگر اس کے ڈھار والدین قرض اور سہیلی کی مدد کو بھی گوارا نہ کریں گے، تب وہ نوکری کے بارے میں سب سے پہلے بتا دے گی اور اپنی بد حالی کا واسطہ کر نوکری کو باری رکھنے پر انھیں مجبور کرے گی۔ اپنے برے حالات کو سہارا دیے کے لیے نوکری کو بڑی چیر تو نہیں مانتا، میں کوئی عار تو نہیں۔ ملازمت کوئی شہ نہ تو نہیں۔

اس نے صبح سے ہی نوکری کر لینے کا تہیہ کر لیا۔ اور اس عزم کے بعد اس کی ڈھار سہیلی بندھ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے سر سے بہت بڑا بار اتر گیا ہو۔ وہ بالکل ہلکی پھلکی دکھائی دینے لگی تھی اور یوں محسوس کرنے لگی تھی جیسے وہ فلاؤں میں اڑنے لگی ہو۔

دفعتاً ذہن نے پلٹ لٹکایا۔

ایک ستارہ روشن ہوا۔ در ذہن کی سطح پر اس کی روشنی پھیلتی چلی گئی چند روز قبل بارش والی رات کا واقعہ اسے یاد آیا۔

وہ لوجران کہت تھا؛ — جس نے احبیب و شرافت کی انتہائی۔

بلندپوں تک جا کر اس کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کیا تھا۔ جس نے اس کو ڈاکٹر کے ساتھ گھربک پہنچایا تھا۔ جس نے موٹر سے ٹکر ہو جانے کی اس سے مدد کی تھی۔ جو رات گئے ایسے ملحوں میں اس کے کام آیا تھا۔ — کتا با اخلاق تھا وہ — اور میں — شبیلہ نے سوچا، میں نے اس سے کتنی بے رحمی کا سلوک کیا تھا۔ کیا سوچتا ہو گا وہ میرے بارے میں۔

شبیلہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ نہ جانے اسے تصور میں کیا کیا نظر آ رہا تھا۔ وہ اس لوجھان کی یک ایک حرکت، ایک ایک بات کو ذہن کی تہوں میں کرید کرید کرتا رہ کر رہی تھی۔ اس تصور میں اسے سکون کیوں مل رہا تھا۔ یہی پرسکون تصور بالآخر اسے نیند کی پرسکون دلدی میں لے گیا۔

صبح وہ اٹھی تو ہشاش بشاش تھی۔ ہاتھ سے فارغ ہو کر اس نے لباس تبدیل کیا۔ ارشاد احمد کی مزاج پر سی کی رابعہ بیگم کو سلام کیا۔ بھئی کی چند شوخیوں کے بعد وہ ناشتہ کر کے گھر سے باہر نکل گئی۔ گھر میں اس نے سہیلی سے ملاقات کا بہانہ کیا تھا۔

وہ اخبار میں ضرورت کے کاموں کو دیکھ کر کئی دفتروں اور پرائیویٹ فرموں میں پہنچی۔ مگر وہاں کا ماحول پسند نہیں آیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ لوگ اس کے کام سے زیادہ اس کے حسن سے متاثر ہوئے ہیں۔ وہ ان کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔ آخر وہ چلتے چلتے ایک فرم موٹر ریڈرز کے سامنے رک گئی۔ یہ آخری جگہ تھی۔ جہاں اسے قسمت آزمائی کرنی تھی۔

چیز اسی نے شیشوں والی گیلری سے گزار کر اسے مینجنگ ڈائریکٹر سے جدید طرز پر سچے ہوئے آفس میں پہنچا دیا۔ وہ جھبکتی جھبکتی آگے بڑھی۔ اس کے قدموں کی آہٹ سے لوجھان مینجنگ ڈائریکٹر نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ شبیلہ

نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ اس ایک نظر نے ہی نوجوان کے حسین چہرے پر پھیلی ہوئی شرافت کو عیاں کر دیا۔ اوروہ اپنے دل میں اطمینان سا محسوس کرنے لگی۔

”تشرعنا رکھیے! — نوجوان کا ہوجوہ بانہ تھا — فرمائیے۔“
 میں آپ کی فرم کے اشتہار کے مطابق مردوس کے لیے حاضر ہوئی ہوں۔“
 وہ بیچہ کر چمکا ہٹ کے ساتھ بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ — نوجوان شریفانہ انداز میں مسکرایا — ”آپ کی تعلیم — اور نام —“

”میرا نام شبیلہ ہے — میں نے ایف اے کیا ہے — اس نے اپنے کاغذات آگے بڑھائے — یہ میری سند ہے۔“

نوجوان نے پر اخلاق طریقے پر اس کے ہاتھ سے کاغذات لے لیے۔ اور چند لمحوں معائنہ کرنے کے بعد میز پر رکھ دیئے۔

”آپ انگلش بخوبی لکھ سکتی ہیں نا۔“

”جی! — کوشش کروں گی کہ آپ کی توقع کے مطابق کام کر سکوں۔“
 اس نے مترجم لہجے میں کہا۔

”وہ چند ثانیوں کے لیے کا سچر بولا — آپ کو ڈکٹیشن کا ٹیسٹ دینا ہو گا۔ کیا آپ تیار ہیں؟“

”جی بالکل —“ اس نے مطمئن لہجے میں کہا — ”آپ لکھائیے میں لکھتی ہوں۔“

ایک لطیف مسکراہٹ نوجوان کے ہونٹوں پر پھیل گئی اس نے پاکستان ٹائٹلز اخبار اٹھایا۔

اس نے رائیڈ، پیڈ اور قلم اٹھا کر شبیلہ کے سامنے رکھ دیا۔ شبیلہ نے قلم اور پیڈ اٹھا لیا اور اعلان لکھنے کے لیے مستعد ہو گئی۔

وہ لکھا رہا تھا۔ اور شبیلہ لکھتی جا رہی تھی۔ چند منٹ یہ سلسلہ جاری رہا اور پھر اس نے پیڈ نوجوان کو دے دیا۔ امتحان ہو چکا تھا۔ نتیجہ کا انتظار تھا۔ اور کادل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ گومگو کی حالت میں نظریں جھکا کر اپنی جگہ دھبہ کے رد عمل کی منتظر تھی۔ آخر انتظار کی ساعتیں گزر گئیں۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ آپ ہمارے آفس میں چل سکیں گی۔۔۔“

نوجوان نے محتاط لہجے میں کہا۔

”شبیلہ کے چہرے پر مت توں کے رنگ بکھر گئے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے دل۔۔۔ میں امیدوں کی کلیاں چمک کر بھول بن گئی ہوں۔ وہ کہکشاں فی منور راگنڈ پر سجائے لگی ہو۔۔۔ اس نے شوگر رنڈوں سے نوجوان کو دیکھا نوجوان کے ہونٹوں پر ایک غریب مسکراہٹ رقعات تھی۔ اور آنکھوں میں ایسی چمک تھی جسے بوس کا نام نہیں بلکہ شرافت کا منظر کہا جاسکتا ہے۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ صحیح مقام پر آگئی ہو۔

”میری اپوائنٹمنٹ کب ہو گی۔۔۔“ اس نے مسرت سے نڈتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کل صبح نوبے آپ اپنی سیٹ سنبھال لیں گی۔ نوجوان نے ایک نظر اسے دیکر کہا۔

”جی!۔۔۔ شکریہ!۔۔۔“ اس نے موڈ بانہ انداز میں کہا۔

”آپ کو فی الحال دو سو روپیہ تنخواہ ملے گی۔ اس کے علاوہ سالانہ بونس بھی ملے گا۔ آپ کے سپرد جو کام کیا جا رہا ہے۔ وہ کافی اہم ہے۔۔۔ جو ترقیاتی لیڈر آئیں گے۔ فزیم کی طرف سے آپ کو ان کا جواب دینا ہو گا۔ جو آپ میں آپ

لکھایا کر دیں گا۔“

اس کے ساتھ ہی گھنٹی کی ایک آواز گونجی۔ جو فوجوان نیپنگ ڈائریکٹر نے چپڑا سی کوبلانے کے لیے استعمال کی تھی — چپڑا سی آیا — اس نے کہا۔

”اچیں صدیقی صاحب کے پاس لے جاؤ۔ یہ کل سے ہمارے آفس میں کام کریں گی۔“

وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ ادھیڑ عمر کے صدیقی نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ اور چپڑا سی کی بات سننے کے بعد اسے اس کی سیدھی، دفتری اوقات اور ضروری معلومات مہیا کر دیں۔

چند لمحوں کے بعد وہ گھر کی طرف رواں تھی۔ اس کا دل مسرت سے کھلا ہوا تھا۔ اب افلاس اور احتیاج کے سائے چھٹ جائیں گے۔ اب ہمارے گھر میں بھی خوشی اور اطمینان ہو گا۔ وہ خوش تھی اور اس کی تیز رفتاری اسی خوشی اور خود اعتمادی کو ظاہر کر رہی تھی۔

سہیل نے اپنے دل کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اس لڑکی کو بہت ڈھونڈا مگر وہ نہ مل سکی۔ اس کی طبیعت بوجھل بوجھل رہنے لگی۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا۔ جیسے اس کا سکون چھین گیا ہو۔ اور اسے کرناک جذبات کے شعلوں میں جھلنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہو۔

وہ اسے آگ کے حوالے کر گئی تھی۔ شعلوں کی پیش اسے جلانے دے رہی تھیں۔ وہ لاپرواہ اور لالابی طبیعت کا مالک ہونے کے باوجود آگ کی لپٹوں سے باہر نہ نکل سکا۔ اس کے خیال کو آئینہ دل سے صاف نہ کر سکا۔ اس کی منیڈیاں دیران ہو گئیں۔ سنگریٹ کا تلخ دھواں اس کے کمرے میں کثرت سے جمع رہنے لگا۔ اسے شب بیداری کی عادت سی ہو گئی۔

اس کی بے کلی، بے چینی اور اضطراری کیفیت میں دن رات اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اس اضافہ کی وجہ شبیلہ کی ذات تھی۔ جو اسے زندگی کے کسی موڑ پر نہ مل رہی تھی۔ وہ گھنٹوں تک کو اترز کے سامنے کھڑا رہتا۔ کہ شاید اس کی جھلک نظر

اجائے۔ مگر وہ انتہائی خواہش کے باوجود بھی اس کی ایک جھلک نہ دیکھ سکا تھا۔ جب وہ واپس آتا تو اس کے دل کی آگ پہلے کی نسبت زیادہ دھبک رہی ہوتی۔ اس کا دل اضطراب انگیز جذبات اور پریشانیوں کی آماجگاہ بنتا جا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قنوطیت پسند ہوئے لگا تھا۔ شوخ و شنگ طبیعت رکھنے کے باوجود وہ افسردہ رہنے لگا تھا۔

اس کی اندردگی کو شاہدہ نے طبعاً محسوس کیا تھا۔ وہ اسے بلاتی، اپنی طرف متوجہ کرتی مگر وہ بالکل توجہ نہ دیتا۔ اور جھپکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھر کر اس کے سر پر پار سے ایک دھول جاتا اور آگے نکل جاتا۔ وہ گیلیروں میں پچھلے کے لیے اس کے پیچھے بھاگتی۔ اس کے ساتھ شرارتیں کرتی۔ مگر وہ اس کے ساتھ یونہی سی چہر چھاؤں کے آگے نکل جاتا۔ پوڈینکویس آنا اور گاڑی میں بیٹھ کر سڑکوں کی آواز گروہی کے لیے نکل پڑتا۔ کار میں بے مدعا گھومنا اس کا روزانہ کام مول بن گیا تھا۔

اس کی فطرت کے اس بدلنے ہوئے رخ سے سب ہی پریشان تھے۔ ناشتے لے کر اور ڈنر پر چپکنے والا لوجوان خاموش رہنے لگا تھا۔ وہ ادھر ادھر کی رسمی سی باتیں کرتا اور کھانے کی میز سے سناٹہ جاتا۔ اسے کسی چیز میں دل چسپی نہ رہی تھی۔

آج بھی وہ ناشتے کی میز پر بیٹھا تھا تو اس کے والد افکار احمد نے اسے گہری نظر سے دیکھا۔ وہ کچھ روز سے زیادہ ہی بھابھا تھا۔ اس کے باپ نے نظریں ملائیں۔ باپ کی نظروں میں سوالیہ جذبے ٹپ رہے تھے۔ وہ ان نظروں کی تاب نہ لاسکا۔ اور گردن جھکا کر ناشتہ کرنے لگا۔

”آج کل بڑے اداس رہنے لگے ہو۔“ اس کے والد نے محبت بھرے

انداز میں کہا۔

”جی! نہیں تو! — مجھے محض اکیلا غم ہو سکتا ہے!“

”انسان کو کسی دوزخ بھی کوئی غم کھیر سکتا ہے۔۔۔ تمہیں بھی اپنے غم کا اظہار کر دینا چاہیے۔“ ————— ان کا لہجہ دوستانہ اور ہمدردی لیے ہوئے تھا۔

”مجھے کوئی غم نہیں ہے ڈیڈی ————— ایسی کون سی ضرورت ہے جو پوری نہیں ہوتی؟“ ————— وہ مسکرائے، ”نا کام کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”پھر اس اداسی کا سبب؟“ —————

”شاید آپ کی نظر کو دھوکہ ہوا ہو۔۔۔“

”میری نظر اور دھوکہ ————— انھوں نے گہرے لہجے میں کہا ————— بیٹے میری نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔ یوں لگتا ہے جیسے تم ہی مجھے دھوکہ میں رکھنا چاہتے ہو۔۔۔“

”سہیل کے ہاتھ کانپ گئے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکا اور چہرہ کا فون دکھ سرخ ہو گیا۔ اس پر اضطرابی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس کی آواز ملن میں اٹک گئی ————— میں اور آپ کو دھوکہ میں رکھوں ————— یہ کیسے ممکن ہے۔ ڈیڈی۔۔۔“

”بیٹے! ————— افتخار احمد کے چہرے پر خوشی سی چمکی ————— ”بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو زبان سے نہیں کہی جاسکتیں۔ اسخیں صرف محسوس کیا جاتا ہے۔“

”کیسی باتیں ڈیڈی! ————— وہ متردد ہو کر اپنے باپ کو غور سے دیکھنے لگا ————— میں کچھ سمجھ نہیں!“

”تم سب کچھ سمجھ گئے ہو بیٹے! ————— ان کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رقص کرنے لگی ————— جو تمہارے دل میں ہے وہ چہرے پر آگیا ہے چہرہ ۱۰ کا آئینہ ہوتا ہے۔۔۔“

”تو پھر اس آئینہ میں آپ نے کیا دیکھا —“ اس نے گردن جھکا کر مضمحل آواز میں کہا۔

”ایک سچی سچائی دہن کا چہرہ —“ ایک بے دانغ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر لہرا نے لگی۔

”ارم بشر مار سرخ ہو گئی —“ سہیل کا رنگ اڑ گیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی خاموشی اس کے ڈیڈی کو اس انداز میں سوچنے پر مجبور کر دے گی۔

”ڈیڈی! —“ ابھی تو بھائی جان کی شادی نہیں ہوئی — میری شادی کا مسئلہ کیسے بچ میں آگیا؟ —“ وہ انسر دہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”شادی تمہاری پسند سے ہوگی بیٹے! —“ پھر انکار کیا — وہ تنہوی دیر کے لیے رکے پھر بولے — اپنے دل کا حال تمہیں ظاہر کر دینا چاہیئے“ سہیل کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ وہ بے حد گھبرا گیا تھا۔

”میرے دل کا کیا حال ہو سکتا ہے ڈیڈی! —“ میرے دل میں کچھ نہیں ہے۔“ افتخار احمد اس کی الجھن اور گھبراہٹ پر مسکرائے لگے۔ اور اسے غور سے دیکھنے لگے۔ سہیل کی پیشانی پسینہ سے تر ہو گئی تھی۔ جیسے اس کے دل کا چور کھٹا گیا ہو۔ اس کا وہ راز فاش ہو گیا تھا جس کو چھپانے کی کوشش میں وہ اداس اور ملول رہنے لگا تھا۔ جس کے لیے اس کی نیندیں ویران ہوئی تھیں جس کے لیے وہ پریشانیاں میں گھرا رہا تھا۔

”شاہدہ زہد زور سے تالیاں بجا رہی تھی۔“

”بھئی کی شادی ہوگی —“ آنا —“ بھئی کی شادی ہوگی؟

”افتخار! شاہدہ کو مسکرا کر دیکھ رہے تھے —“ ارم نے پیار سے ڈانٹا۔

— اب چپ بھی رہے گی یا پلائے تہ جالے گی۔ بڑی خود سر ہو گئی ہے۔“

”شاہدہ نے منہ لبر لیا
 ”باہجی۔ وہ غصہ میں بولی — آپ کو سب جانی بکے آنے کی خوشی
 نہیں ہے کیا؟“
 دم سحر مانگئی

”خوشی کیوں نہیں —“ سچر اس نے طعنے سے کہا — ”تو سمجھتی ہے
 میں تیری طرح چلانے لگوں — ارم اسے ڈانٹ کر مسکراتے لگی۔ اور شاہدہ
 نے منہ پھلایا۔

”ذبیذی — دیکھ لیجئے — باہجی بلاوجہ ڈانٹ رہی ہیں —“
 اس نے افتخار احمد سے شکایت کی۔

”میری سچی کو مت ڈانٹو بھئی! —“ انخار احمد مسکرا کر لولے
 ”سب جانی جان! آپ نے تو باہجی کو کچھ کہا ہی نہیں —“ اس نے سہیل کی
 طرف دیکھ کر کہا۔

سہیل چولا اور شاہدہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر..
 کوشش کے باوجود بھی وہ جتنی مسکراہٹ بونٹوں پر نہ لاسکا۔

”اچھا ابھی ارم! اب ہلاری نخی گڑا کو کچھ نہ کہنا۔ —“ اس نے
 ارم کو دیکھ کر کہا — ارم نے شاہدہ کی طرف دیکھ کر بونٹوں کے کئی زاویے
 بدلے۔

”لیجئے اب کبھی کچھ نہ کہوں گی اس چڑیل کو —“ وہ چالے پیٹنے لگی اور
 دل ہی دل میں مسکراتے لگی۔

شاہدہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسے جوش آگیا۔

”باہجی جان! — میں چڑیل ہوں —“ دل سے کہہ رہی آپ —“

۳۱ کی آواز غصہ میں بھری ہوئی تھی۔

”اور نہیں تو کیا تم کسی چڑیل سے کم ہو۔۔۔۔۔“ سہیل نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔

”بھائی جان! آپ نے بھی باجی کی حمایت شروع کر دی۔۔۔۔۔“ وہ دیرینے

کاسا اتنا زب کر لہوئی۔۔۔۔۔ نیچے میں ناتستہ نہیں کرتی۔۔۔۔۔

وہ اسٹنٹ لگی، ارم نے ٹپک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

”کہاں چلی میری پری جیسی بہن!۔۔۔۔۔ اس نے پیار سے کہا۔۔۔

چھوڑ دینے مجھے۔۔۔۔۔ میں بچی نہیں ہوں،۔۔۔۔۔ میں چڑیل ہوں۔۔۔

وہ رو ہانسی ہو کر لہوئی

”چڑیل نہیں تو برے دشمن!۔۔۔۔۔ ادم اسے پیار سے کرسی پر بٹھا

کر لہوئی۔

”وہاں صحتی! تمہارے دشمنوں کے لیے یہ بد دعا خوب ہے!۔۔۔۔۔ سہیل

نے ذرا شوخ بن کر کہا۔

”بھائی جان! اگر آپ کہتے ہیں تو سمجھ گیا، ہے۔۔۔۔۔“ وہ کرسی پر

صحتک سے مینہ کر لہوئی۔۔۔۔۔ ”اچھا یہ بتائیے بھائی جان۔ بھائی جان کدب

آئیں گی؟“

”افتخار احمد نے سمجھ لیا، بے اختیار ایک قہقہہ لگا، سہیل بوکھا گیا، چائے

کا کپ چھٹک بڑا۔

”انجین مادی میٹریڈی شری ہے۔۔۔۔۔“ افتخار احمد قہقہہ روک کر

سکرا کر لہوئے

”میں نے کوئٹہ شہرارت کی بات کی ہے ڈیڑی!۔۔۔۔۔“

عصمت بیٹ سے کہا۔

ناشتے سے ناراض ہو کر وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پورٹیکو کی طرف آیا۔ اس نے برلینا کا دروازہ کھولا۔ اور ڈاکوٹنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ شگریٹ کا دھواں اڑا کر گاڑی اسٹارٹ کی پھر اس نے شیشے پر نظر کی تو اسے بھاگ کر آتی ہوئی ارم دکھائی دی۔ اس نے ایکسیلیٹر سے پاؤں اٹھالیا۔ دوسرے لمحہ ارم دروازہ کھول کر پھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔
 ”چلے بھائی جان —“ اس نے نال سیٹ پر ڈالنے ہوئے کہا۔
 ”کہاں چلوں۔“

”کالچ۔“

”ارے سہی۔ میں بھائی جان کی مدد کے لیے جا رہا ہوں۔“
 ”کیوں! بھائی جان کا کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے کیا —“ ارم نے شرارت سے کہا۔

”تم کتنی بورلرڈ کی ہو —“ وہ ناگواری سے بولا — ”جھگڑا کیا۔ میں آج ان کے ساتھ ہی کر کام کروں گا۔ تمیں اور تم دوسری گاڑی میں کالچ چلی جاؤ۔“
 ”بھائی جان! —“ اس نے اٹھلا کر کہا — ”مجھے پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔ گاڑی جا چکی ہے۔ جب تک ڈیڈی گاڑی واپس بھیجیں گے مزیدور ہو جائے گی۔“

”اوہ! — کیا مصیبت ہے؟“

”آپ مجھے ساتھ لے جانے کو مصیبت کہتے ہیں —“ وہ غصے سے بولی۔
 ”لیجئے میں اتر جاتی ہوں۔ آج کالچ جاؤں گی ہی نہیں —“ وہ منہ بسور نے لگی۔

”اچھا یعنی بیٹھو —“ وہ نرمی سے بولا۔

”دیکھا مثلاً! آپ کو —“ وہ مسکرا کر بولی۔

’الحق تو بہت شوق ہو یو بنی عجوت موت سنجیدہ بنی رہتی ہو۔۔۔۔۔‘
 سچ کر لولا۔

برائیا سرگ پر تیزی سے دوڑتی ملی جا رہی تھی۔ چند منٹوں کے بعد ارم کا۔
 بلک اٹھا۔ اس نے کجیت کے قریب گاڑی ٹھہرائی۔

’مجھے! — بھائی لاڈلی اب نیچے اتر بیٹے! —۔۔۔۔۔‘ اس نے
 پلید سے کہا۔ ارم نہ بانگئی۔

’بھائی جان! آپ تو بڑے بوریس —‘ یہ کہہ کر وہ ہنستی ہوئی پیچھے
 اتر گئی۔ سہیلی نے قہقہہ لگایا۔

ارم کو کالج چھوڑ کر سہیلی نے نور کاٹا اور گاڑی کی رفتار بڑھانے لگا۔
 مختلف سڑکوں سے گزرنے کے بعد وہ شاہراہ پر آگیا۔ اور گاڑی کو پارکنگ میں
 کھڑا کر کے ایک عمارت کے اندر گھس گیا۔ یہ اس کی اپنی فرم کا آفس تھا۔

اس نے دروازہ کھولا۔ جیسے اسی اسے دیکھ کر مودبانہ کھڑا ہو گیا تھا
 ’بھائی جان! —‘ سہیلی لانگ ٹیبل کے پاس پہنچ کر لولا۔ اور پچھلے
 ٹکڑے والی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بھائی نے چونک کر اسے حیرت سے
 دیکھا اور ناکل بند کر دی۔

’یہ آج کدھر سبھل پڑے؟ — وہ پیار سے سہیلی کی طرف دیکھ کر لولا۔
 ’یہ ہم صوفیائوں کی یاد کیسے آگئی۔‘

’صوفیائوں کی نہیں۔ آفس نشینوں کی کہتے بھائی جان! —‘ وہ
 شوق سے لولا۔

’اچھا — یوں ہی سمجھ لو —‘ اس کے بھائی نے قہقہہ لگایا۔
 ’ٹائیڈی نے ڈانٹ پلائی ہوگی۔‘

”ڈیڈی تو ہر روز می ڈانٹ پلاتے ہیں — اس نے لاپرواہی سے
 کہا — ”آج اپنے دل نے ہی کہا کہ بھائی جان کی خدمت کر ہی دینی چاہیے۔“
 ”بزرگوں کی سپوا کرو گے۔ تب ہی کچھ پاؤ گے — اس کے بھائی نے
 محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔

”یہی سوچ کر آگئے ہیں! — وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔
 ”زہے نصیب تو سچڑائیے! — نیز تو سیٹ سنبھال لے۔“
 ”آپ کو سیٹ مبارک ہو — — جیادو سرے کمرے میں سیٹ سنبھال
 لوں گا۔“

”ادھ! — تم تو بالکل سنجیدہ ہو کر آئے ہو۔“
 ”کچھ ایسی ہی بات ہے — اس نے جبرے کو ذرا ضرورت سے
 زیادہ مہینے بنا کر کہا۔ اس کا بھائی ہنسنے لگا۔
 ”اسی لیے تو کہتا ہوں — میری سیٹ پر بیٹھ — اس کا بھائی
 کرسی چھوڑ کر بولا — مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ کل عہدہ لے لیے
 دوسرے کمرے میں آفس کا انتظام کر دیا جائے گا۔
 ”بہت اچھا — — وہ اپنی کرنی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ اس کے
 بھائی نے ہمارے اس کے تالے پر ہاتھ رکھ دیا۔
 ”اب تو عقل نہ ہو سہارا ہے۔“

”زار عقلمندی خود ہی جنس دیتا ہے بھائی جان۔“
 ”اب تو فلا سفر بھی ہو گئے ہو — وہ حیرت اور پریشانی نظروں سے
 سہیں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”میں نے ملا سٹی میں نہیں اگناکس میں ایم۔ اے کیا ہے بھائی جان!“

”اسی لیے تمہیں نے اپنی سیٹ دی ہے اپنے شیر کو ——— جواب دل
جھا کر کام کرو۔ میں دو گھنٹے تک واپس آ جاؤں گا۔“
”او۔ کے۔ بھائی جان! ——— سہیل اپنے بھائی کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور
اس کے بھائی نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

سہیل دانتوں میں قلم دبا کر خیالوں کی مادلیوں میں سرگھاں بٹھا، ابھی چند
منٹ ہی اسے اس حالت میں گزرے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے
کریڈل سے ریسیور اٹھا کر فون سنا۔ ابھی وہ فارغ ہوا تھا کہ دوسرے فون کی
گھنٹی بجنے لگی۔ پھر تیسرے اور چوتھے فون کی بھی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ بوکھلا گیا۔
اس نے بڑی مشکل سے باری باری سب فون سنے اور مختلف قسم کے جوابات
دینے۔ وہ تھوڑی دیر میں ہی انتہائی مصروف ہو گیا۔ فون سننے کے بعد اگر ذرا
وقت ملتا تو کوئی نہ کوئی آفس کلرک کھڑا ملتا، ضروری کاغذات پر دستخط کر کے ذرا
سراٹھاتا تو دوسرا کلرک اس کی جگہ آ موجود ہوتا تھا۔ وہ خود اپنی مصروفیت سے
گھبرا سکا تھا۔ آخر اس نے تنگ آ کر فون سننے بند کر دیئے۔ اور ریسیور کریڈل
سے اتار کر میز پر رکھ دیئے۔ فائلیں بند کر کے ان پر شیشے کے پیرو ریٹ رکھ دیئے
اور لاکوں کو ٹھکانے لگا۔ اس طرح اسے چند منٹ فرصت کے قیسر آ گئے۔ اس
نے ایک گہرا سانس لیا۔

دفعتاً کمرے میں تادموں کی آہٹ ہوئی۔

”باس! ——— یہ ضروری لیٹر ہے اسے دیکھ لیجئے! ——— وہ چونکا
اور پھلی کی سی سرخٹ سے لگا ہیں اٹھائیں۔ بیکارگی اس کی لگا ہیں اشاروں کی
طرح جگمگاٹیں اور دل تیزی سے دھڑکا۔ رنگ زرد ہوا اور پھر ایک دم سرخ ہو
گیا۔ جسم میں ایک اضطرابی کیفیت کرنٹ کی طرح پھر گئی۔ اس کی نگاہوں میں

تعب، حیرت، پریشانی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ وہ شبیدہ کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

شبیدہ کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ بھی ساکت و جامد کھڑی تھی۔ گہری حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ سی گئی تھیں۔ اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ دل کی دھڑکن میں شدت آگئی تھی، اُسے یوں لگا رہا تھا جیسے اس کے بدن کا تمام خون غور لیا گیا ہو۔

”آپ! — آؤ لا رہیں! سہیل کے لب لے۔ اس کی آواز پر وہ چونکی اسے اپنی حالت کا احساس ہوا — وہ سنبھلی — اس نے اپنے جذبات کو قابو نہیں کیا۔

”باس! کہاں ہیں —“ اس نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا —
 ”یہ ضروری خط دکھالے ہیں —“ اس نے خط سامنے کیا۔ وہ گھبرائی گھبرائی سی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ باس کی جگہ اس نے کیسے لے لی اس دوران میں وہ خود کو کافی سنبھال چکا تھا۔ اور اس کی ہر ادا کی کیفیت سے محفوظ ہونے کی ضمانت چکا تھا۔

”لایئے! یہ خط مجھے دے دیجئے —“ اس نے ہاتھ بڑھا کر رعب سے کہا۔
 ”آپ کو — وہ ہچکچائی —“ مگر آپ کی حیثیت کا یہی تو پتہ

چلے۔
 ”اپنے باس کی سیٹ پر مجھے دیکھ کر بھی میری حیثیت کا پتہ نہیں چل سکا۔ آپ کو —“ پھر اس نے بھاری آوازیں کہا — ”لایئے خط —“
 شبیدہ بدستور اگ سنبھل گئی تھی۔

رنا نہیں تم نے — وہ مصنوعی انداز میں گرجا — تم آخر کون؟
وہ اس کے بوجہ ایک دم گھبرا سی گئی۔ اس کے جسم میں ہلکی سی سحر قراہٹ
پیدا ہوئی۔

بہار کی معمولی لڑکائی — پھر اس نے ذرا حوصلہ کر کے کہا — میرا
خیال ہے آپ مجھے جانتے بھی ہیں؟
وہ دل ہی دل میں ہنسا، مگر اس نے اس کیفیت کو اپنے چہرے سے ظاہر نہ
ہونے دیا۔

”میں نہیں جانتا کسی کو — پھر وہ پر رعب آوازیں بولا۔
”میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسی جاہل لڑکی کو یہاں کس نے ملازم رکھا ہے؟
”جی! اس نے مجھے ملازم رکھا ہے!“ وہ بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی۔
”اس — اس کی رٹ لگا رکھی ہے — اس تو تمہارے سامنے
بیٹھا ہے — پھر اس نے رک کر اسے گہری نظروں سے دیکھا۔
”تمہارا نام کیا ہے؟“

”جی! — وہ گھرائی جا رہی تھی۔ دہشت سے اس کا جسم مرتعش تھا۔
”میرا نام شبیلہ ہے۔“

”بہت پیارا نام ہے —“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔
”جی۔ حیرت، پریشانی اور تعجب سے شبیلہ کی آنکھیں سمجھل گئیں۔
”میرا مطلب ہے کہ نام کی طرح تمہارا کام بھی اچھا ہوتا تو کتنی خوشی کی بات
ہوتی — اس نے ذرا نرمی اختیار کی

”میرے کام میں آپ نے کیا خرابی محسوس کی؟“
”یہ بات کیا گم خواب ہے کہ تمہیں حکم کی تعمیل کرنا نہیں آتی۔“ اس نے

تیکھے لمبے میں کہا۔
 "کس کے حکم کی تعمیل! — اب وہ ہر اس کی کیفیت کے واسطے باہر
 نکل چکی تھی۔"

"میرے حکم کی تعمیل! — وہ خشت گیس لمبے میں بولا۔
 وہ دانستہ اس چپقلش کو طور دیئے جارہا تھا۔
 "میں ابھی تک آپ کی دفتری حیثیت سے لاعلم ہوں — وہ بے خوف
 ہو کر بولی — "اس لیے آپ کسی حکم کی تعمیل نہیں کر سکتی۔"
 "میں جارہی ہوں —" وہ واپس مڑی۔
 "ٹھہریئے! —" اس نے شبیلہ کو روکا — "آپ کو اسی وقت
 استغفہ اپنی پیش کرنا ہو گا۔"

وہ جوش سے بل کھا کر پلٹی۔ اور منظر میں آکر دو قدم آگے بڑھی۔
 "مجھے یہاں آنے ہوئے دن ہی کتنے گزرے ہیں۔ میری طرح ابھی استغفہ
 نے بھیجے! — اس کی آواز بھڑا گئی۔ اس کا چہرہ معوم ہو گیا۔ دل کا ساما درد
 آنسوؤں میں ڈھل کر بہنے کے لیے راہ تلاش کرنے لگا۔ مگر شبیلہ نے اسے راہ نہ
 دی۔ اور آنسوؤں کو آنکھوں کے پیچھے ہی کہیں دفن کر دیا۔

سہیل اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی تازہ کیفیت سے وہ ٹپ گیا
 اس کا دل لرز گیا۔ اس نے اپنے جسم میں ایک اضطراب انگیز سحر تھا ہٹ سی ہوئی
 کی۔ وہ اپنے اس مذاق پر محنت نہادت محسوس کر رہا تھا۔ اس کی سوجنی نے۔
 شبیلہ کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے۔ اسے زبردست ٹھیس پہنچائی تھی۔
 اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا جس نے اس کی تلاش میں ہر شے کی خاک چھاننا چاہا تھا
 جب وہ ملی تو اس نے کتنی اپنے دل دی ہے اس کا دل دکھایا تھا۔ وہ اپنے کیے

پر بے حد مناسف تھا۔

”میں استغفار دینے کے لیے تیار ہوں۔“ وہ افسردگی سے بولا۔
 ”جب آپ کو میری دفتری حیثیت کا علم نہیں ہے تو آپ مجھے استغفار کہیں
 دے رہی ہیں۔ وہ نرم ہو کر بولا۔

”ایک معمولی کلرک اور کر سہی کیا سکتی ہے۔“ شبیلہ نے کرنباک
 انداز میں کہا۔

اس نے شبیلہ کے احساس چہرے پر ایک ثانیہ کے لیے نظریں قلم کر دیں۔
 جب شبیلہ نے نظریں اٹھائیں تو وہ اپنی نظر ادھر ادھر بھٹکا چکا تھا۔ وہ اس کے
 درد و غم میں ڈوبی ہوئی اندوہناک نظروں سے نظریں نہ ملا سکا۔
 ”آپ یہ سوچ سکتی ہیں کہ میں آپ سے استغفار لے لوں گا؟“ وہ ایک
 لمحے کے لیے رکا پھر گہری سوچ میں پولا۔ ”آپ نے ٹھیک کہا ہے۔ کہ میں آپ
 کو جانتا ہوں۔ یقین جانے مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے میں آپ کو بچپن ہی سے۔
 جانتا ہوں۔“ مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہم ایک ہی راستے پر چلتے ہوئے
 اس منزل پر پہنچے ہیں۔“ پھر اس نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر
 ایک گہرا سانس لیا۔ ”یقین کیجئے! میں آپ سے مذاق کر رہا تھا۔“
 ”اور۔“ میں آپ سے مذاق نہیں کر رہی ہوں۔“ اس نے اپنے
 لیے کو مستحکم بنا کر کہا۔ ”میں اب سنجیدہ ہوں۔“ میری طرف سے
 استغفار ہی سمجھئے۔“

وہ اس کے مستحکم لیے سے گھبرا گیا۔ اس کے چہرے پر اس ادراخت
 بھگ گیا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں آپ کو کسی قسم کا صدمہ پہنچاؤں۔ میری وجہ

”آپ استغفار پیش کیجئے! — میں بڑی الجھن میں پڑ گیا ہوں —“
وہ پریت فی سے بولا۔

”میں آپ سے بھی زیادہ الجھن میں پھنس گئی ہوں —“ وہ مثنیٰ لہجہ میں
بولی۔

”آپ نے بارش والی رات میں کہا تھا کہ میں آپ کا یہ احسان زعمی بھرنے بھول
گئی۔ اگر آپ میرے کسی سلوک سے متاثر ہیں تو خدا کے لیے استغفار دیجئے۔ وہ نہ میں
خود کو خدا کی بھرنے صاف کر سکوں گا۔“

اس نے سہیل کے متردّد چہرے کو بغور دیکھا۔ جب اس نے اس کی نظروں
سے نظریں ملائیں۔ تو چونک کر دیوار کی طرف دیکھنے لگی۔

دفتار وادہ کھلا اور راحیل ہنستا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

”کہو بھئی! — کیا پراگرس ہے؟“

”بھائی جان! کیا خاک پراگرس ہوگی — یہاں تو الجھنیں ہی الجھنیں

میں —“ لفظ بھائی جان پر وہ زور سے چونکی۔ اسے اس کی دفتری حیثیت
کا اچھی طرح علم ہو گیا۔ وہ کچھ دل گرفتہ اور طویل سی نظر آنے لگی۔

راحیل نے میز پر پڑے ہوئے رسیو روں کی طرف حیرت سے دیکھا۔ اور
تہقّقہ لگایا۔

”تمہاری پراگرس کا اندازہ تو میز دیکھ کر ہی ہو گیا ہے۔ کیوں کچھ غلط
کہا میں نے؟“

”آپ نے تمہیک ہی کہا ہے بھائی جان! — سمجھ میں نہیں آپ کس طرح
کام کرتے ہوں گے۔“

راحیل نے لاپرواہی سے تہقّقہ لگایا۔

”ابھی دیکھ لیتا۔۔۔ تمہارے سامنے سب کام اصول کے مطابق ہوتا چلا جائے گا۔۔۔ پھر اس نے سہیل کو محبت سے دیکھا۔۔۔ دراصل تم ابھی اتنی معریت کے عادی نہیں ہوئے۔ آہستہ آہستہ ہو جاؤ گے۔“
 ”بھائی جان یہ تو بڑی الجھن کا کام ہے۔ شاید عادی نہیں ہوسوں۔۔۔“
 وہ آنکھیں پیر کر ساحل کو دیکھتے ہوئے بولا۔ میں تو دو گھنٹوں میں ہی بہت اس ہو گیا ہوں؟

”اگر حوصلہ کر کے یہاں آگے ہو۔ تو اب بڑا گلے کی تیاری نہ کرنا۔۔۔“
 وہ ہنسا۔

”اب یہاں سے کون بھاگ سکتا ہے؟“
 ”اس نے ایک بھر پور نظر شبیدہ پر ڈالی۔
 شبیدہ اس کے گرم گرم نظروں کے لمس سے لجا گئی۔ اور اس نے جلدی سے اپنا رخ پلٹا۔

”باس۔۔۔ یہ ایک ضروری لیٹر ہے۔۔۔ اس نے ساحل کی طرف دیکھ کر سر سے لہجہ میں کہا۔

”اوہ!۔۔۔ لائیو!۔۔۔ یہ کہہ کر وہ اپنے کرسی پر بیٹھ گیا اور سہیل اس کے پاس والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اور اپنے بھائی سے نظریں چرا کر شبیدہ کے حسین چہرہ کو دیکھنے لگا جس پر مغنویت کی ردا پھیلی ہوئی تھی۔ اور کھلمندی کے آثار چھائے ہوئے تھے۔

”تشریف رکھیے۔۔۔ ساحل نے نزدیک کھڑی ہوئی شبیدہ سے براخلاق لہجہ میں کہا۔

”شبیدہ بیٹھ گئی۔ پچھلے گدے ذرا سے دبے اور اس کے نازک اور

گداز حیم کا بار بڑے پیار سے سنبھال لیا۔ اس انداز سے سہیل کے دل میں
نشہ سا اتر گیا۔

• راحیل نے جلدی جلدی خط کی عبارت پڑھی۔ اور بولا۔ ————— وہ
جواب لکھنے میں لکھاتا ہوں ————— وہ لکھنے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ ڈکٹیشن
بولنے لگا۔ شبیلہ بڑے انداز میں لکھنے لگی۔

سہیل شبیلہ کے حسین چہرے کو دیکھتا رہا۔ وہ کام میں مگن اس کی موجودگی
کو یکسر نظر انداز کر بیٹھی تھی جب وہ ڈکٹیشن مکمل کر چکی تو اس نے ایک گہرا سانس
لیا اور غیر ارادی طور پر اس کی نظریں سہیل کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ بھی اس کی طرف
دیکھ رہا تھا۔

نظروں کا تقادم ہوا ————— ایک برقی روشنی حیموں میں دوڑ گئی
مگر دوسرے ہی لمحہ وہ بکھلا گئی ————— چند لمحوں بعد اس نے خود کو
سنبھال ————— یہ انداز راحیل نہ دیکھ سکا تھا۔ کیونکہ اس کی نظریں فانی
پڑ چکی ہوئی تھیں۔

• باس! —

• فرمائیے! ————— راحیل نے نظریں اٹھا کر شبیلہ کو دیکھا —————
سہیل کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں شبیلہ اس
کی شرارت راحیل کو نہ تباہ کرے۔ اس نے شبیلہ سے آخر کی بھی تو یزنا، یادنی
تھی۔ اس نے اسے بہت تنگ کیا تھا۔

• باس! میں آج ————— زرا جلدی گھر جانا چاہتی ہوں؟

سہیل کو یوں لگا۔ جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو۔ —————
اس کے دل کی دھڑکن کھنکھار آگیا۔ ————— اور —

اس کے دل میں شبیدہ کی توقیر انہوں ہو گئی۔ مگر شبیدہ نے
 اس کی طرف — نظر اٹھا کر دیکھا تک بھی نہیں — اور
 کاغذات اٹھا کر باہر آ گئی۔

بھائی جان! — آپ کو تو ہر وقت بس اپنی فرم کا خیال
 رہتا ہے۔ شاہدہ نے چہک کر کہا — ”کبھی ہماری سیر و تفریح کا بھی ..
 خیال آیا —“

راحیل زور سے ہنسا۔

”تمہاری سیر و تفریح کا دوبار سے زیادہ ہے کیا؟ —“ راحیل
 نے ہلکا سا چیت شاہدہ کے گال پر لگایا — ”تمہیں تمہارے مطلب کے
 بھائی جان طے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ تفریح کو چلی جایا کرو۔ جیسی تم شہر ترقی
 ہو ویسے ہی یہ شہر —“

”مگر بھائی جان — اب تو سہیل بھائی بھی یہیں رہ کر نہیں
 جاتے۔“

اس نے منہ کا زاریہ بدل کر سہیل کی تنہایت کی۔ سہیل نے مسکرا
 کر شاہدہ کے سر پر ایک دھول جما دیا۔

۔ شکایتیں کرتی ہوڑی بی ! — وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔
 • اودہ آپ دارتے کیوں ہیں بھائی جان ! — شاہدہ ناک سیکڑ
 کھینچی۔

اس کی حالت دیکھ کر سب مسکرانے لگے۔ سہیل نے زور سے تہقہہ لگایا۔
 • ارے سبھی ارم ! جلدی سے کمرہ لاؤ اٹھا کر — اس وقت ہماری
 بڑی بی اچھے موڈ میں ہیں — ایک دو تصویریں ہی لے لیں ان کی۔
 سہیل اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔
 • بھائی جان جانے دیجئے — تصویریں کیوں منائے کی جائیں۔
 ارم نے ہنس کر کہا۔

• باجی ! — آج تو آپ کھلم کھلا دشمنی پر اتر آئی ہیں۔
 اس نے روہانسی صورت بنا کر کچھ ایسے مصومیت سے یہ الفاظ کہہ کر سب
 ہی بے اختیار تہقہہ لگانے پر مجبور ہو گئے۔ اور ارم کو اس پر شدید پیار آ گیا۔
 اس نے اسے پیار سے گھنچ کر اپنے سینے سے لپٹا لیا۔
 میں اپنی ننھی منی پیار سی پیاری گریبا کی دشمن بن سکتی ہوں بھلا —
 وہ محبت سے بولی۔

فرحتوں کی کھکشان میں مسکراہٹوں کی روشنی بھنپا کر رہی تھی۔ اودہ
 ڈانٹک مال میں بیٹھے بڑے ہنساؤں بھاشاؤں انداز میں شام کی چائے پی رہے
 تھے۔

چہرے سچول کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ کئی دن بعد آج سہیل سمیٹے
 نظر آ رہے تھے۔ تاہم ان کے ہرے دل کے ہلکی سی غلش کے آؤم کبھی کبھی چھلک
 جاتے تھے۔

”ڈیڈی! آج تو سہیل نے بڑا کام کیا ہے۔۔۔ راحیل نے سہیل کی طرف
مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا۔
”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔۔۔ افتخار احمد تحسین آمیز نظروں سے سہیل
کو دیکھ کر بولے۔

”دیکھ لیجئے! ڈیڈی! میں نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔۔۔ سہیل نے
ہنستے ہوئے کہا۔

”مجھے تو جب یقین ہو گا جب تم باقاعدگی کے ساتھ فرم آنے لگو گے۔“
راحیل نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”تو سچ بھائی جان لیجئے! ایک ناغہ بھی نہ ہو گا میرے لیے اب جلد ہی
اپنے ساتھ والے کمرے میں آفس میں بندوبست کر دیجئے!“

”اگر یہ بات ہے۔۔۔ تو سچ سمجھ لو۔۔۔ تمہارے لیے
آفس بن گیا۔“

”شکریہ بھائی جان!“

”آج مجھے جتنی خوشی ہو رہی ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا۔۔۔“ افتخار احمد
مسرت آمیز لہجہ میں بولے۔

”ایسہ خوشی کی کیا بات ہوئی ہے ڈیڈی!“ سہیل نے شہرت سے۔
ہونٹ بھیچ کر کہا۔

”یہی بات خوشی سے کیا کم ہے کہ تمہیں بھی اپنی دوسری بڑا احساس ہو
گیا ہے۔ پھر وہ دیر لے کے۔۔۔ اس کے علاوہ آج سے ہوائی ٹیلی فون مل
نے پر وہی مالک، کچھ آرڈرز کے لیے کام شروع کر دیا ہے جس میں کافی منافع
کو امید ہے۔“

یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے ڈیڈی — سہیل ادب سے بولا۔
 دست دیکھتے ہو بیٹے! — یہ کہہ کر وہ چائے پینے لگے۔ اتنی ہلکت
 پاکر راحیل اٹھ کھڑا ہوا۔ سہیل نے جلدی سے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔
 چل دیئے بھائی جان! — وہ مسکرایا۔
 تجھے لارڈز میں کچھ کاروباری لوگوں سے ملنا ہے — وہ نرم لہجے میں
 بولا۔

جائے بیٹے! — افتخار احمد نے اسے اجازت دے دی۔ جاتے
 سے پہلے اس نے شاہدہ کی طرف پیار سے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں بے بہا۔
 محبت گردش لے رہی تھی۔
 سہیل! — بھئی ہماری شاہدہ کو گھملا لایا کرو — اس نے
 سہیل سے کہا۔
 کیوں نہیں بھائی جان! میں اسی کا تو ملازم ہوں — وہ شرارت
 سے بولا۔

ارے بھئی کس کے ملازم ہو گئے آپ! — ارشاد بے کمرے میں
 داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اُسے دیکھ کر افتخار احمد کے چہرے پر حیرت کے آثار
 پیدا ہو گئے۔

سچر آگیا — وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے۔
 ان کی بڑبڑاہٹ کو سب نے سن لیا۔ سب نے چہروں کے رنگ بدلے
 گئے۔ نگہیں رنگ عارضی تھا۔

بیٹہ، رشہ کمرے کیوں ہو! — راحیل نے خوشگوار لہجے میں کہا۔
 گھر میں سوائے افتخار احمد کے اسے سب اچھا جانتے تھے اور اس سے بھاڑیلا

جیسی محبت کرتے تھے۔

”شکریہ بھائی جان! — ارشد کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ارم چائے بنا کر ارشد کو دو —“ راحیل نے ارم سے کہا۔ ارم نے فوراً قبیل
کی اور بجائے بجائے انداز میں چائے بنائے لگی۔ وہ ارشد کو دیکھ کر سرخ ہو گئی تھی
اور گہری شرم دھیا اس پر مسلط تھی۔

”بھائی جان میں تو چائے پی کر ہی آیا تھا۔“ ارشد نے قدرے تکلف

سے کام لیا۔

”کوئی بات نہیں۔ ایک بار پھر پی لو —“ راحیل نے اصرار کیا۔ اور وہ

خاموش ہو گیا۔

اسی لمحہ رشیدہ بیگم اپنی زوجہاں حسین جمیل بیٹی فاطمہ کو لیے ہوئے آئیں
فاخرہ نے ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا۔ اس کے گندمی رنگ پر یہ میک اپ بڑی
بہار دے رہا تھا۔ آسانی دہشی ساڑی میں وہ کافی نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔
اس کا قد سرو کی طرح تھا۔ اور آنکھوں میں ستاروں کی جگہ ٹکائٹ تھی جسم بھر ابھر اور
سٹادل تھا۔ اور اس کے انگ انگ میں ہلکی مستی تھی۔

”خالہ جان! اور فخرہ! — ارم سب سے پہلے بولی۔

”سب کی نگاہوں نے گیلری میں جھانکا اور چہرے کھل گئے۔ آنکھوں میں

انپائیت لہریں لینے لگی۔ مگر افتخار احمد کبیدہ خاطر نظر آنے لگے۔

”ارشد نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر نظریں نیچی کر لیں۔

”اوہ! انہیں بھی اسی وقت آنا تھا۔“ وہ جھلکا کر بولے۔

راحیل، سہیل اور ارم اپنے ڈیزمی کے ایسے جملوں کے عادی ہو گئے تھے

انہیں اس بارے میں ان سے شدید اختلاف نہ رہتا تھا۔ وہ تینوں اپنے رشتہ داروں کی

بڑی آنکھ لگاتے تھے اور رشیدہ بیگم سے توفہ اپنی ماں جیسا محبت و سلوک کرتے تھے۔ اور ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔

وہ سب جلدی سے باہر نکل آئے۔

”خالہ جان! سلام!“

”خالہ جان! آداب عرض!“

سیب نے باری باری رشیدہ بیگم کو سلام کیا اور رشیدہ بیگم نے انہیں پر شفقت انداز میں دعائیں دیں۔

”اُٹھ آداب! — خاترہ لے بڑی پر محبت آداز میں افتخار احمد کو سلام

کیا۔

انہوں نے پوری رعزت کے ساتھ گردن ہلا کر سلام کا جواب دیا۔
”جیسے ہوا اختیار بھائی! — رشیدہ بیگم نے افتخار احمد کی خیریت دریافت

کی

تنبیہک ہوں — ان کا لہجہ سخت اور آگنا رہتا۔ جیسے سب نے محسوس

کیا۔

رشیدہ بیگم اُنھیں سی گئیں۔ — مگر پھر انہوں نے اپنے چہرے کے تاثرات
بڑی تعلیمی سے بدل ڈالے۔ اور بچوں کی دین محبت سے دیکھا افتخار احمد اپنے
گھر سے میں چلے گئے اور وہ سب ڈراما گاہ روم میں آئے۔ چائے کے دو چار..
گہمت اُٹارنے کے بعد ارشد بھی جدید طرز پر آراستہ ڈراما گاہ روم میں آگیا۔
خالہ جان بڑے دلہن نے بعد ادمہ کار راستہ یاد آیا ہے — راحیل
نے ٹہری اپنی نیت کا اظہار کیا۔

”کیا کروں بیٹے گھر سے نکلا ہی نہیں جاتا — رشیدہ بیگم نے مشفقانہ

انداز میں کہا۔ — گھر کے کام کا تاج فرصت ہی نہیں لینے دیتے۔

”رشتیدہ بیگم ادھر بیٹری عورت تھیں۔ ان کا خاوند نذر صہ ہوا فوت ہو چکا تھا۔ ان کی صرف ایک ہی لڑکی تھی۔ مرلے والا اپنی عقلمندی سے اتنا پس انداز کر گیا تھا۔ جس سے ماں بیٹی کو اپنے اخراجات کے لیے پریشان نہ ہونا پڑتا تھا۔ اتنی جائیداد تھی جس کے کرایہ سے ان کی گزر بسر بہ آسانی ہو جاتی تھی۔

فاخرہ بی بی اے کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اعلیٰ کلاس میں ریڈی ڈیمن سمجھی جاتی تھی۔ اسے اپنی ہم جماعت لڑکیوں میں کافی مقبولیت حاصل تھی۔ اس کی موجودگی کے بغیر لڑکیوں کی محفلیں سونی سونی رہتی تھیں۔ وہ ڈی بیئر بھی بہت اچھی تھی۔ اس کا کالج پچھلی ڈی سیٹ میں اسی کی وجہ سے فرسٹ کیا تھا۔

رشتیدہ بیگم کا حسن جو کسی زمانے میں مثالی ہوکا۔ اب ڈھلتی پر چھائیں بن کر رہ گیا تھا۔ اس پر چھائیں کے خط و خال اب بھی اپنے حسین ماضی کا فضا نہ سناتے ہوئے معلوم ہونے لگتے تھے۔ ان کی گہری بڑی بڑی آنکھیں اپنی کشش کی لہانی سناٹی نظرات کی تھیں بڑی زیادتی کی وجہ سے گو ان کا سفید رنگ ماند پڑ گیا تھا۔ تاہم ان کی چمک اب بھی تانے کی طرح دکھتی تھی۔ ایک دو جھریاں لبوں کے قریب آگئی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کا چہرہ صاف تھا۔

فاخرہ اور ارم ایک طرف صوفوں پر بیٹھی آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ ارم، فاخرہ، کے کالج میں ہی پڑھتی تھی۔ اس لیے ان کا آپس میں کافی میل جول تھا۔ ان کی رفاقت دوستی کی سرحدوں تک پہنچ گئی تھی۔

”یا جی! — یہ کیا کھڑکھڑ ہو رہی ہے، —“ شاہدہ نے ناک سکیڑ کر کہا۔ محفل میں باتیں اس طرح — کرنا چاہیں۔ کہ سب سنیں۔
 تو چپکی بیٹھی رہ شاہدہ — ہر وقت کی شرارت مجھے ایک آنکھ

نہیں بجاتی۔

ارم نے سنجیدگی سے اسے ڈانٹا۔

شاہدہ کو پھر کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

”اے بھی بٹا ہونے ٹھیکہ ہی کہلے اس راز دنیا کے لیے کوئی اور وقت اسٹا

رکھیے۔“

سہیل نے منہ بھرتی ہوئی شاہدہ کی حمایت کی۔ اس حمایت پر شاہدہ کا چہرہ ایک دم کھل اٹھا۔ ارم اور فاخرہ غم سے سرخ ہو گئیں۔

فاخرہ نے شرمیلی شرمیلی اور گہری گہری نظروں سے دلبرانہ انداز میں سہیل کی طرف دیکھا مگر اس نے ان نظروں سے کوئی تاثر نہ لیا۔ وہ جانتا تھا کہ فاخرہ اس کی ذات سے دلچسپی رکھتی ہے۔ اس کی نظروں میں اس کے لیے ایک پیغام ہوتا۔ ایسا پیغام ہے ہر جوان دل اور ہر جوان نظر جو نبی سمجھ سکتی ہے۔ اس کی نظریں اسے پہلے کی پہلی لڑکی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ ان کی جھلک اس سے نئی راہیں دکھاتی ہوئی صوفیانی کرتی تھی۔ مگر سہیل نے کبھی ادھر توجہ نہیں کی تھی۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے ان جذبوں کا کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا۔

سہیل نے اپنے دل میں پیچھے ہوئے جذبات کو کئی بار مٹوا دیا تھا مگر فاخرہ کے لیے اسے ہر وقت نفی ہی میں جواب ملا تھا۔ وہ فاخرہ کو اپنا آئینہ نہ بنا سکا تھا۔ اپنی تمناؤں کا سہیل نہ سمجھ سکا تھا۔ یہ اور بات ہے فاخرہ اسے اپنا سب کچھ مان چکی تھی اس نے اس کی شخصیت کو اپنے من مند کا دیوتا بنا لیا تھا۔ اور دیوتا تھا کہ اس سے دور بکا دور رہنا تھا۔ دیوتا نے کسی اور داسی سے ملاحظہ جوڑ لیا تھا۔

وہ داسی کون تھی؟

داسی جو بڑی کھنڈر اور بے پردہ تھی جس نے ابھی تک دیوتا کی طرف توجہ بھی

نہیں کی تھی۔ اس کے چرتوں میں سچول تک نہ پھینکے تھے۔ جو دیوتا سے دور رہ رہا تھی
تھی!

ادبیہ داسی تھی شبیلہ۔

شبیلہ جیج بہل کی لاہر داہ زندگی میں آئی تھی۔ اس نے اس کے وجود کو بہار کا
ایک پیغام سمجھا تھا۔ ایک دلناز فتنہ جانا تھا۔ ادب وہ لاابالی سانو جوان ہر دم اسے
پالنے کی جدوجہد ہی میں لگا رہتا تھا۔ وہ تو حسن اتفاق تھا کہ وہ فم گیا اور اس کی ملاقات
شبیلہ سے ہو گئی ورنہ اسے ابھی کتنے اردن دیوانگی اور میگا نگی کی حالت میں گزارنے
پڑتے ان حالات میں ناخروہ کے لیے کسی گنجائش یا توجہ کا امکان بالکل ہی ختم ہو
چکا تھا۔

ناخروہ نے کہتے ہی دن سے سہیل کو نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ اپنی ای کو ارم
سے ملے کا ہانڈ کر کے یہاں لے آئی تھی۔ اور ارم کی باتوں کی آڑ لے کر چوری چوری سہیل کو
دیکھ رہی تھی۔ سہیل ان نظروں کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔

لیکھ ارا حیل دردانے کی طرف بڑھا۔

کھر چلے بیٹے۔ رشیدہ بیگم نے اسے محبت سے پکارا

۔ خالہ جان! مجھے ایک منہ دی نام ہے۔ جلد ہی آجاؤں گا۔ امید ہے رات
کے کھانے پر آپ سے ملاقات ہوگی۔ یہ کہہ کر وہ دردانے سے باہر نکل گیا
اس کے جانے کے چند لمحوں بعد ہی سہیل بھی اٹھ گیا۔

آپ بھی چلے۔ یہ تو بری بات ہے ہاں آپ کے گھر آئیں اور آپ
چلے جائیں۔ ارشد نے ہنس کے مزاحیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔
آپ کی غیر حاضری سے ہالوں کے دل ٹوٹنے کا خطرہ ہے۔

ناخروہ اس جوت سے شراگئی ارم کے سونوار پر دینی دینی مسکراہٹ سہیل گئی

اور سہیل چھینپ گیا۔

”بھئی! — بہانوں کے پاس ارم جو ہے اور پھر ہمارا بھائی ارشد گلام بھی — سہیل خفت ہو کر بولا۔

”نا بھائی جان! — آپ کے مقابلے میں ہماری گفلامی نہیں چلے گی۔“
ارشد برابر مذاق کے جارہا تھا۔

”ہیل! — بار پھر خفیف ہونا۔ — ندامت کا حسین رنگ اس کے چہرے پر بکھر گیا۔ — ناخوہ تو شرم سے کشتی چلی جارہی تھی۔ ارم اس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اور اس کی دبی دبی مسکراہٹ ہر لمحہ ابھر رہی تھی۔ ارشد تم بھی ایک ہی حضرت ہو! — سہیل بے دلی سے دوبارہ صوف پر بیٹھ گیا۔

”ارشد بیٹے! جانے دو اسے! کسی کام سے جا رہا ہوگا۔ —“ رشیدہ ٹکیم نے پر محنت آواز میں کہا۔

”خالیہ جان انھیں کیا کام ہو سکتا ہے اس وقت —“ پھر وہ دانستہ چہرہ نیا کر بولا — ”گلام ہو بھی تو بہانوں کے لیے اسے التواء میں ڈالا جاسکتا ہے۔“

”جائے دیجئے ارشد بھائی! کوئی اپنی مرضی سے نہ بیٹھا چاہے۔ تو اسے مجبور نہیں کیا کرتے۔ —“ ناخوہ نے انصرودہ سا چہرہ نیا کر پہلی بار لب کشائی کی ہزاروں مایوسیوں اس کے بھروسے سمٹ آئی تھیں۔ جسے سب ہی نے غور سے دیکھا۔

”دیکھو بھئی! اب تو بہانوں کی طرف سے کئی اجازت مل گئی ہے۔ اب تو جا سکتا ہوں نا —“ سہیل نے انتہائی ڈھٹائی سے کہا۔

ناخزہ کا چہرہ تاریک تر ہو گیا۔ سہیل نے ایک نظر ناخزہ کو دیکھا۔ اس کی بدلتی ہوئی رنگت کو محسوس کیا۔ منگراس کا دل نہ بے چین ہوا نہ اس نے کوئی تاثر لیا۔ وہ عجیب سی مسکراہٹ لبوں پر لیے باہر نکل آیا۔ اور گاڑی میں بیٹھ کر مال کی طرف چل دیا۔ اس نے یوں ہی بے دعا مال کے دو چکر لگائے اور پھر خیزان میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ سوچوں میں ڈوب گیا۔ اس کے ذہن کی دیواروں سے دو نام نکلنے لگے۔

ناخزہ !
شبیلہ !

دونوں نام اس سے اٹھکیاں کرنے لگے۔ بے چین کرنے لگے۔ آخر شبیلہ کا نام اس تصادم میں ابھر آیا۔ نمایاں ہو گیا اور ذہن پر چھا گیا۔

ناخزہ اس کے ذہن سے بالکل نکل گئی۔ شبیلہ پوری رعنائیوں اور جلوہ آرائیوں کے ساتھ اس کی نگاہوں کے سامنے مسکرانے لگی۔ اب ذہن کی دیواروں سے دونوں کا ٹکراؤ ختم ہو چکا تھا۔ وہ شبیلہ نام کی دلفریبی میں کھو گیا۔ شبیلہ اس کے دل کے کتنا قریب ہو چکی تھی۔ کیا وہ بھی شبیلہ کے دل کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا وہ خود تو ایک ہی ملاقات میں اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے پیالوں میں کھو گیا تھا۔ اس کے دلفریب خیالوں میں گم رہنے لگا تھا۔ اس کی ایک مسکراہٹ پر اپنا سب کچھ نچا کر کرنے کی سوچنے لگا تھا۔ اس کی ذہن کے گرد خیالوں کی ریشمی سرسراہٹ محیط ہوئی جی گئی۔ اسے بے خود بنا رہی تھی۔ نہ ہوش سا کر رہی تھی۔

دفعاً اسے احساس ہوا۔ جیسے اس کے سامنے کوئی کھڑا ہے۔ اس نے چہرہ اٹھا کر غور سے سامنے دیکھا تو اسے اپنے اس خیال پر شرمندہ ہونا پڑا کہ اس کے سامنے اس کا عزیز دوست راستہ کھڑا ہے۔ جو مسکراتا ہوا اس کی محبت کو رشتہ

انداز میں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہوئے اس کی نظریں سہیل پر پڑی تھیں۔ اس سے اسے ایک گونہ راحت کا احساس ہوا تھا۔ سہیل اسے کئی۔
 دنوں کے بعد ملا تھا۔ اسی لیے وہ سیدھا اسی کی طرف چلا آیا تھا۔
 ”راشد۔۔۔ سہیل کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”اچھی طرح دیکھ لو۔ کوئی اور نہ ہو۔۔۔ پھر اس نے توجہ لگایا۔
 ”اتنی گہری محویت؟۔۔۔ خیر تو ہے؟“

سہیل نے ایک لپٹیمان مسکراہٹ ہونٹوں پر کھیری۔
 ”آؤ بیٹھو!۔۔۔ پھر اس نے ندامت کو مٹا کر کہا۔۔۔ تمہیں اس
 وقت اپنے سامنے پا کر مجھے بے حد مسرت ہوئی ہے۔“

”میرے خیال میں تو عاک مسرت نہیں ہوئی۔۔۔ چہرہ تو یہی بنا۔
 رہا ہے۔۔۔ اس نے مذاق کیا۔۔۔ میں تو سمجھتا ہوں۔ میں نے
 تمہارے سامنے آکر سخت حماقت کی ہے۔ تمہارے تصوراتی نظام کو درہم
 برہم کر دیا ہے۔“

”اچھا ہوا یہ نظام درہم برہم ہو گیا۔۔۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”ورنہ جانے کب تک یو نہیں بیٹھا رہتا؟“
 ”مگر یو نہیں بیٹھنے کی آخر کوئی وجہ بھی تو ہو؟!۔۔۔ راشد نے
 اس کے دل کو کریدا۔

”وجہ یہیں نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔۔۔ وجہ کیا ہو
 سکتی ہے!!۔۔۔“

”الٹان بغیر کسی وجہ کے اتنی محویت میں غم نہیں ہو سکتا۔۔۔ اس
 نے ابھر ادھر میزوں پر نظریں دوڑائیں اور پھر جب کہ حسین ترین چہرے

ہوٹل میں موجود ہوں :

حسین چہرے ! — اس نے انسر دگی سے کہا — حسین
چہروں کے چمکے اگر حسین دل ہوں تو واقعی انسان ان سے بیزار ہو کر اپنے
خیالوں میں گم نہیں ہو سکتا :

” مگر حسین چہروں کے پیچھے حسین دلوں کی پہچان کیا ہے ؟ — “
راشد نے اسے غور سے دیکھا :

” نقورات میں گم ہونا — سہیل نے تہقہہ لگایا :
” نقورات میں بھی تو انسان اس وقت گم ہو سکتا ہے جب ان حسین چہروں
سے دیدہ خوبصورت چہرہ خیالوں میں اتر آیا ہو — “ راشد نے اسے معنی
غیر انداز میں ٹھکرا دیا :

” وہ خاموش رہا — اس نے کوئی جواب نہ دیا — بس
راشد کے چہرے کو گہری نظروں سے دیکھتا رہا :

” تو اس کا مطلب ہے — میں نے سچ ہی کہا ہے — ہمارے
بے پرواہ دوست کو بھی کسی نے جیت لیا ہے — “ اس نے سہیل کی
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا :

” کسی نے جیتا نہیں — تمہارا دوست خود ہی مار گیا ہے —
سہیل کا اہجہ مغموم تھا :

” بہت ہی گہری جوش کھائی ہے — وہ ستھوڑا سا آگے جھکا
” کس کے سامنے مار گئے — کون خوش نصیب ہے وہ — “
” اگر وہ خود کو خوش نصیب سمجھتا تو — “ اس کا لہجہ اتنا سستھا —
” وہ تو مجھ سے بے تکلفی سے بات بھی نہیں کرتی : “

”کیسے عاصیہ میں معلوم ہوتا ہے۔“
 ”بہت بری طرح الجھ گیا ہوں راشد! —“ وہ بے چینی سے بولا۔
 ”اسی لیے اتنے دن ملاقات نہ ہو سکی۔“
 ”یہی سمجھ لو۔“

”آخر کچھ پتہ بھی تو چلے، تمہارے ساتھ ہوا کیا —“ اس نے محبت
 بھرے لہجے میں پوچھا۔
 ”میں نے راشد کے لہجے سے متاثر ہو کر شبیلہ سے اپنی ملاقات کا تمام
 قصہ بیان کر دیا۔ راشد غور سے سنتا رہا۔“
 ”گہراؤ نہیں —“ انتہا خوشگوار ہو گئی — ”یہ کہہ کر اس نے
 جائے کار وُرد دیا۔“

”سمجھ میں نہیں آتا — یہ تم ہر روز کہاں جاتی ہو بیٹی —“ رابعہ بیگم نے شبیلہ کو ناشتے کے بعد باہر جانے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔
 ”ماں بیٹی! تم آخر تمام دن کہاں غائب رہتی ہو؟ —“ ارشاد احمد بھی تشویش ناک لہجے میں کہا۔

”ابا جان! تمام دن کہاں غائب رہتی ہوں — چار بجے تو آ جاتی ہوں۔“
 اس نے بظاہر ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر کہا — ”مگر اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ خدشات اس کے ذہن میں سر اٹھانے لگے تھے۔ اسے خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں اس کی نوکری کا بھید نہ کھل جائے۔“

”ابا جان ایک سہیلی کے پاس جاتی ہوں — اس نے فوراً ہی ایک بہانہ تراش لیا۔ وہ ہوسٹل میں رہتی ہے۔ اچانک بڑی سحت بیمار ہو گئی ہے۔ اس کے پاس کوئی نہیں ہے۔ اس لیے اس کی تیمارداری کرتی ہوں۔“

”تو سچرا سے اپنے گھر لے آؤ بیٹی! —“ اس کی ماں اس کی بات پر یقین کر کے ہمدردی سے بولی۔

”میں نے تو اس سے کئی مرتبہ کہا ہے امی جان! — مگر وہ مانتی ہی نہیں وہ جلدی سے بولی۔“

”اس کے گھر والے ابھی تک اس کے پاس نہیں پہنچے — ارشاد احمد مشکوک انداز میں بولے۔“

”اس کی ایک بڑی بہن کے سوا اور کوئی نہیں ہے اباجان! — وہ اسکول میں ہیڈ مسٹریس ہے — — — آئی تھی دو روزہ کر چلی گئی ہے — پر غلوں غدت ہے بے چاری — — — میرا بڑے اچھے الفاظ میں شکریہ ادا کر کے گئی ہے — اس نے بہانہ کو پر اثر بنانے میں بڑی شاندار اداکاری کی۔“

”تم جازا بیٹی! — اس کے والد افسردہ لہجہ میں بولے —
”زمانہ خراب ہے میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہیں ٹھوکر نہ کھا بیٹھو! —
”میں دیکھ کر حلتی ہوں اباجان! — اس نے پر عزم لہجے میں کہا۔
”دیکھ کر چلنے والے بھی ٹھوکر کھاتے ہیں بیٹی! —“ وہ گہری آواز میں بولے۔

”میں آپ کی بیٹی ہوں! اباجان — اس کا لہجہ مستحکم تھا — اور
آپ کی بیٹی لا کوئی قدم غلط نہیں اٹھے گا — آپ مطمئن رہیں؟
”میں تو مطمئن ہی ہوں بیٹی! —“ پھر وہ اسے غور سے دیکھ کر بولے۔
”زمانے کو مطمئن رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے؟“

”آپ بے فکر رہیں — میری طرف سے زلزلے کو کبھی انگلیاں اٹھانے کا موقعہ نہیں ملے گا — وہ ایک اطمینان سے بولی — اس کی باتوں سے
اس کے والدین کو اطمینان ہو گیا۔

اس نے پرس اٹھایا اور باہر نکل گئی۔

سڑک پر آکر اس نے بس چڑی اور فرم آگئی۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اس نے پرس مینز پر نگہ دیا۔ اس کے آتے ہی ڈاک آتی شروع ہو گئی۔

اس کے علاوہ بھی تین لڑکیاں اور اس فرم میں کام کرتی تھیں۔ ان میں دو کرسمین لڑکیاں تھیں۔ وہ دونوں اسٹینو گرافر تھیں۔ تیسری لڑکی کلرک تھی۔ چیمز لڑکیاں بشیلہ سے شکل مل نہ سکی تھیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی۔ وہ خود ہی ان سے دور دور رہتی تھی۔ اس نے کبھی ان سے قریب ہونے کی کوشش نہ کی تھی۔ کبھی اشد ضرورت سے ہی ان سے ہم کلام ہوتی تھی۔ نہیں تو وہ بے مقصد بات نہ کرتی تھی۔ وہ تینوں اس کے اس رویے سے جلن سی محسوس کرنے لگی تھیں اس وقت سے تو وہ اپنے دل میں اور بھی حسد محسوس کرنے لگی تھیں۔ جب سے انہوں نے باس کی نظروں میں اس کے لیے ہمدردی محسوس کی تھی۔ اب لڑکیوں کا تمام کام دیبا باس سے سمجھتی تھی۔ اور آکر انہیں سمجھاتی تھی۔ اس سے اس کی حیثیت دفتر میں نمایاں ہو گئی تھی۔ دفتری عملہ اس سے خار کھلنے لگا تھا۔ بشیلہ نے بھی کسی سے بات کو نا ضروری نہ سمجھا تھا۔ اس لیے سب اس سے چڑنے لگے تھے۔ اس کے برعکس تینوں لڑکیاں عملے سے بے تکلفی سے باتیں کرتی تھیں۔

جب وہ خطوط ڈپٹی کرچی تو ان میں سے دو خطا منتخب کر کے وہ باس کے کمرے میں گئی۔ تدویں کی آہٹ سن کر سہیل نے نظریں اٹھائیں۔ آج پھر وہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ساحل کسی کاروباری مصروفیت سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اسے جبکہ کمرہ ایک دم سنبیدہ ہو گئی۔ وہ جھپکتی جھپکتی آگے بڑھی۔

آئیے بکٹر لین لایے! — اس نے انتہائی اخلاق سے کہا
وہ آگے بڑھی اور اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں

اور چہرہ متانت لیے ہوئے تھا۔ گہری متانت، جیسی راہبہ عورت کے چہرے پر
دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ اس کا چہرہ دیکھ کر شندردہ گیا۔

”بیٹھے! — آپ کھڑی ہیں۔“

وہ بغیر کسی تاثر کے بیٹھ گئی۔

”فرمائیے: وہ نرم لہجے میں بولا۔

اس نے دو خط اس کی طرف بڑھا دیئے!

یہ دو ضرور کا خط ہیں۔ ان کا جواب لکھا دیجئے — وہ خنک سے

لہجے میں بولی۔

اس نے وہ خط لے لیے اور انھیں میز پر پڑے ہوئے شیٹے پر رکھ دیا۔

اور اس کے چہرے کی طرف گہری نظر سے دیکھنے لگا۔ شبیلہ کی نظریں جھکی ہوئی

تھیں لیکن وہ اس کے نگاہوں کے لمس کو محسوس کر رہی تھی — وہ کسمپاسی۔

”کام شروع کیجئے —“ وہ مضطرب ہو کر بولی۔

”آپ کو چند لمحے یہی بیٹھنا گوارا نہیں، —“ اس نے اپنے لہجے کو پر

سوز بنا کر کہا۔ — ”جانتا ہوں — میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔“

لیکن کیا آپ مجھے معاف نہیں کر سکتیں — ”سہیل کا لہجہ اندر دہ تھا۔

شبیلہ نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ مگر اس نے کچھ

کہا نہیں۔

اب آپ میری بات کا جواب بھی دینا نہیں چاہتیں — اس کی آواز

ریخ و غم میں ڈوب گئی تھی — کیا بارش میں بھیگی ہوئی ملاقات کا یہی نتیجہ ہے

کہ آپ یوں مجھے سخت برہم ہو جائیں گی؟

”آپ بار بار اس رات کا تذکرہ نہ کیا کیجئے — اسے اتفاق سمجھ کر

بھلا دیجئے ! — اس نے لائقیتی سے کہا — ”زندگی میں ایسے حادثے ہوتے
ہی رہتے ہیں :

”زندگی بے شک حادثات کا مجموعہ ہے۔ — لیکن بعض حادثے ایسے بھی
ہوتے ہیں جنہیں زندگی کے کسی مرحلے پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ — آپ
اس حادثے کو بھلا دیں۔ تو بھلا دیں۔ یہ بات کم از کم میرے بس کی تو نہیں ہے۔ اس
نے بڑی خوبی سے دل کی بات سمجھ ڈالی۔

”شبیلہ بے چین ہو گئی۔ اور اضطراب انگیز کلمندی محسوس کرنے لگی۔
”پلیز! خدا کے لیے اس ذکر کو جانے دو۔ — وہ انتہائی افسردہ آواز
میں بولی۔

”تو پھر آپ مجھے معاف کر دیجئے ! — وہ در دہری آواز میں بولا۔
”بے شک مجھ سے تصور ہوا ہے — آپ کا دل دکھایا ہے۔ لیکن یقین
کیجئے — وہ مذاق تھا۔ بعض مذاق — جس کے لیے میں بہت ہشیمان
ہوں :

”میں نے آپ سے کسی قسم کی شکایت تو نہیں کی — وہ سنجیدگی سے
بولی۔

”لیکن بے رخی سے بڑی سزا اور کیا ہو سکتی ہے۔
”میری بے رخی سے آپ کو کیا فرق پڑ سکتا ہے — شبیلہ افسردہ
لہجے میں بولی۔

”فرق — آپ کیا جانیں — آپ کی بے رخی سے میرے دل
کو کتنی تکلیف پہنچتی ہے — اس کا لہجہ پر صومڑ تھا۔

”میں آپ سے آنسو کی ملازمہ ہوں اور غلام ہوں۔ سے۔ پتہ نہیں کہ کتنا

کچھ کہہ سکتا ہے۔ اس نے بڑے پرسوز انداز میں یہ الفاظ کہے۔ وہ لہجوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ ابھی رو پڑے گی۔ اس نے اپنے اس جذبے پر بے حد حیرت تھی کہ آنوا سے ہوا کیا ہے۔

سوسل اس کی آواز سے بے چین ہو گیا۔ — تڑپ سا گیا۔ اس کدھل میں شبیلہ کے لیے ہمدردی کا سمندر ٹھٹھٹھ مارنے لگا۔

• شبیلہ! — اس کی آواز شدت جذبات سے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔
• میں جانتا ہوں آپ کو یہ ملازمت مجبوراً کرنی پڑتی ہے۔ مجبوری انسان سے۔
• سب کچھ کراہتی ہے اگر آپ کے والد بیمار نہ ہوتے تو شاید آج آپ یہاں نہ پہنچتی۔
• شاید! — اس نے سر دھلیجے میں کہا۔

اس کے سر دھلیجے سے اس کا چہرہ اور اندھیرے میں ڈوب گیا۔ تھوڑی دیر ہی کے درمیان خاموشی کا پر دا حائل رہا۔ پھر اس کے لب بولے۔

• یہ آپ کی سرد دھری مجھے مار ڈالے گی۔ — اس کے لب بولے میں حد کی سختی
• اٹھرائی تھی۔ — میں آپ کا بے رحمانہ سلوک برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ کے
• لب بولے سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ مجھ سے بے حد ناراض ہیں۔ — وہ بے حد جذباتی
• ہو گیا۔

• جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گی۔ — میں بھی خود کو معاف نہیں
• کر سکتا۔

• کوشش کروں گی۔ آپ کو مجھ سے بے رخی کی شکایت نہ رہے۔ — اس
• کی آواز کا تناؤ ختم ہو گیا۔ — رہی معافی — کیسی معافی — آپ نے
• میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ہے جس کی معافی کا سوال ہو۔ آپ اس سے
• ہی اندازہ کر لیں کہ میں تو کوی چھوڑ کر نہیں گئی ہوں۔ — میرے دل میں آپ

کی طرف سے کوئی ناراضگی نہیں ہے۔

”اوہ! ——— شکریہ! ———“ وہ مسرت سے لڑتے ہوئے آہستہ سے بولا ——— اسے یوں لگا جیسے وہ اندھیروں سے نکل کر روشنیوں میں آگیا ہو۔
خناں نے بہاؤ کا فہم الاینا شروع کر دیا۔ سچو لوں کی نکہت تیزی سے اس کے ارمانوں کے گلستان میں پھیل گئی۔ سہیل کے برعکس شبیلہ کے جذبات پرسکون تھے اس نے اپنے دل میں کسی طرح کی پھل محسوس نہ کی تھی۔ کسی نئی کیفیت کا احساس تک اس کے چہرے سے نہیں ہوا۔ اس نے کسی ابتلائے جذبے کو قبول ہی کیا تھا۔ ہاں اسے اپنے دل میں ایسی ہی ایک بے نام محک کا احساس ضرور ہوا تھا۔ مگر اس احساس کو سبھی اس نے جلد ہی دبا دیا تھا۔ مگرے میں سکوت پھیل رہا تھا۔ جو ہر دم گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ دفعتاً اس کی گہرائی کو راحیل کے قدموں کی آہٹ نے پاٹ دیا۔ دونوں نے چونک کر لہر دیکھا۔ راحیل مسکراتا ہوا آ رہا تھا۔ سہیل شہر بڑا کر کھڑا ہو گیا۔

”اُگئے بھائی جان! ———“ وہ مرتش ہوئے بولا۔ ——— شبیلہ سبھی راحیل کو دیکھ کر سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”کیوں ——— کیا بات ہے! ———“ اس نے میز کے قریب آ کر کہا۔

”یہ دو خط ہیں۔ ان کے جواب لکھانے ہیں۔ وہ کسی سے اٹھ کر

بولا۔ ——— میں چلا۔ ———“ پھر اس نے سہیل پر ایک نظر شبیلہ پر ڈالی۔ اور اس کے قدم تیزی سے دروازے کی طرف اٹھنے لگے۔

”سنو تو۔۔۔۔۔“ راحیل نے پیچھے سے پکارا۔

”اب میں کچھ نہیں سن سکتا بھائی جان! ———“ وہ دروازے سے باہر نکلتا

ہوئے بولا۔ ”کل صبح حاضر ہو جاؤں گا۔“ راحیل زیر لب مسکراتے لگا پھر

اس نے فبید کی طرف دیکھا۔ سہیل جا چکا تھا۔
 میرا سہائی بہت شرم ہے — آپ کو تنگ تو نہیں کیا اس نے؟
 وہ سر جھٹکا کر بولا۔

وہ ایک دم بوکھلا گئی۔
 ”جی! مجھے! نہیں تو! — پھر وہ بلدی سے بولی: ”ٹینٹے پر یہ خطو طپ ہے
 یہ، انیسویں دیکھ لیجئے۔“
 ”اوک! اوک! اچھا! —“ رحیل نے خط اسٹاکر پڑھنے شروع کر دیے۔

جونہی اس نے گھر کے دروازے پر قدم رکھا، اُسے فضا کچھ بدلی بدلی سی محسوس ہوئی۔ وہ کچھ حیران سی ہو گئی۔ اس کے قدم تیزی سے اندر کی طرف اٹھنے لگے۔ اس نے گردن کی طرف نگاہیں دوڑائیں۔ اس کے کمرے کا سامان بجلی کے کمرے میں آسپکاستھا۔ دروازے اور کمرے کی کھلی ہوئی تختیں۔ چھت کے پٹکے چل رہے تھے، بجلی اور اس کا کمرہ خالی پر استھا۔

وہ ادھر سے پلٹ کر ارشاد احمد کے کمرے کی طرف چلی پڑی۔ وہ اپنے والد کے بیلنگ کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ غمی احمد اس کی امی کو سن پڑ بیٹھی تھیں۔ سب نے نگاہیں اٹھا کر اسے غور سے دیکھا۔

”اوہ بیٹھو بیٹی! — پھر انہوں نے کہا —“ تمہاری سہیلی نکلیا

حال ہے۔“

وہ کچھ گھبرا سی گئی — مگر پھر اس نے کرسی پر بیٹھ بیٹھ اپنی گھبراہٹ کو

چھایا۔

اس کی صحت تیزی سے بحال ہو رہی ہے ابا جان! — پھر دراد رک کر بولی — آپ کی طبیعت بھی تو آج کافی برکاش دکھائی دیتی ہے۔
خدا کا شکر ہے بیٹی! ٹھیک ہو رہا ہوں — ایک سہیلی سی مسکراہٹ ان کے خشک لہجوں پر پھیل گئی — آج میں خود دوائی لینے ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔

یہ تو بہت ہی خوشی کی خبر ہے ابا جان! — وہ مسرور ہو کر بولی۔
ہاں! آپ! — بہت ہی مسرت انگیز بات ہے! نجی کالج فزٹ آفیر تھا۔ — اب ابا جان جلدی رو بصحت ہو جائیں گے۔
خدا تمہاری زبان مبارک کرے بیٹی — راجو بیگم نے دعا دی۔
کرے میں سکوت پھیل گیا۔

گھر میں کوئی جان آیا ہے کیا؟ — ستوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے سکوت کا پردہ چاک کیا۔

ہاں! آپ! — نجی انکھیں بچی کر کے جلدی سے بولی — ابا جان کے کسی دوست کے لڑکے آئے ہیں۔
ابا جان کے دوست کے لڑکے — شبیلہ کی لگائیں حیرت سے جھلکتے لگیں۔

ابا جان نے اپنے کسی اتنے گہرے دوست کا پہلا تو کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔
نہیں کیا تھا بیٹی — ارشاد احمد ایک گہرا سانس لے کر بولے۔
ماضی کی یادوں کو دفن کر چکا تھا۔ — میں ان خوشگوار لمحوں کی چنگاریوں کو گندے وقت کی راکھ سے کریدنا نہ چاہتا تھا بیٹی! — ان یادوں سے مجھے

اور جب اس کا انتقال ہوا تب مجھے یوں لگا تھا جیسے میں دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں اور میں واقعی تنہا رہ گیا تھا — جب جمال فوت ہوا تو اس کے دونوں بچے چھوٹے چھوٹے تھے :

”دونوں بچے — شبیلہ نے میٹھرا نہ انداز میں کہا۔

”ہاں بیٹی ! ایک قصہ اور دوسری اس کی بہن جو قریب قریب اس سے دو سال چھوٹی ہے —“ پھر انہوں نے رابعہ بیگم کی طرف دیکھا — تمہاری امی اچھی طرح جانتی ہیں انہیں — جمال کی بیگم شبیلہ جو اب بیوگی کے دن گزار رہی ہیں تمہاری امی کی سہیلی رہی ہیں کبھی میرا ہاں میں تبادلہ ہو جانے کی وجہ سے ساتھ چھوٹا ہے ان کا —

”کیوں امی —“ نجی نے پوچھا۔

”تمہارے ابا جان سچ کہہ رہے ہیں بیٹی ! رابعہ بیگم نے ادا اس لہجے میں کہا یہ لوگ رہتے کہاں ہیں امی جان ! —“ نجی نے پر شوق انداز میں

پوچھا۔

”راولپنڈی میں رہتے ہیں بیٹی ! —“ رابعہ بیگم کے جواب دینے سے پہلے ہی ارشاد احمد بول پڑے — ”بہت ہی رئیس لوگ ہیں کردوڑوں کی جائیداد ہے ان کی۔“

”ہوں ! —“ نجی نے پھر کچھ نہیں پوچھا — کمرے کی فضا پر گہری — خاموشی مسلط ہو گئی۔ سب اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ شبیلہ سب سے زیادہ نکر مند دکھائی دے رہی تھی۔ ارشاد احمد نے اس کے چہرے پر نگاہیں جمادیں۔

”کون سے خیالوں میں کھو گئی ہو بیٹی ! —“ اپنے والد کی محبت بھری

آواز پہنچ گئی۔

”سوچ رہی ہوں ابا جان! —“ تصور رئیس زادے ہیں۔ اور ہم لوگ اس وقت سخت ناداری کے دور سے گزر رہے ہیں۔ میزبانی کے فرائض کیسے سرانجام دیئے جائیں گے۔ اس کا بوجھت ہی مفصل تھا۔ —“
آپ کے پیارے دوست کا میا آیا بھی تو کیسے حالات میں —“ وہ کیا سوچے گلال میں —“

”تمہارا کہنا درست ہے بیٹی! —“ صرت دس روپے رہ گئے ہیں۔ گھر میں —“ اور ضرورت کی چیزیں قریب قریب سب ختم ہیں۔ —“ راجہ بیگم تشویش انگیز غم آلود لہجے میں بولیں —“ تمہارے ابا کی بیماری پر بہت رنجیدہ ہوا ہے۔“

”بیماری سچی ایسے ہی گھروں میں آتی ہے جہاں اسے پہننے کی ذرا بھی ہمت نہ ہو۔ —“ ارشاد احمد رنج آلود لہجے میں بولے۔

”آپ کسی قسم کا فکر نہ کیجئے ابا جان! —“ صبح پیسوں کا انتظام ہو جائے گا۔“ شبیلہ نے غم سے بڑا آواز میں کہا۔

”پیسوں کا انتظام ہو جائے گا —“ ارشاد احمد متعجبانہ بولے —“ وہ کیسے بیٹی! —“

”میں اپنی کسی سہیلی سے ادھار لے لوں گی —“ شبیلہ نے آہستہ سے کہا۔

”یہ نہیں ہو سکتا بیٹی —“ ارشاد احمد سختی سے بولے —“ میں نہیں چاہتا تمہیں کسی سہیلی کے سامنے پشیمان ہونا پڑے۔ ہم کوئی زیور بیچ کر گزارہ کر لیں گے۔“

”ہنس ابا جان! — اس نے ایک عزم سے کہا — اے لاکھنؤ زید
 نہیں بکے گا۔ پہلی سے اگر کسی مصیبت کے وقت قرض لے لیا جائے تو اس میں کیا
 برائی ہے۔ ہم اسے جلد لوٹانے کی کوشش کریں گے۔“
 ٹھیک کہتی ہے شبید! — رابعہ نگیم نے تائید کی — ”آپ اب
 جلد ہی بنک جانے لگیں گے، حالات سدھرتے ہی قرضہ لوٹانے کی کوشش
 کریں گے۔“

ارشاد احمد تذبذب میں پڑے ہوئے دکھائی دینے لگے۔
 ”تم جانو بیٹی، ایک بات کا خیال رہے، تمہاری خود داری کو مجروح نہ ہونا
 پڑے۔“

انہوں نے آخر شدید مجبوری کے تحت فیصلہ دے دیا۔ — اس سے
 شبید کو ایک گونا سکون کا احساس ہوا۔ اسے یوں لگا کوئی نہایت بڑا مسئلہ —
 آسانی سے حل ہو گیا ہو۔ ایک صحن میں تدریوں کی آہٹ ہوئی — نگاہوں نے
 گھوم کر باہر دیکھا، ایک خوب رو جوان مسکراتا ہوا کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے
 لبوں پر رقص کرنے والی مسکراہٹ جگمگا رہی تھی۔ آنکھوں میں گہرائی اور ذرات
 کی چمک تھی وہ درمیانے قد کا مردانہ وجاہت کا ایک بہترین شاہکار تھا۔
 وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔

”کہاں چلے گئے تھے تصور بیٹے! — ارشاد احمد نے مسرت
 سے پُر آوازیں کہا۔“

”مجھے دیکھ سے فوری طور پر ملتا تھا اٹکل! — وہ مسکرایا —
 اس لیے آتے ہی چلا گیا تھا۔ میرے خیال سے آپ نے محسوس نہ کیا ہو گا۔
 یہاں ایک زمیندار سے زمین کا ٹھیکڑا مل رہا ہے۔ شاید ایک ہفتہ آپ کو

تکلیف دینی پڑے۔
 ”تکلیف کسی؟“ — ”راہِ بیگم بولیں۔“ — ”تمہیں یہاں رہنے سے
 تو جیسے راحت ہوگی؟“

”شکریہ اُٹھتی! —“ وہ انکساری سے بولا۔ ”میرا خیال تھا۔
 ہوٹل میں ٹھہروں۔ گرامی جان دہی طبیعت کی ہیں کہنے لگیں۔ زمین کا جھکڑا
 ہے۔ ہوٹل میں رہنے سے کہیں دشمن کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں۔
 آپ کا پتہ دے کر کہنے لگیں انکل کے گھر چلے جانا۔“

”تشکیلہ بہن نے ٹھیک ہی سوچا ہے بیٹے! —“ جب گھر موجود ہے
 تو ہوٹل میں ٹھہرنے کی کیا تنگ ہے۔ ”راہِ بیگم نے پر خلوص انداز میں کہا۔
 ”حال کے بیٹے کو اپنے گھر میں دیکھ کر مجھے جتنی خوشی ہوئی بیان نہیں کر سکتا؟
 ارشاد احمد محبت سے بولے۔“

”امی جان نے آپ کے ادراہا جان کے دوستانہ تعلقات کے بہت سے
 واقعات سنائے ہیں جنہیں سن کر میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھنے لگا۔ —“ سوچتا
 تھا کبھی آپ سے ملاقات کروں گا۔ سو اس کا موقع بھی نکل ہی آیا۔“

”تم نے بہت اچھا کیا بیٹا! —“ وہ خوش ہو کر بولے۔ — ”پھر
 انہوں نے تشبیلہ کی طرف اشارہ کیا۔“

”یہ میری بڑی بیٹی تشبیلہ ہے! —“ وہ اس کی طرف دیکھ کر پیار
 سے بولے۔

”چھوٹی بڑی ہے۔ —“ تو تم مل ہی چکے ہو؟

”جی۔ —“ اس نے تشبیلہ کی طرف سے نظریں ہٹا کر عجی کو دیکھا۔
 ”عجی اپنے ذکر پر لگا گئی۔ شرم سے اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ اُسے

وہاں بیٹھا حال ہو گیا وہ جلدی سے اٹھی اور کمرے کا بلب روشن کر دیا۔ کچھ تکہ رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ سر شام آسمان پر چھلنے والے بول جلد ہی تاریکی میں گھٹ لائے تھے۔

”کہاں جا رہی ہو بیٹی۔“ رابعہ بیگم نے پکارا۔
 ”باورچی خانے میں امی جان!۔“ رات کا کھانا جلد تیار ہو جائے تو بہتر ہے۔ یہ کہہ کر وہ ہونٹوں میں دہنی دہنی مسکراہٹ لیے باہر نکل گئی۔
 ”جی! دوسرے کمروں کے بلب بھی روشن کر دیے ادبا درچی خانے میں آگئی۔
 وہ جلد جلد رات کا کھانا تیار کرنے لگی۔
 ”جب میں آیا تھا تو آپ کہیں گئی ہوئی تھیں شاید!۔“ نقور نے شبیلہ سے بات کرنا چاہی۔

”جی!۔“ شبیلہ نے نگاہیں جھکا کر مختصر سا جواب دیا۔
 ”ایک بیمار سہیلی کی تیمارداری کو گئی ہوئی تھی۔“ رابعہ بیگم بولیں۔
 ”آپ تعلیم حاصل کر رہی ہیں یا چھوڑ دی۔“ نقور نے پر اخلاق لہجے میں پوچھا۔

”جی چھوڑ دی!۔“ وہ پھر مختصر آہولی۔
 ”کیوں چھوڑ دی۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔
 ”یوں ہی!۔“ شبیلہ نے آہستہ سے کہا۔ ”میں کچھ اکتاہٹ محسوس کرنے لگی تھی۔“

”یہ بات نہیں بیٹے!۔“ ارشاد احمد لہلے۔ ”میں شدید بیمار ہو گیا تھا۔ اس لیے اس سال داخلہ نہ لے سکی۔ آئندہ سال بی۔ اے میں ضرور داخلہ لے گی۔“

خوب! — وہ مسکرایا — ”دیکھئے تعلیم سے اکتانا اچھی بات

نہیں ہے۔“

وہ سنجیدگی سے فرش پر دیکھنے لگی اور سوچنے لگی لقور کو باتیں کرے گا سلیقہ خوب آتا ہے۔ اسے اس کی گفتگو کے انداز کا قائل ہونا پڑا۔ — وہ اجنبی لوگوں کے ساتھ بے تکلف ہونے کا کر جانتا ہے۔ وہ سمجھ گئی اسے ایک ہفتہ پہلا رہا تھا۔ اسی لیے حجاب کے پردے چاک کرنا چاہتا تھا۔ بے تکلفی کی فضا چاہتا تھا۔ ماحول سے مایوس ہونا چاہتا تھا۔ تاکہ نئے ماحول میں اسے اجنبیت کا احساس نہ ہو سکے۔ اس کے لیے وہ حتیٰ بجانب بھی تھا۔

دل نشین باتوں کے درمیان رات کا کھانا کھایا گیا۔ اور چائے کے دور کے بعد سب اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ لقور شبیدہ کے کمرے میں آگیا۔ کیونکہ وہ کمرہ اس کے لیے مختص کر دیا گیا تھا۔ شبیدہ غمی کے ساتھ اس کے کمرے میں آگئی۔ کیونکہ اس کا کمرہ تو لقور کے تصرف میں چلا گیا تھا۔ سچی رات گئے تک پر مصیبت رہی۔ اور وہ اپنے بچک پر بھی بے چینی سے کر دلیں بدلتی رہی اسے نیند مطلق نہ آئی۔ وہ بے نہی آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔ اس کے ذہن کی دیواروں سے عجیب عجیب۔ خیالات ٹکرا رہے تھے۔ وہ کبھی گہری نکر میں غلطاں تھی۔ اسے اپنا مستقبل محاذوں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پریشانوں میں گھر گئی تھی۔

سہیل۔

راحیل

کتنی متفرد فطرت رکھتے تھے دونوں بھائی۔ ایک شوخ و چمپل تھا۔ تو دوسرا سنجیدہ اور بردبار۔ راحیل کا چہرہ شرافت میں ڈوبا رہتا تھا۔ وہ بڑا دردمن انسان تھا۔ راحیل نے اسے دفتر میں کتنی سہولتیں دے رکھی تھیں۔ بلکہ سب سے زیادہ

وہ اسے قابل اعتماد سمجھنے لگا تھا۔ کتنی عزت سونپ دی تھی اسے۔۔۔۔۔
 اس سے کتنے اخلاقی سے اور مسرت سے پیش آتا تھا۔ اور سہیل وہ کتنا جذباتی
 تھا۔ اسے دیکھ کر تھنڈی آہیں بھرنے لگتا تھا۔ بے چین و مضطرب ہو جاتا تھا۔ اور
 اس سے اس کی ملاقات بھی کتنے عجیب حالات میں ہوتی تھی۔ شاید پہلی ملاقات
 نے سہیل کے دل پر گہرا نقش چھوڑا تھا۔ خود بخود اس کے ہونٹوں سے ایک دلفریب
 مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اس جذبے سے کسی طرح منکر نہ ہو سکتی تھی جو سہیل
 کو دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتا تھا۔ اور جیسے وہ سختی سے کھل دیتی تھی
 کیونکہ وہ جانتی تھی امارت کی اونچی دیواریں ان کے بیچ حائل ہیں۔ اس کے
 مطالعہ اس نے قصہ کہا نیوں میں پڑھ رکھا تھا۔ رئیس نامہ میں کئی محبت و دوستی کے بال
 کی طرح ہوتی ہے جو بڑا ہی جوش دکھاتا ہے۔ آخر کار اسے دینا ہی پڑتا ہے۔
 اسی طرح اسے اس محبت کے دینے کا خطرہ ہے۔ سہیل کو دیکھ کر وہ خود بھی کیف
 و سرور کا محسوس کرنے لگتی تھی مضطرب سی ہو جاتی تھی۔ مگر وہ اپنے جذبات
 کو دیا دیتی۔

بچی نے اپنے کورس کی کتاب میں میز پر سنبھال کر رکھی تھیں۔ اور سہیل شبیلہ کی
 طرف پیار سے دیکھا تھا جو آنکلیں بند کیے پڑی تھی۔
 ”آئی! ————— معلوم ہوتا ہے آپ کو ابھی تک نیند نہیں آئی۔“
 اس نے شیریں لہجے میں اسے ہلکا کر کہا۔

ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ شبیلہ نے آنکلیں کھول دیں۔ اور اسے
 غور سے دیکھا۔

”نیند نہیں کر رہی بچی!“

”مجان کی آمد نے پریشان کر دیا کیا؟ ————— اس نے دلفریب لہجے

میں کہا، لفظ مہان سے اسے اپنے دل میں سرحد محسوس ہو اٹھا۔ مہان کے ذکر سے جیسے اس نے ایک ایسا ناسا کیف محسوس کیا تھا۔ ایک نادیدہ سی مستی آڑ لگتی تھی۔ اس کے دل میں، لٹہ ہلچل مچ گیا تھا۔ اس کے شعور پر۔

”یہ بات نہیں ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”بس ویسے ہی غنید نہیں آ

رہی ہے۔“

”آپ!۔۔۔ میں دیکھ رہی ہوں۔۔۔ آپ بہت ادا اس رہنے لگی ہیں۔ بالکل رجسٹرڈ سن کے افسانے کی ہیروئن بیڑنس کی طرح معنوم دکھائی دینے لگی ہیں آپ! آپ اتنا غم بھی نہ کیا کریں۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے ہم بے موت مرجائیں گے۔“ وہ ادا اس ہو کر بولی۔

”خدا تمہیں زندہ و سلامت رکھے میری بہن!۔۔۔ اس کا بھو معنوم ہو گیا۔“

”تمہارے لیے میں کیا کر رہی ہوں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں کر رہی تم لوں ہی متردد ہو گئی ہو۔۔۔ اب بے فکر ہو کر سو جاؤ، رات کافی جا چکی ہے۔“

آسمان پر ہنوز بادل گھرے ہوئے تھے۔ اچانک ان میں زور سے گرج پیدا ہوئی اور آفت میں بجلی ایک روشن کھیر بتاتی ہوئی چلی گئی۔ اور باش اتر آئی۔

”بجی!۔۔۔ اس نے بجی کو بیار سے پکارا۔“

”جی! آپ!۔۔۔ وہ سعادتمندی سے بولی۔“

”کھر کی ہند کردو۔۔۔ اس نے کھر کی کی طرف دیکھ کر کہا۔۔۔ بوجھا

اند آئے لگی ہے۔۔۔“

صبح سویرے ہی عجی کی آنکھ کھل گئی۔

وہ جلدی سے اٹھی — آنکھیں مل کر شہیلہ کی طرف دیکھا۔ جو ابھی آرام سے سو رہی تھی۔ عجی نے اسے بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے اُس کے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔ صبح کا پرکیف اجالا ہر سو پھیل گیا تھا۔ اور کائنات کسی معصوم بچے کی طرح مسکراتی دکھائی دے رہی تھی۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ مگر آسمان ابھی تک ابر آلود تھا۔ ہوا کے فرحت بخش جھونکے کھڑکی سے آکر اس کے حسین چہرے سے ٹکرائے تو اسے عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا اور اس کا دل کیف و سرور سے بھر گیا۔ اس کے انگ انگ سے مستی سی پھٹنے لگی۔

ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ عجی نے ایک توبہ شکن انگڑائی لی۔ اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ ہاتھ روم میں ہاتھ منہ دھو کر باورچی خانہ میں آگئی اور ناشتے کا تیار کرنے کے لیے مٹی کے تیل کا چولہا گرم کرنے لگی۔ جب چولہا گرم ہو گیا تو اس نے نیکتلی میں پانی ڈالا اور اسے چوبلے پر رکھ دیا۔ پانی آہستہ آہستہ گرم ہونے لگا۔

نئی خیالوں کی حسین دلیلوں میں بہہ رہے تھے۔

تصور کی وجہ سے اسے بے حد شگوار کیا تھا۔ اس کی باتوں کے مزہ لیتے تھے۔ اندازے اس کے دل کو نئے جذبے عطا کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ایسے جذبے جن سے وہ پہلے بے خبر تھی۔ قطعا نا علم تھی۔ اسے اپنی زندگی انقلاب آشنا معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کے ذہن پر لطیف جذبوں سے سرشار کیف کے بادل چھائے ہوئے تھے اور اسے تصور کی صورت دیکھ کر ہی بے خودی اور مستی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ پہکنے لگی ہے۔ تصور نے اس کے گھر مہمان بن کر اسے دیوانہ بنایا۔ اس کے دل میں سرور انگیز جہان برپا کر دیا تھا۔ اسے مدہوش کر دینے والے جذبے بخش دیئے تھے۔

کیتلی کا پانی شوشنوں کرنے لگا اور چونک کر وہ تصورات کی بھول بھلیوں سے باہر آگئی اور خود بخود شرمائی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا جیسے تصور اس کے سامنے بیٹھا اسے گھور رہا ہو۔ اس نے لمبا کرکیتی کا ڈھکنا اٹھایا۔ اور اس میں چائے کی پتی ڈال دی۔

جب چائے تیار ہوگئی تو اس نے دل کی بڑھتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ میں ایک کپ بنایا۔ پھر وہ بڑے شرمیلے سے انداز میں اٹھی۔ اور باوجود چائے سے باہر نکلی۔ اس کے قدم تصور کے کمرے کی طرف اٹھنے لگے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے قدم لڑکھڑاہے ہوں وہ عجیب سے سرشار عالم میں تصور کے کمرے میں داخل ہوگئی۔

تصور کھڑکی میں چھوٹا سا آئینہ لٹکانے شیو کر رہا تھا۔ اور بڑے سرورانہ انداز میں کبھی کبھی لگنٹا نے لگتا تھا۔ کھڑکی میں شیشے کا جگ پانی سے بھرا ہوا اور ایک گلاس بھی قریب رکھا تھا۔ یہ سالن بھی نے رات وہاں رکھا تھا۔ جہاں کی ضروریات کا

اس نے پورا پورا خیال رکھا تھا۔ اسے کچی ہاتھیں ہوا تھا کہ وہ اس اچھلے مہان کی طرف اتنی توجہ کریں دے رہی ہے۔ پھر اس نے شراب کو سر کو جھٹکا تھا۔ اور اپنے استہباب کو قور دیا۔

قدوں کی آہٹ ہوئی اور تصور کو آئینے میں غبی کا لایا لایا حسین پیکر دکھائی دیا۔ تصور کے چہرے کلاںک بدل گیا۔ سرخ ہو گیا۔ جیسے وہ خود بھی اس کا منتظر تھا۔ اسے اس خوب رو لکی کا انتظار تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

آپ! — اس کے پیچھے میں خوشگوار حیرت تھی۔
 جی! — پھر وہ شرمیلے پنجے میں لہری — آپ کے لیے بیڈنی لائی ہوں۔ سو جا آپ بڑے آدمی ہیں بیڈنی ضرور استعمال کرتے ہوں گے۔
 پھر وہ ترنچی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ تصور نے بے اختیار تہقہ لگایا۔
 بڑا آدمی! — وہ اسے غور سے دیکھ کر بولا — یہ تمہیں کس نے کہا —

اباجان کہہ رہے تھے! —
 مگر میں تو خود کو بڑا آدمی نہیں سمجھتا — وہ سنجیدگی سے بولا — میں تو دوسرے انسانوں جیسا ہی انسانی ہوں — انسانوں میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔

یہ تو ٹھیک ہے! — وہ دھیمے پیچھے میں لہری — لیکن ہمارے معاشرے میں بڑا آدمی اسے ہی سمجھا جاتا ہے جس کے پاس دولت ہو —
 اباجان کہہ رہے تھے آپ کو روپتی ہیں —
 وہ اس کی مصومیت اور بھولنے پر زور سے ہنسا۔

کر دیتا تھا! — ” وہ رکا اور اس کو ایک نظر دیکھا — ” ہوں تو اس سے

کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔

”میں تو کوئی فرق نہیں پڑتا — ” وہ سنجیدہ ہو کر بولی — ” آپ اب جان

کے دوست کبھی نہیں جہاز سے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“

”بس اتنا ہی کافی ہے۔۔۔ اس نے بخوبی کچھ چہرے کو غور سے دیکھا اور

معنی خیز انداز میں کہا۔

”جی! — ” بخوبی نے گڑ بڑا کر نظریں اٹھائیں۔

”میرا مطلب ہے۔۔۔“ وہ مات بنا گیا — ”میرا مطلب ہے۔ میرے

لیے اتنا احساس بھی بہت بڑی چیز ہے۔ اسی احساس کے تحت میں یہاں آ گیا تھا۔

کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں میں اپنا کہہ سکتا ہوں۔ مجھے یہ جان کر بے حد مسرت
ہوئی ہے۔“

”جی! — ” وہ شرم و حیا کے تحت چھوڑوں سے لدی ہوئی ڈالی کی طرح جھول

گئی۔ اور قہور کو لیں لگا جیسے اس کا دل سینہ میں اچھلنے لگا ہو۔ اس کا اضطراب اور

بے قراری بڑھ گئی۔ اس اضطراب و بے قراری میں اسے ایک نشیمنی کیفیت کا احساس

ہو رہا تھا۔ یہ بے کلی خوشگوار دھڑکنوں کا فرق تھی۔ سرور انگیز جذبات کا عجیبہ سخی۔

اور نئی منزل پر پہنچنے کی مستند راہیں اسے دکھلا رہی تھیں۔

وہ اسے گرم گرم نفوس سے دیکھنے لگا۔ بخوبی نے اچانک نگاہیں اتاریں اور بڑا

کا نقاد ہوا۔ ایک برقی روشنی کے جھوم کے نیچے سے گزر گئی۔ دل کی رگ کھینچ

گڈ گڈ کر رہ گئی۔ بخوبی کچھ گھبرائی گھبرائی سی لگنے لگی تھی جیسے اسے کسی اجنبی۔ اسے خوف

کا احساس ہو رہا تھا جیسے کوئی نامعلوم سی دہشت اسے گھیر رہی تھی۔

”سچا ہے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔۔۔“ اس نے تڑپ کر مڑ مڑ کر دیکھا۔

اب نجی کے لیے وہاں کھڑا ہونا محال ہو گیا۔ وہ واپس پلٹی اور جانے کے لیے قدم اٹھایا۔ اس سے پیشتر کہ وہ آگے بڑھتی اسے تصویر کی آواز سنائی دی۔
 ”معلوم ہوتا ہے تم صبح سویرے اسٹھنے کی عادی ہو۔“

”جی! —“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”گھر کا کام کاج تمہیں ہی کرنا پڑتا ہے کیا؟“

”میں ہی کرتی ہوں — پھر وہ ذرا رک کر بولی —“ اور اس سے بھر راحت ملتی ہے۔“

”بہت خوب“

نجی چپ رہی۔

”گھر میں سب اسٹھ گئے ہیں کیا؟ —“ وہ اس سے بڑھتی باتیں کئے جا رہا تھا۔

نجی بدستور چپ تھی، نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

دوڑوں خاموش کھڑے تھے۔ ایک کی نگاہیں فرش پر جمی ہوئی تھی اور دوسرا اس کے ہاتھوں کے چہرے کو خوبیت سے دیکھ رہا تھا۔ نجی کے طویل لمحات ناگوار صورت اختیار کرتے چلے جا رہے تھے۔ یہ ایک تصور کو اس بات کا احساس ہوا۔
 وہ چونکا۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا —“ وہ مسکرایا۔

”کس بات کا؟ —“ دھیے لہجے میں نجی نے پوچھا۔

”گھر میں سب اسٹھ گئے ہیں کیا؟ —“

”میرے سوا ابھی سب سو رہے ہیں —“ پھر اس نے کہا — ”آپ بھی علی الصبح اسٹھنے کے عادی ہیں۔“

”اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟“ تم سمجھتی ہو کہ تمہارے سوا کوئی دوسرا صبح سویرے نہیں اٹھ سکتا۔“

”غی بول کھا گئی۔ اچانک اس کی نظریں اکٹیں اور جبک گئیں۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ میں نے تو یوہی پوچھا تھا۔“ غی کی آواز میں ہلکی سی غنائیت تھی۔

یہ ایک تصور اس طرح چونکا۔ جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔

”میرے لفظ تم کہنے سے کہیں کچھ ناگوار سی تو محسوس نہیں ہوئی۔“ بھرہ

ایک لمحے کے لیے رکت کر بلائی سے بولا۔ ”دراصل میں تکلف آلود فضا کو اچھا نہیں

سمجھتا۔ جہاں رہنا مودرا، الجھنیں پیدا کر دیتی ہیں ویسے اگر تم نے برامتا ہو تو اسندہ

احتیاط کروں گا۔“

”جی کاچہرہ کا لالچ کہ، سرخ ہو گیا اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ پلٹی اوبا ہر جانے

کے لیے قدم اٹھا دیئے۔ وہ لپاک کر اس کے آگے ہو گیا تصور کے چہرے پر سنجیدگی برس

رہی تھی۔

”میری بات بہت جواب دے کر جائیے۔“

”وہ شرم سے جی بکھا گئی۔“

”میں ناراض نہیں ہوں۔“ اس نے ہنسل کہا۔ اسے یوں لگا جیسے اس

کا حلوہ بن گیا ہو۔ اور اس کے دل میں ایک نشاط انگیز سی کپکپی پیدا ہو گئی ہو۔

وہ تصور کی طرف دیکھتے بغیر باہر نکل گئی۔ تصور کو یوں لگا جیسے آسمان سے چھوٹوں کی

بارش ہونے لگی ہو اور ملکوتی نمنوں کی آوازیں آرہی ہوں۔ خوشیاں ہی خوشیاں

ہو سو بھر گئی ہوں۔ وہ بے حد مسرور تھا۔ اس نے چمکیاں لے کر چائے پی اور

پھر شکر کرنے بیٹھ گیا۔ اس کی ہر حرکت سے مسرتی چھوٹی پڑ رہی تھی اور ہونٹوں پر

بے اختیار محبت بھرے ترانے پچھلے لگے تھے۔

جی۔ جیسے سانس لیتی ہوئی باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ اس نے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا۔ تب اس کی حالت قدرے سنبھلی پھر وہ خفیدہ کے کمرے میں گئی۔ اور اس نے اسے بیدار کیا۔

”آئی! اٹھنے! دن کافی چڑھ گیا ہے۔“

شبیلہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ مسکرا کر عجی کو پیار سے دیکھا۔ وہ بھی مسکرائے لگی اور کمرے سے باہر آگئی۔ وہ عجیب سے انداز میں قدم اٹھاتی ہوئی اپنے والدین کے کمرے میں گھس گئی۔ اسے ایک عجیب سی حسرت کا احساس ہو رہا تھا۔ ایسا احساس اسے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر سمان کی بیکلاں دستوں میں پہنچ جائے اور فضا کے بسیط میں پرواز کرتی ہوئی ستاروں سے آٹھ پھولی کھیلنے لگے۔ اسی طرح عمر تمام ہو جائے۔ صدیاں گند جائیں — پھر وہ پلٹ کر زمین پر نہ آئے۔ اس خواہش کے باوجود وہ زمین پر ہی تھی۔ اور اپنے والدین کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسا بھی ابھی بیدار ہوئے تھے۔

”اؤ بیٹی! — ارشاد احمد اسے دیکھ کر پیار سے بولے۔ — قصہ بڑا بیدار ہو گیا کیا؟“

”جی! —“ اس نے سر جھکا کر کہا۔

”بیٹی! —“ نافرستہ تیار نہیں کیا وہ بھی! — اس کی امی نے مامتا سے پوچھا۔

”آپ کو جگانے آئی تھی۔ —“ بس اب تیار کرتی ہوں جا کر۔ —“ یہ کہہ کر وہ پلٹی۔

”چلو! اس بھی تمہاری مدد کرتی ہوں۔ —“ رابعہ بیگم اس کے پیچھے

ہاں سوار نے کے بعد وہ کرے سے لگھا اور ارشاد احمد کے کرے میں آگیا۔
 ارشاد احمد نے اسے غور سے دیکھا۔ بقدر اخص بہت مسرور دکھائی دیا۔ اسے خوشی
 و غم دیکھ کر ارشاد احمد کے لبوں پر بھی مسکراہٹوں کی شمع جگمگانے لگی۔ اور ان کا بید
 چہرہ کسی قدر روشن ہو گیا۔

”تیار ہو گئے بیٹا۔“ وہ پیار سے بولے۔

”جی! — آپ کی دعا سے! —“ وہ پر اطلاق لہجے میں بولا۔
 ”خدا کے فضل سے بڑے مسرور دکھائی دے رہے ہو۔“ ارشاد احمد
 اسے غور سے دیکھ کر بولے۔

”اپنے لوگوں میں آگیا ہوں۔ اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہو سکتی ہے۔“
 اس کے لہجے میں اپنائیت کی گہری لہر تھی۔ ”دل چاہتا ہے ہمیشہ کے لیے
 یہیں رہنے لگوں۔“ ایک ہفتہ کے بعد آپ لوگوں سے پھر ٹٹے ہوئے شاید
 تکلیف پہنچے۔ یوں لگے لگا ہے جیسے میں آپ لوگوں کے ساتھ بہت عرصے
 سے رہتا آ رہا ہوں۔“

”بیٹا! تو غمزہ کون کہتا ہے۔“ چلے جاؤ۔ حبیبی خلیفہ بیگم دیٹی ہی مجھ
 سمجھو۔ میں بھی تمہاری ماں ہوں بیٹے! —“ رابعہ بیگم کرے میں داخل ہو کر مشفق
 لہجے میں بولیں۔

”میں بھی آپ کو ماں ہی سمجھتا ہوں! —“ وہ گھوم کر ادب سے بولا۔
 ”ہیں لیکن لگتا ہے بیٹے! جیسے ہماری کوئی دیرینہ آرزو آج پوری ہو گئی ہو۔
 میں بیٹا بن گیا ہو۔“ ارشاد احمد خاناں کی سی آواز میں بولے۔ ان کے چہرے پر
 ایسے تاثرات بکھر گئے تھے جیسے اخص اندوہناک مامی نے تڑپا دیا ہو۔ ان کی آنکھوں
 میں لم کی پرچھائیاں سی لہرا نے لگیں۔ وہ معصوم ہو گئے تھے۔

طمانیت کا پیرا ہے۔ محبت کی گرمی ہے۔ سچوں کی مسکراہٹ ہے۔ اپنائیت ہے۔ کسی کو اپنانے کے لیے مقدس چیزات میں اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ راحوں سے سہری ہوئی دنیا میں آگیا ہو۔ سبکوں کی محبت کا رے لگا کر سچوں کی خوشبو سے ہلکتے ہوئے گلستان میں آگیا ہو۔ جہاں بہاریں ہی بہادریں، سچول ہی سچول ہیں، کلیاں ہی کلیاں ہیں، خوشبو ہی خوشبو ہے۔

سٹوڈیو دیر کے بعد سب نے مل کر ناشتہ کیا۔ پھر غبی کا بیج چلی گئی۔ شبیلہ فرم آگئی اور قصدا اپنے کمیس کی پیروی کے لیے عدالت چلا گیا۔

دوسرا فرم آگئی تھی۔ اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ اگرچہ وہ خوش لباس تھی لیکن اس کا دل غمغوم تھا۔ اس کے ہر انداز سے کسکندی، اضمحلال اور تھکن کے آثار ہویدے تھے اس کے ذہن کے پردے پر نامساعد گھریلو حالات، مجبوریاں اور بے بسی ایک تقریر بن کر بار بار اسے گزرتے تھے۔

اس کے والد ارشاد احمد بیمار تھے اور گھر پر بیکار پڑے تھے۔ اگرچہ بنک کی طرف سے انھیں باقاعدہ تنخواہ مل رہی تھی۔ مگر بیماری کی وجہ سے وہ پندرہ دن میں ہی ختم ہو جاتی تھی۔ عام اخراجات پہلے کی نسبت دگنے ہو گئے تھے۔ اور آمدنی وہی قلیل تھی جو کچھ ارشاد احمد نے بڑی مشکل سے پس انداز کیا تھا۔ وہ ان کی بیماری کے شروع دو مہینوں میں ہی صرف ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں کی فیس اور دواؤں میں ہی سب کچھ نکل گیا تھا۔ تنخواہ ملتی تھی مگر اس کا پتہ نہ چلتا تھا۔ کہاں جاتی ہے۔ اسی لیے اسے مجبور ہو کر سر دس کرنا پڑی تھی۔ اگر داخل جیسے شریف آدمی سے اس کا سا باہر نہ پڑتا تو وہ لوگوں کی بھی نہ کر سکتی۔

شبیلہ ان آنکھوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ کہ چند ضروری لیٹر آگئے۔ وہ انھیں کھول کر پڑھنے لگی۔ پڑھنے کے بعد انھیں رجسٹر میں درج کیا۔ پھر وہ بیٹھے کھائے۔ اسے انداز میں کرسی سے اٹھتی اور ڈنگ لگاتے سے قدموں کے ساتھ باس کے کمرے کی طرف بڑھی۔ راحیل ایک فائل سلسلے رکھے لکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں قلم تیزی سے چل رہا تھا۔ قندیل کی آہستہ ہوئی اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ آج شبیلہ کچھ بدنی بدنی دکھائی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی شدید غم اسے بے چین کئے ہوئے ہے۔ یا وہ بیاسہ ہے۔ وہ منہل اور پریشان تھی۔ کوئی بھی ایک نظر ایک لمحے میں اس کی کربناک حالت کا اندازہ کر سکتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میز کے قریب آگئی۔

”سر! — یہ ضروری لیٹر ہیں۔“ وہ تجھ بچے لیے میں بولی۔
 ”راحیل کے لیے میں محبت اور نرمی تھی۔“ لیکن پہلے یہ
 بتاؤ کہ آپ کی اتنی اداس کیوں ہیں۔ آپ بیمار تو نہیں ہیں، آپ کو کوئی صدمہ تو
 نہیں پہنچا۔“

جھیلنے والے اداسیوں سے بھری نگاہیں اٹھائیں۔ سوگوار انداز میں راحیل کے
 چہرے کو دیکھا۔ اور پھر گردن جھکائی۔ وہ تڑپ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا ہاتھ
 چھن گیا ہو۔ وہ اپنے دل میں ایک اضطراب محسوس کر لے لگا۔

”سر! ایسی کوئی بات نہیں ہے! — اس کے لبوں کے کنارے ایک
 چمکی ہلکا سا ہنسی میں ڈوب گئے۔“

”نہیں — کوئی بات ضرور ہے — بتائیے! شاید! میں آپ
 کے کسی کام آسکوں۔“ پھر اس نے خوشگوار لہجے میں کہا — ”آپ کمزری
 کہیں ہیں بیٹھ جائیے!“

وہ بیٹھ گئی۔

ان کے درمیان کچھ ساہوکار وہ دہڑھوئے دکھائے،
خاموش لمحات کی سنگینی ان کے دلوں پر سے گزرتی تھی۔ ایک اپنے ..
حالات سے غلگلیں دافتر وہ تھا تو دوسرا اسے دیکھ کر بے چین و مضطرب ہو گیا تھا۔
یہ کیسا عجیب ہو رہا تھا۔ کیسے جذلوں کا تقادم تھا۔ کیسے عجیب زاویے تھے۔ جو ان کے
دلوں کے گرد محیط ہو گئے تھے۔ جذبات تھے۔ جو ان کے دلوں پر مسلط ہو کر اسٹیں
اضطراب آگئیں کر گئے تھے۔

ایک ایک راسخ چو نکا۔

”آپ کسی خدشے کے بغیر کہہ جائیے! — میں کوشش کروں گا کہ آپ
کی پریشانی کا ازالہ ہو سکے۔“ اس کے لیے میں اپنا نیت اور خلوص تھا وہ
اس وقت ایک ملک نہیں صرف ہمدرد انسان معلوم ہوتا تھا۔ اس کے اس لیے
سے شبیلہ کو جو صبر پیدا ہوا — اسے جرات ہوئی۔
”سہرا! —“ وہ رگ گئی۔

”ہاں! ہاں! کھنڈ —“ وہ بے چینی سے بولا۔

”سہرا! — کیا مجھے اپنی تنخواہ سے کچھ ایڈوانس بھی مل سکتا ہے!“
وہ کہہ گئی۔ مگر اسے یوں لگا جیسے اس نے سینکڑوں میں کا سفر کر ڈالا ہو۔ اور تک
کر چکا چور ہو گئی ہو۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے برعکس راحیل کے چہرے
سے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس کی تمام بے قراری ختم ہو گئی ہو۔ اور وہ اچانک دوبارہ
درشاہیاد وادلوں میں آگیا ہو۔

”بس یہی بات تھی۔ اسی وجہ سے آپ پریشان تھیں؟“

وہ خاموش تھی — اس کے چہرے پر افسردگی کے بادل چھا رہے تھے۔

آپ کتنا ایذا سن لینا چاہتی ہیں۔

شبیلہ نے بمشکل چہرہ مسکایا

”اس ماہ کی تنخواہ! — دو سو روپیہ! —“ اسے یوں لگا۔ جیسے اس

جراث سے اس کی آواز حلق میں چبھن لگی ہو۔

سو سو کے دو نوٹ ساحل کے پردس سے نکلنے کے بعد میز پر آگے بڑھے۔ اور اس

کی نظروں کے سامنے آ گئے۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

”اگر آپ چاہیں تو اس سے زیادہ بھی ایذا سن لے سکتی ہیں — آپ کو

اس نرم میں اگر بیسیوں کے بارے میں اتنا اندر نہ جونا چاہیے — ہم نے اپنی

فرم کے کارکنوں کے لیے بہت سی سہولتوں کا انتظام کر رکھا ہے۔“

چہرہ رک کر بولا۔ ”لیجئے! اتنی سی بات کے لیے اتنی پریشانی اچھی

نہیں۔ ہماری فرم کا کوئی آدمی بیسیوں کے لیے کبھی پریشان نہیں ہوتا۔“

شبیلہ نے ایک نظر راحیل کو دیکھا۔ پھر اس کی نگاہیں نوٹوں پر رہنم ہو گئیں۔ اس

نے نوٹ اپنے ہاتھوں میں سھام لیے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی تمام پریشانیاں اس۔

نوٹوں کے مٹنے ہی زائل ہو گئی ہوں۔ وہ مسرور و شادماں ہو۔ اسے کوئی الجھن نہ ہو سکتی

غم نہ ہو۔ کوئی پریشانی نہ ہو۔ کوئی تردد نہ ہو۔ کبھی قسم کی اندر دگی نہ ہو — مگر اس نے

اپنے چہرے پر اس قسم کے جذبات نہ آنے دیئے۔ اور اس کی آنکھوں میں راحیل کے لیے

تشکر کے جذبات ابھر آئے۔ راحیل اس کی آنکھوں میں ایسے جذبات دیکھ کر مسکرایا۔

”شکریہ! —“ شبیلہ احسانمندانہ انداز میں بولی۔

”شکریہ کیا؟ — آپ محنت نہیں کرتیں، اس فرم میں — یہ تو آپ کی

محنت کا معاوضہ ہے۔“

اسے راحیل کے کردار کی عظمت نے بے خود سا کر دیا۔ کتنی بے غرضی تھی۔ کردار کی

کس قدر بلند سی تھی اس کے لیے میں وہ اسے انسان نہیں بلکہ فرشتہ محسوس ہوا جس نے اس کی ذوقی ناؤ کو سجدہ صائب سے نکال لیا تھا۔ اس کے والدین کی عزت کو بچا لیا تھا۔ ان کے گھر میں آئے والے وہاں کو اب زیادہ خوشیاں ملی سکیں گی۔ اسے اب کسی بھی وقت معنوم چہروں سے دو چار نہ ہونا پڑے گا اب گھر میں عزت و ناداری کا احساس نہ ہوگا اور نہ اس کی پیاری امی کا کوئی زلیہ رہے گا۔ وہ اس طرح دکھائی دینے لگی جیسے۔ طوفان گورلے کے بعد ندی کا پانی پرسکون ہو جاتا ہے۔ طوفانی دور گزر جاتا ہے۔ پیچھے بے قرار تہ تلخ لہریں کناروں سے ٹک کر ختم ہو جاتی ہیں۔

”کبھی ایسی ضرورت پیش آئے تو بلا صبحک کہہ دیا کھجے۔“ پھر وہ بولا۔

”جی نہیں بس۔۔۔ کافی ہیں۔۔۔ ضرورت پوری ہو جائے گی۔“

وہ بہت ہی پر اخلاق لہجے میں بولی۔

ان کے درمیان پھر سکوت پھیل گیا۔ آخر راحیل نے ایک گہرا سانس لیا اور کسی

پر پہلو بدلا۔

”اچھا لائیے! خط!۔۔۔ وہ پھر بے ہوش لہجے میں بولا۔

وہ زندہ ہے چونکی۔۔۔ وہ اپنی آنکھیں میں اسے خط دینے بھی بھول گئی تھی۔

پشیمانی کانگ اس کے چہرے پر بکھر گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے خط طبرہ سے راحیل کی طرف بڑھائے راحیل نے اس کی پشیمانی پر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اور ہاتھ بڑھا کر خط ختم لے لے۔

تبدیلہ کو احساس ہوا کہ وہ چہرے سے دل کا حال بھج جان سکتا ہے۔ جذبات کا مطالعہ کر سکتا ہے۔

کتنا ذہین، معاملہ فہم، اور شریف انسان ہے راحیل۔

راحیل۔

را حیل

پھر اس کے ساتھ ہی اسے یہیں کا خیال آگیا۔ وہ کتنا شوخ و خجل اور جذباتی ہے اپنے بھائی کے برعکس ایک لالہ بابلی اور بے پروا انسان — مگر جانے کیوں وہ اس خیال پر شرم و حیا سے سرخ ہو گئی۔ وہ شبیلہ کے بدلے چہروں کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

را حیل اس سنہ چہرے پر شرم و حیا کے تاثرات دیکھ کر مسرہر سا ہو گیا۔ ایک بے خودی اس کے دل پر چھانے لگی۔ اسے بہاروں کی لطافتوں کا احساس ہونے لگا لطیف جذبات اس کے دل پر چھانے لگے اور سرمستی سی کرنے لگے۔ اس کے .. ہونٹوں کے کناروں پر دنوار مسرتوں کی چاندنی پگھلنے لگی وہ کچھ دیر اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ پھر وہ ایک گہرا سانس لے کر اُگے جھکا۔

اور خطا پڑھنے لگا۔ جب وہ خطا پڑھ چکا تو اس نے شبیلہ کو جوابات لکھائے شروع کر دیئے، نصف گھنٹے میں شبیلہ قارئین ہو کر اس کے آفس سے باہر نکل آئی۔ اس نے ڈرافٹنگ ایک ٹاپسٹ کر سچن لڑکی کو تھما دی۔ جس نے اسے سرو سی نظروں سے دیکھا۔ لیکن اسے ان نگاہوں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہ اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی، اور مسمیٰ میں پچھڑے ہوئے نوٹ پرس میں ڈال دیئے، اس کے بعد وہ اپنے کام میں لگن ہو گئی۔

وہ خطوطا ذبیح کرتی جا رہی تھی۔ دن تھا ایک لوجوان چہرہ اسی اس کی میز کے پاس آکر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

”آپ کو چھوڑنے صاحب نے بلایا ہے۔“ اس نے مودبانہ کہا۔
”مجھ! — شبیلہ نے نظریں اٹھائیں۔“

”جی! — آپ کو —“ وہ تہذیب و احترام سے یولار۔

• چلو! میں آتی ہوں! — اس نے اپنا کلام بند کر دیا۔ اور سہیل کے کمرے میں جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

سہیل نے راجس سے طعن کمرے میں اپنا آفس بنالیا تھا۔ اسے جدید طرز پر سہا دیا گیا تھا۔ ایک دن میں ہی آفس کی ضرورت کی ہر چیز پہنچ گئی تھی۔ ٹیلیفون کا سلسلہ دوسرے کمرے سے وہاں پہنچا دیا گیا تھا۔

چہرہ اسی جادو کا تھا۔ اس کی آواز لڑکیاں اور آفس کے دوسرے لوگ سبھی سن چکے تھے۔ سب — بڑے چڑا سہی کو اور پھر بنیڈ کو عجیب نظروں سے دیکھتا تھا۔ خبیلتہ سہیل کے کمرے میں چلی گئی تو آفس میں سرگوشیاں سی ہونے لگی تھیں۔

سمجھ میں نہیں آتا دو لڑاں بھائیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ — کو سپین لڑکی دوسری طرف کی سے مخاطب ہوئی۔

• شبید کو ہی یاد کیا جاتا ہے۔ — مجھے تو دل میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔ — دوسری لڑکی مسکراتے ہوئی۔

• تم ٹھیک کہتی ہو! —

• یوں لگتا ہے۔ — اس اس سے خاصے متاثر ہیں۔ — تمیری لڑکی آہ بھر کر بولی۔ — پھر تینوں معنی فیز انداز میں مسکراتے ہوئیں۔

مردوں میں بھی اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔

• سہیل بھی بالاش! میں بھی لڑکے ہوتا! — ایک کلرک نے دوسرے

سے کہا۔

• جس لڑکی ہونے سے کیا ہوتا ہے — خوبصورت لڑکی کہو۔

• میرے خیال میں دو لڑاں باس ایک ہی لڑکی پر ملے۔ — "تمیرے

نے قلم برد! کر کہا۔

”سچی لڑکی سچی تو اس قابل ہے کہ اس پر مر جائے۔“ ایک اور آہ ابھری
 یہ امیر زادے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ جہاں کوئی حسین چھو کر دیکھی اور دیشہ
 خطنی جو گئے۔

اس جھلے پر سب نے ایک چھوٹا سا تہقبہ لگایا۔
 دفتر میں چند منٹ تک شبیلہ کی شخصیت زیر بحث رہی۔ اس کی غیر موجودگی میں
 اس کی شرافت، استعانت، وقار، کردار اور عزت پر کچھ اچھا لگایا اسے اپنے طور پر
 مطعون کر کے جیسے انھیں دلی مسرت کا احساس ہوا۔
 شبیلہ نظر میں جھلکے کمرے میں داخل ہوئی۔ سہیل تنکی لٹکائے دروازے
 کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”یہی اس نے اے دیکھا، اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ وہ اے
 اس لباس میں قلوپترہ کی طرح حسین دکھائی دی۔ اور وہ خود کو سیزر سمجھنے لگا۔ جس
 سے قلوپترہ اندھی محبت کرتی تھی۔ اور جب سیزر اسے چھو کر چلا گیا تھا۔ تو وہ اس کی
 جدائی میں دیوانی ہو گئی تھی۔ راتوں کو بلیک سے اٹھا اٹھ کر دشت انگیز انداز میں
 سیزر

سیزر

بلا کر کرتی تھی۔ سیزر — سے والہانہ محبت نے اسے پاگل بنا
 دیا تھا۔ وہ اس کی یاد میں آنسو بہا یا کرتی تھی۔

مگر اس کی قلوپترہ نے تو ابھی تک اس سے ہنس کر بات بھی نہیں کی تھی اسے
 مسرور نظروں سے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس سے دلغریب انداز میں کبھی بات نہ کی تھی۔ اتنا
 جھانٹا تھا کہ اسے دیکھ کر اس کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ شرم دھما کی لہریں اس کے چہرے
 پر بکھر جاتی ہیں۔ جذبات کے مارو جزر سے اس کا جسم ارتعاش پذیر ہو جاتا ہے۔ مگر اس
 نے کبھی اس کی پذیرائی نہیں کی تھی اسے کم آمیزی اور سرد درتاؤ ہی رکھا تھا اور وہ

اس سے دودھ دیر ہی رہتی تھی۔ گو اسے یقین تھا کہ ایک روز وہ سیزر کی طرح اپنی
تقدیر طرہ کے دل میں جگہ بنا لے گا۔ پتھر دل موم کی طرح پگھل جائے گا۔ محبت کی آغے اسے
نرم کر دے گی۔ اور وہ ہمیشہ کے لیے اس کی ہو جائے گی۔

سہیل کے دفتر میں داخل ہوتے ہی اس کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ اور
وہ گھبرا سی گئی تھی۔ گہری شرم و حیا اس کے حین و دلکش سراپا پر مسلط ہو گئی۔ اس کے
خود بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی حالت ایسی کیوں ہو جاتی ہے۔ وہ سرور انگیزہ۔۔
وہشت اپنے دل میں کیوں محسوس کرنے لگتی ہے۔

کیا سہیل سے محبت میں اس کا یہ پہلا قدم تھا؟
کیا دائمی وہ سہیل کو چاہنے لگی تھی؟

اس کا تسلی بخش جواب وہ اپنے دل سے ابھی تک نہ پاسکی تھی۔ اس کو شش میں
بہ بہلا جاتی تھی۔ پریشان ہو جاتی تھی گھبرا جاتی تھی۔

شبیلہ بھی جیسی نظروں سے سہیل کو دیکھتی ہوئی اس کی میز کے قریب آکر رک گئی
، فرمائیے۔

”تشریف تو رکھیے!“ وہ شوخی سے بولا۔۔۔ فرما بھی دیا جائے گا۔“
اس نے کوئی جواب نہ دیا اور پچھلے گدوں والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

آپ کے والد کی اب طبیعت کتنی ہے؟۔۔۔ اس کا بوجہ نرم اور محبت
سے سرشار تھا۔

اب وہ طبیعت میں۔۔۔ وہ دمیے بلے میں بولی

، خدا انہیں جلد صحت دے!۔۔۔ اس کا بوجہ نقشہ سے پاک تھا جس میں

اپنائیت کی شدید آمیزش تھی۔

سہیل کے بلے میں گرمی اور خلوص سے ایک لمحے کے لیے وہ چوٹی پھر ادنیٰ

سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ جذبات سے طاری تھا اور پیشہ کی طمع سرد جذبات اس کے چہرے پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ اپنے نظریات کو شکست کیوں دے! ایک رئیس زادے کی طرف کیوں جھکے، اس کی دھمپیوں کو اپنی آرزوؤں کا مرکز کیسے بنائے! جیسے کسی نے ان کے کان میں سرگوشی کی۔

”آپ نے مجھے کس کام سے بلایا ہے۔“ وہ سکوت توڑ کر بولی۔
”کیا میں آپ کو کام کے بغیر نہیں بلا سکتا! —“ وہ جھکتے جھکتے مسکرا

کر بولا۔

”نہیں! —“ اس نے اسے دیکھے بغیر خشک لہجے میں کہا۔

”کیوں؟ —“ وہ مسنوی استغواب سے بولا۔

”آمن میں کسی ملازم کو غیر ضروری طور پر نہیں بلایا جاتا —“ وہ بالکل

سنجیدہ مٹتی۔

”اچھا —“ تو سمجھ لہجے کا کام سے بلایا تھا —“

بتائیے کیا کام ہے! —“ آہستہ سے سرد لہجے میں بولی۔

”ڈکیشن کرانی ہے۔“

وہ پید اور قلم لے کر سنبھل کر بیٹھ گئی اور اس کی آواز کا انتظار کرتے لگی بنگر جب کئی لمحے گزرنے کے بعد بھی وہ کچھ نہ بولا۔ تو اس نے جھلا کر — اس کی طرف دیکھا وہ بھی اس کو دیکھ رہا تھا۔

تصادف ہوا — سہیل کی نظروں کی گرمی اور ولہانہ انداز نے اسے —
بوکھلا دیا شبیلہ کا رنگ نہی ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ بدحواس سی ہو گئی ہو۔ سہیل اس کی بدلتی ہوئی حالت دیکھ کر مسکراتے لگا۔

”میں انتظار میں ہوں۔“ ڈکیشن بولتے — وہ لڑتے ہوئے

پلے میں لولی — سہیل کے ہونٹوں پر لطیف سی مسکراہٹیں تھیں جو اس کی فطری
 شوخیوں کی علامت کی گہرائی تھیں۔ وہ اس کی گھبراہٹ سے اپنے دل میں سرور سامعوس
 کر رہا تھا۔ اس کی کنگ اور بے چینی اسے ایک اُن جانا سا سرور نہیں رہی تھیں۔

• لکچے — وہ گھبر آوازیں بولا۔

وہ مستعد ہو گئی! — وہ کھانے لگا۔

اے دور دہیں والی لڑکی۔

تجھے گئے ہوئے کتنے ہی سال بیت گئے۔ سادوں میں تیری یاد شدت سے
 آتی ہے جب بن میں مورنا چتا ہے تو تیری مسرت چال کا گمان ہوتا ہے۔ پیہا کو کتا
 ہے تو تیری سرلی آواز کا لڑن میں رس گھولنے لگتی ہے اور بے خودی سی چھانے
 لگتی ہے۔ مگر تو کبھی کمزور ہے کہ پردہیں جانے کے بعد اپنے پریم کو بھول گئی۔ کبھی
 بھولے سے بھی یاد نہ کیا۔ تیری یاد دل کے قریب ہے۔ مگر تو قریب نہیں! — آخر
 کب تک یہ دہی رہے گی۔ آجا اور اپنی مسکراہٹوں کی خوشبو سے میری دیران ..
 سنان دینا کو ہکا دے۔ تیری یاد نے مجھے بہت بے چین اور پاگل بنا دیا ہے
 کب تک تو تڑپائے گی۔۔۔ کب تک تو محرومیوں کے سائے میں رکھے گی۔۔۔
 "پلیز!۔۔۔ مسر سہیل! —" وہ جھلا کر بولی — "میں ایسے خطا

کھنے کی عادی نہیں ہوں۔ اعدہ میں ایسے خطا کھنے کے لیے ملازم رکھی گئی ہوں۔
 سہر و باری خطوط کھنا میرا کام ہے۔ میں یہ سب کچھ سہیدگی سے کہہ رہی ہوں۔ آپ
 میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔"

• سمجھ گیا ہوں۔۔۔ بالکل سمجھ گیا ہوں — اس نے مصنوعی انداز

میں ایک آہ بھری — "کاش کوئی انہیں بھی سمجھائے! — کاش وہ
 سنگدل بھی سمجھ جائے۔"

”آپ پھر پہنچنے لگے ہیں۔“ اس نے ہنسنے سے کہا۔
 ”اچھا۔۔۔ صاحب!۔۔۔ نہیں پہنچتا۔۔۔ وہ سنبھل کر بولا۔
 ”بھئیے کاروباری خط!۔۔۔
 وہ پھر متعدد ہو کر بیٹھ گئی
 ہنس، دلنے!۔۔۔

آپ کا کارخانہ بڑا خوبصورت ہے، آپ کے کارخانے میں جوچمن ہے۔
 اس کے سر وہ بہت پیاسے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی مہربان کھڑی اپنی مسکراتی
 کے پھول سچا در کر رہی ہو۔ مگر دوسری طرف نگاہ مارتی ہے تو آپ کے کارخانے
 کا گیراج خالی دکھائی دیتا ہے۔ بالکل کسی حرماں نصیب کی طرح۔ آپ کے کارخانے
 میں ایک خوبصورت سی کار بونی چابی ہے!۔۔۔ جیسے کسی حرماں نصیب کے
 دل میں ایک حسین لڑکی کا تصور۔۔۔ آپ نے کار کا آرڈر بھی دیا تھا۔ نیا سٹا
 لعدنیا ماڈل آگیا ہے۔ آپ آئیں اور اپنے گیراج کو سہما لیں۔ آپ کا گیراج تو سچ ہی
 جائے گا۔۔۔! کاش! حرماں نصیب کا دل بھی سچ جائے۔ اس میں اس بھرتی
 بونی حسین سی عورت ہمیشہ کے لیے براجمان ہو جائے۔۔۔ آپ اطلاع دیتے ہی
 تشریف لے آئے۔ ورنہ.....“

سہیل کی آواز خاموشی میں ڈوب گئی۔۔۔ شبیلہ کا قلم چلتے چلتے رک گیا
 اس نے خشکیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ گہری محویت سے اس کی طرف
 دیکھ رہا تھا۔

”سہیل صاحب!۔۔۔“

”جی فرمائیے!۔۔۔“

”میں۔۔۔ میں ایسے مذاق کی عادی نہیں۔“

”دست ہے۔۔۔ لیکن میں بھی اتنی بے نیازی کا سہی نہیں؟“

”دیکھئے! — شبیلہ کی آواز میں بے بسی سہی۔“

”کھینچ! — میں سن رہا ہوں؟“

”کیا آپ — کیا آپ چاہتے ہیں میں یہاں سے چلی جاؤں۔“

”نہیں — نہیں تو — اس کارنگ فتح ہو گیا — کس نے کہا

یہ آپ ہے؟“

”آپ کے رد پے — آپ کی باتوں نے — آپ کے نامناسب

طرزِ زندگی — انتہائی سخت اور تلخ لہجہ میں اس نے یہ الفاظ ادا کئے۔ اظہ

ائمہ کرکھڑی ہوئی۔

”بیٹھے تو — کیا ہوا آپ کو — کیا آپ اپنے باس کا حکم نہیں۔

مانتیں؟“

”حکم — شبیلہ کے ہونٹ سمیٹ گئے۔“

”جی ہاں — خطا لکھنا آپ کا کام ہے، آپ ہی نے کہا تھا کہ خطا لکھائیے۔“

”دست ہے — لیکن آپ تو شاعری کر رہے ہیں خطا نہیں لکھا ہے؟“

”سہیل نے زور سے تہقہہ لگایا۔“

”تو آپ مجھے شاعر سمجھنے لگی ہیں۔“

”خطا تو یہی ظاہر کرتا ہے!!“

”آپ میری شاعری سے متاثر ہوئی ہیں —“ اس نے چوٹ کی۔

”میں —“ وہ بوکھلا گئی — ”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔ متاثر

ہونے کی۔“

”کاش! آپ دلوں کے رنگ بھی پر کھنے کی کوشش کریں —“ وہ گہرا

سانس لے کر پولا۔

”اور کچھ لکھا نا ہے؟“ — وہ بے رخی سے بولی۔

وہ ترشپ کر رہ گیا۔

”بس اور کیا لکھاؤں گا“ — اس کا پیر سنجیدہ ہو گیا۔

”یہ ڈرافٹنگ! — ٹائپ کے لیے دیتی ہے؟“ — وہ اس کی بات

نظر انداز کر کے بولی۔

”لایئے! مجھے دے دیجئے!“ — وہ دردمبرے انداز میں بولا۔ اور شبیلہ

کو اپنا دل تحت الشری میں گرتا ہوا غم سے بولنے لگا۔ وہ اس کے پرسوز لہجے سے

بے چین ہو گئی۔ اس نے ڈرافٹ سہیل کے بڑے بونے ہاتھ میں دے دیا۔ سہیل

نے ڈرافٹ لیتے ہی اس کے پُزے کر دیئے اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر ایک زور کی
سھونک ماری۔ کاغذ کے پُزے چاروں طرف بھج گئے اور دو چار شبیلہ کے چہرے
سے لمس کر کے فضا میں اڑنے لگے۔

سہیل نے اسے سردنگا ہوں سے دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کہہ رہی

ہوں۔

”تم نامان ہو۔ بے حس ہو۔“ — پتھر ہو۔

شبیلہ ان نگاہوں کی تاب نہ لاسکی۔ واپس پلٹی اور شکستہ قدم رکھتی۔ واپس

اپنی سیٹ پر آگئی۔ سیٹ پر وہ چین سے نہ بیٹھ سکی۔ اس کے سامنے بار بار سہیل کی

اداس نگاہیں ابھرتیں اور اس کے زخمی دل پر حملہ آور ہوتیں۔ وہ چونک پڑتی۔ کافی

دیر وہ یوں ہی بے سدھ بیٹھی رہی۔ پھر وہ ابھی اور دو گھنٹہ جلدی چھٹی لے کر گھر کو

روانہ ہو گئی۔

نئی آخری پرینڈ خانی ہونے کی وجہ سے کالج سے گھر آگئی تھی۔ اسے آئے

ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی۔ وہ اپنے والدین کے کمرے میں بیٹھی جھک جھک کر
 باتیں کر رہی تھی۔ شبیدہ کمرے میں داخل ہوئی۔ سب نے نگاہیں پھیر کر اسے دیکھ لیا۔
 ”آئی! — آپ آگئیں! —“ وہ مسرت سے بولی۔

”بیٹی! تمہاری سہیلی کیا ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی؟“ ارشاد احمد بولے۔
 ”روز گھر سے غائب رہنا سہی تو ٹھیک نہیں ہے۔“

”ابا جان —“ وہ جھجھلا کر شکستہ سی آواز میں جیسے چیخ پڑی — ”میں
 کوئی بچی نہیں ہوں جو کہیں گم ہو جاؤں گی۔“

اس کے بچے کے تھکے پن کو سب نے شدت سے محسوس کیا۔ سب
 ہی اسے چہرے سمجھ گئے۔

اس نے بہروں کی طرف نگاہیں دوٹوائیں۔ اسے اپنے تلخ بچے کا ..
 احساس ہوا۔ وہ نادام سی ہو گئی۔ سہیل کی نگاہوں نے اسے کتنا بے قرار
 کر دیا تھا۔ وہ کس موڑ پر آگئی تھی۔ اس نے اپنے والد سے اس طرح پیش آنے
 کی پہلی بار جسارت کی تھی! —

”ابا جان! —“ وہ نرمی سے بولی۔ ”بس دو چار روز میں بالکل
 تندرست ہو جائے گی۔ پھر میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“
 جیسے ان بغضوں نے ڈرتے دلوں کو سہارا دیا ہو۔ تاریک چہرے روشن
 ہو گئے۔ تلخ سی فضا خوشگوار ہو گئی۔

”تم جانو! بیٹی! — ارشاد احمد بولے۔
 ”میری بیٹی بڑی سمجھدار ہے — رابعہ بیگم اپنے شوہر کی طرف ..
 دیکھ کر بولیں۔“

”یوں ہی وقت بے وقت نصیحتیں نہ کرتے رہا کیجئے۔“

شبیلہ نے پیرس سے دو سو روپے نکال کر اپنی امی کے ہاتھ میں رکھا دیئے۔
 اور ارشاد احمد کو یوں لگا۔ جیسے کسی نے تیز دھار کا نثران کے دل پر رکھ دیا ہو

تصور مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

”بہت خوب! محفل جی ہوئی ہے!“

”بس لاک تمہاری کمی ہے بیٹے!“ — راجہ بیگم ماتا سے بولیں۔

”کوچہ سمجھ لیجئے!“ — میرے آنے سے کمی پوری ہو گئی۔ —

اور وہ مسرت انگیں لہجے میں بولا۔ — ”نچی اسے دیکھ کر لجاسی گئی تھی۔ اور

کرسی پر سٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے ترجمی نظروں سے لقور کو دیکھا۔ چہرے

پر سرخ نیکریاں بھر گئی تھیں۔ دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”آپ کب آئیں!“ — تصور نے شبیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کافی دیر ہو گئی ہے!!“ — وہ پر خلوص لہجے میں بولی۔ —

تشریف رکھیے!“ —

”شکریہ! وہ بیٹھ گیا۔“

”بیٹے! تمہارے کہیں کاکیا ہوا!“ — ارشاد احمد نے پوچھا۔

امید ہے فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ رابعہ بیگم نے دعا دی۔
 آپ لوگوں کی دعائیں میرے ساتھ ہوں تو فیصلہ دشمنوں کے حق میں ہو
 سکتا ہے سبلا!۔“ اس نے ان سے اپنی عقیدت بتائی۔

اکرم نے میں خاموشی پھیل گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے سب اپنے تصورات
 میں مگن ہو گئے ہوں۔ یکایک اس نے نظریں اٹھائیں اور بجی کی طرف دیکھا۔
 آج آپ کالج نہیں گئیں؟۔

”میں۔۔۔“ اس نے پھنسی ہوئی آواز میں کہا۔

”جی! آپ۔۔۔“ وہ برجستہ بولا۔

”گئی تھی!۔۔۔“ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

”آپ سحر ڈائری میں پڑھتی ہوں گی۔۔۔“ وہ مزاح کا عنصر اپنے لیے میں
 لاکر بولا۔۔۔ بجی کے چہرے پر حیا کی شفق پھیل گئی۔ اس کے ہونٹ لرزے
 آنکھیں اور جھٹک گئیں۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکی

”فرسٹ ایر میں پڑھتی ہے!۔۔۔“ شبیلہ نے اس کی طرف پیاسے دیکھ کر کہا

۔۔۔ مگر پڑھتی خوب محنت سے ہے۔

”بیٹا! منہ ہاتھ دھو لو پھر چائے پیتی ہے۔۔۔“ رابعہ بیگم مامتا بھر

لہجہ میں تصور سے مخاطب ہوئیں۔

”چائے تیار ہے کیا؟۔۔۔“ وہ ان کی طرف رخ کر کے بولا۔

”کالج سے آتے ہی بجی نے چائے بنالی تھی!۔۔۔“ رابعہ بیگم مسکرائیں۔

”پھر قناتی بڑی محنتی ہیں یہ۔۔۔“ تصور پر مزاح انداز میں بولا۔

اپنی تعریف پر بجی کے ہونٹوں پر دہی دہی دہی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

سب کی نگاہوں نے ایک لمحے کے لیے نجی کو دیکھا۔

”میرا خیال ہے۔ آج ہم سب شام کی چائے کسی ہوٹل میں پیئیں۔“ وہ خلوص کا اظہار کر کے بولا۔

ہوٹل میں۔۔۔ کیوں بیٹا گھر نہیں ہے کیا باب۔“ رابعہ بیگم حلدی سے بولیں۔

”سب کچھ ہے آنٹی جان!۔۔۔ میرا مطلب ہے ذرا تفریح ہو جائے گی۔“
اس کا لہجہ بہت ہی شیریں تھا۔۔۔ سب کو اس تفریح میں حصہ لینا ہو گا؟

”بھئی کم از کم میں نہیں جاسکتا۔۔۔“ ارشاد احمد افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

”اور میں بھی نہیں جاؤں گی!“ رابعہ بیگم ہلکی سی الجھن میں پڑ کر بولیں۔
”مجھ سے غلطی ہو گئی۔۔۔ اپنی کار نہیں لایا۔۔۔“ درنہ کہیں آئے
جانے کی دقت نہ ہوتی۔۔۔ خیر اب ہم لوگ ٹیکسی میں چلیں گے۔“
”بھئی مجھے تو اس تفریح سے مستثنیٰ ہی قرار دو۔۔۔“ ارشاد احمد۔
نرم آواز میں بولے۔

”اور میں بھی گھر چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔۔۔“ رابعہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔
”تو پھر میرے ساتھ کون جائے گا؟“

”شبیلہ! اچھی کو لے جاؤ اپنے ساتھ۔“ ارشاد احمد نے کہا۔

”شبیلہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ اور نجی شرم سے کئی بل کھا کر رہ گئی۔“

”میں کیا کروں گی جا کر۔۔۔“ شبیلہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”نہیں بیٹی جلی جاؤ۔۔۔“ رابعہ بیگم بولیں۔۔۔ ”تصور کوئی غیر تو نہیں؟“

بہنشی ٹھیک ہی تو مہر رہی ہیں۔۔۔۔۔ وہ مسکرا کر ملتیانہ بولا۔۔۔ انکار

کی گنجائش نہ نکالے؟

”وہ خاموش ہو گئی اور اس نے سچی کی طرف دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے سچی

کی گو مگو کی حالت اس سے کہہ رہی ہو۔

”آئی!۔۔۔۔۔ مجھ جیسی مصروف زندگی کو سچی کبھی اس دنیا کو گھوم بھر کر دیکھ

لینے دو مجھے بھی تفریح کے لفظ سے آشنا ہو جائے دو۔۔۔۔۔ مجھے سچی اس جہاں کے رنگ و لہو سے لطف اٹھانے کا موقع دو؟“

سچی لمبائی لمبائی سی بیٹھی تھی، شبیلہ نے ایک اہر اسانس لیا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ سچی!۔۔۔۔۔ تیار ہو جاؤ!۔۔۔۔۔“ وہ نے نہ مناسب بولی

”آئی!۔۔۔۔۔“ شبیلہ کی طرف سچی نے شرم آلود نگاہیں پھیر کر ہچکچائے ہوئے

انداز میں اٹھلا کر کہا، اور پھر اس نے نکلیوں سے تصور کو دیکھا، تصور زیرب مسکرا رہا تھا۔

”بس۔۔۔۔۔ اب کپڑے بدل لو جا کر۔۔۔۔۔“ شبیلہ نے حکم صادر کیا۔

”تم سچی کپڑے بدل لو بیٹی!۔۔۔۔۔“ رابعہ بیگم نے اس کا جائزہ لے کر کہا۔

”ای جان!۔۔۔۔۔ میرے کپڑے بالکل ٹھیک ہیں۔۔۔۔۔“ وہ بولی۔

بس منہ ہاتھ دھو لو گی۔۔۔۔۔

ٹھوڑی دیر میں ہی تینوں باہر جانے کے لیے بالکل تیار تھے۔۔۔۔۔ سچی

پیاز کی رنگ کی ساڑھی میں بڑی خوبصورت لگ رہی تھی، اس کے رخسار گلاب

کی پتیرا کی طرح دمک رہے تھے، اور باوقوفی بنوٹوں پر تقسیم کا اجالا پھیلا ہوا تھا

بڑی سرور دکھائی دے رہی تھی۔

تصور اس کے نچرے ہوئے حسن کو دیکھ کر سحر سا ہو گیا، وہ نظر میں چہچہا

اسے دیکھ رہا تھا، جی ان نظروں کو محسوس کر کے لمبائی جا رہی تھی۔

”تم لوگ تیار ہو گئے!“ — ارشاد احمد بولے۔

”جی!“ — تصور موڈ بانہ بولا۔

”چائے پی لو بیٹے!“ — رابعہ بیگم بولیں۔ — ”تیار تو ہو ہی چکی ہے۔“

”آنتی جان!“ — ”وہ منہ کر بولا۔ — ”ابا ہوش میں ہی بیٹھ گئے۔“

”جلدی آجاتا۔“ — ارشاد احمد نے کہا۔ — ”موسم خراب ہے۔“

بادل چھانے لگے ہیں۔“

”جلدی ہی آجائیں گے اٹکل!“ — یہ کہہ کر اس نے قدم اٹھایا اور

پلٹ کر دیکھا۔

”آئیے چلیں۔“

تنبیلہ اور نجی اس کے پیچھے قدم اٹھاتی ہوئی گھر سے باہر نکلیں۔ —

گلی میں کھیلے ہوئے بچوں نے انھیں غور سے دیکھا۔ کوارٹروں کے پیچھے کھڑی عورتوں

نے ان کا جائزہ لیا۔ — راہگیروں نے بھی انھیں عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

مگر وہ کوئی پروا کئے بغیر آگے قدم بڑھاتے گئے۔ گلی پار کرنے کے بعد وہ گھائی پڑھے

اور سڑک پر آ گئے۔ آسمان پر گھور بادلوں کا ہجوم تھا، ہوا میں چھل آنکھوں جیسی۔

شوخی سمٹ آئی تھی جو دلوں میں گدگد سی کر رہی تھی۔ برسات کی ہوا تھی۔

جس میں سحر تھا، کیف تھا، سرور تھا اور شہ تھا۔

ساوون کی ہوائیں تھیں اور — تصور کو نجی کا قرب حاصل تھا، موسم بہار

کے پھول کی طرح حسین لڑکی کا ساتھ تھا، اس لڑکی کا جسے وہ دل و جان سے چاہنے

لگا تھا، دل کی گہرائیوں سے نجی کے لیے ایک دم بے بہا پیار اُٹ آیا تھا، جانے

اس پیار کے سوتے کہاں سے پھوٹ پڑے تھے۔ وہ مذہب و مشاہیر کا تھا جیسے

اس سے زیادہ خوش قسمت شخص اس وقت اس دنیا میں کوئی نہیں ہے —
گفتائیں کسی مست البیلی حسینہ کی زلفوں کی طرح آسمان پر پھر پریاں لے رہی تھیں
اور مچل مچل کر ادھر ادھر پھیل رہی تھیں۔ بالکل پیار بھرے دلوں میں پھیلے ذالے
بیزبوں کی طرح! —

ایک ٹیکسی آئی۔

نصرونے ہاتھ دیا۔ وہ رکی نہیں

، ڈرائیوروں کی مخلوق بھی عجیب ہے — خالی ٹیکسی تھی پھر بھی نہیں۔

رکی؟

وہ بڑبڑایا۔

”یہ سچی اپنی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں —“ شبیلہ بولی — ”ابھیں
اگر سواری ملی تھیں اس کا احساس ہو جائے تو اور کیا چاہتے؟“

”آئی! —“ سب ہی لوگ یکساں سے نہیں ہوتے — سامنے ہے
ایک اور ٹیکسی آرہی تھی، عجیب کہنے لگی۔

”اے ہاتھ دیجئے! رک جائے گی!“

نصرونے آگے بڑھ کر اشارہ کیا۔ ٹیکسی رک گئی۔ اور عجیب کا چہرہ خرم لال

ہو گیا۔

”دیکھا آئی! رک گئی نا! —“

”ہاں رک گئی، —“ وہ آگے بڑھ کر بولی — ”چلو اب!“

وہ دونوں پھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

اور نصرونے فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھا۔ ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کی۔

”لاؤ ڈر چلو! —“ نصرونے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

کارڈی غلٹ سرکوں سے ہوتی ہوئی لارڈز کے سامنے آکر رک گئی۔ مال پر
رنگین چہرے اور حسین مسکراہٹوں بکھری ہوئی تھیں۔ بے پردہ تہقے بھی
کبھی کبھی سنائی دے جاتے تھے۔

کارڈل کی قطاریں بڑھتی جا رہی تھیں
نشینی نظروں کے تیر چل رہے تھے۔

کچھ گھائی ہو رہے تھے۔

کچھ آہیں بھر رہے تھے۔

غریب سماں تھا۔ مسکراہٹیں تھیں۔ درد تھا۔

پہنیاں تھیں۔ اضطراب تھا۔ خوشیاں تھیں۔ لا پر دامیاں تھیں۔ بے مکیاں تھیں
اگر کچھ نہیں تھا تو وہ عسرت و ناداری سے سوکھے ہونے پر ہر دل پر رونے نہیں سکتی
جو کبھی بے چین لہر کی طرح حسن کے مٹاٹھیاں مارنے ہوئے سمندر میں دکھائی دے
جاتے تھے۔ کتنی بے کسی اور بے کسی سیلی ہوئی تھی۔ اندھروں پر۔

دھچپے اتر آئے۔ تصور لے لیا ادا کیا اور وہ دروازے کی طرف چل پڑے
وہ شیشوں کے پیچھے ہوٹل میں کافی گہما گہما دکھائی دے رہی تھی۔ کوئی ٹیبل خالی
نظر نہ آتی تھی چہرہ دل پر ہر قسم کے جذبات تھے۔ خوشی سرور اور کشمکش کے۔
اپنے اپنے خیالوں میں ہر کوئی کھویا ہوا تھا۔ کہیں کہیں ہلکی ہلکی سرگوشیاں
ہو رہی تھیں اور کہیں چھوٹے چھوٹے بے فکر تہقے لگ رہے تھے۔ مگر ان کی گونج
تہذیب کی حد سے تجاوز نہ کرتی تھی۔

وہ دیر سے انتظار پر چلے گئے۔ وہاں بھی قریب قریب سب ہی میز پر
تھیں۔ مہر و مایہ، نیر خانی تھی۔ جس پر اسٹون نے قبضہ جمایا۔

ہوٹل میں جا ڈنچ رہا تھا۔

دسویں شبیلی اور راتلی تھی جوں میں اتنی محسوس ہوتی تھی، اور وہ دو کیف سے ..
 بھری ہوئی تھیں پیدا کرتی تھی اور خواناک سا منظر تھا۔ دھیمی دھیمی موسیقی، ہلکی ہلکی سُر،
 گوشیاں، دلوں میں لطیف، جذبات پیدا کر دیتی تھیں۔ اندھین تاثرات کو چہروں پر
 بکھیر رہی تھیں

نچی ملبوش سی ہوئی جا رہی تھی۔ وہ پہلی بار یہاں آئی تھی۔
 میرہ آرڈر لیٹے کے لیے ان کے قریب آگیا۔

”چائے! — سینڈویچ، شامی، باب اور پیڈیز لاؤ! —“ تصور میرے

کی طرف متوجہ کر لیا۔

بہتر جناب! — میرہ آرڈر کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ — نچی کی
 لہجہ ایسی کچھ عجیب تھی۔ اور اس کے پاسے جلسہ ہال نہ انداز میں گزر رہے تھے۔
 پگول کی روشنی میں، یہ تصور دل بڑا اٹھاتا تھا۔ — شبیلہ میزوں کی طرف

نظر بگھار ہی تھی اور کبھی کبھی ان کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔
 یہاں کی فضا کتنی پرسکون اور خوشگوار ہے! ———— تقور نے بات چلانے
 کے لیے کہا۔

”جی! ————“ نجی نے چونک کر نظریں اٹھائیں حالانکہ وہ شبیلہ سے مخاطب
 تھا۔ اپنی اس حرکت پر وہ ہشیمان سی ہو گئی۔ اور اس کا چہرہ گلزار سا ہو گیا۔ یکس ایک
 دل نشین انداز میں لرزیں ابرو جھک گئیں۔ ایک دلکش مسکراہٹ تصور کے اونٹوں پر پھیلی
 ہوئی تھی۔

”حافظی یہاں گہرے سکون کا احساس ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔“ شبیلہ بولی۔
 نگران لوگوں کو جنہیں فکر معاش نہ ہو۔۔۔۔۔۔ یہ مطلب ہے، دولت مند ہوں
 آسانی سے یہاں کے اخراجات پورے کر سکتے ہوں۔“
 ”ہاں۔۔۔۔۔۔ درست ہے!۔۔۔۔۔۔ وہ اگر چاہتا تو پور بجتا کر سکتا تھا۔
 مگر اس نے اس پر کیف ماحول میں بھرتی کرنا پسند کیا۔ سمجھا۔ ویسے بھی وہ شبیلہ
 کے چہرے کے تاثرات سے اتنا زیادہ دکھا چکا تھا کہ اس۔۔۔۔۔۔ اتنا انہیں بالہ پونہ
 بات چلانے کو یہ جملہ کہہ رہی۔

کچھ دیر بعد چائے اور سامانِ خورد و نوش پیش قیامت برتنوں میں سجائے گئے
 سامنے پہنچ گیا۔

”نجی! ————“ شبیلہ نے نجی کو پکارا۔
 ”نجی خوش کن خیالوں سے چونکی۔

”جی! آپنی!“

”چائے بناؤ!“

”بہت اچھا آپنی!“

یہ کہہ کر وہ بڑے شرمیلے انداز میں چائے بنا لے گئی اور تصور اس کے گورے چہرے
سفید سڈول اور ملائم ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ناخن ہالش زدہ تھے تو سہی مگر
کام کرنے کی وجہ سے کہیں کہیں سے پاس پہنچتی ناخن بھی زیادہ لمبے اور نوکیلے نہیں تھے۔
اس لیے انگلیوں کا محرومی بہن ذرا کم کھائی دیتا تھا بجران کی دیکھتی میں کمی نہیں تھی۔
وہ کبھی کبھی نکلیں سے اسے دیکھ لیتی تھی اور سرخ ہو جاتی تھی۔ بڑے عیب
عالم میں اس نے چاء تیار کر کے اور ایک ایک کپ، سب کے آگے رکھ دیا۔

شکریہ! — تصور نے کہا اور کپ اپنے آگے کھینچ لیا۔ چائے کے تین کپوں
سے گرم گرم بھاپ انور بھی سستی بخبی اور تصور کے جذبات بھی بھاپ کی طرح گرم تھے
اور دل کی گہرائیوں سے چہرے پر اندکائے تھے۔ کپ یو نہی پڑے تھے۔ اور وہ اپنی اپنی
سوچوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

پیشہ: — چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے با — شبیلہ نے پر خلوص آواز
میں خاموشی کے تسلیم کو توڑا۔

وہ چونکا اور چائے کے کپ ہونٹوں تک پہنچ گئے۔
”کیسے۔ چائے ٹھیک ہے؟ — وہ شبیلہ ہی سے مخاطب تھا۔
”جی! —“ وہ بولی اور غمی نے غلافی پلکیں اٹھائیں اور سچہ گرائیں تصور نے
ایک سینڈویچ اٹھایا اور دانتوں سے کاٹا۔

”آپ کچھ کھا نہیں رہی ہیں۔ کھائیے نا۔“

”دل نہیں چاہتا! — شبیلہ بولی۔“

”میرا ساتھ تو دیکھنا! — اس نے اخلاق آمیز لہجہ میں مل کر کیا شبیلہ کے ہاتھ

آگے بڑھایا۔ اور ایک سینڈویچ اٹھالیا۔

”آپ بھی کھائیے! — وہ غمی سے گہری نگاہ اور محبت سے بولا ماس

لڑے۔

”پہچے! — شبیلہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول چل سستی غمی کے جھولے
 بن اور مصویت پر شبیلہ کے ہونٹوں پر دینی دینی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔
 ”پہچے! — اب تو مکمل اجازت مل گئی ہے! — اس ہلکی سی چوٹ پر
 تصور چوٹ نکلا۔ اس کا رنگ فی ہو گیا۔ اس نے غور سے شبیلہ کو دیکھا۔ شبیلہ کا چہرہ ہلکی سی
 مسکراہٹ میں ڈوب گیا۔

”گہرائی گہرائی سی دکھا کی دیتی ہو غمی! — شبیلہ مسکرا کر غمی سے بولی —
 گہرائی کی کیا بات ہے۔ اس پر سکون فضا میں بھی تمہیں گہراہٹ کا احساس ہو رہا ہے
 میں دل سے چاہتی ہوں۔ تمہیں اس سے بھی زیادہ اچھا ماحول نصیب ہو۔“
 شبیلہ کے آخری الفاظ سے وہ سرخ ہو گئی۔ اسے اپنی آپنی پر پیار آنے لگا۔
 اس کا دل چاہنے لگا کہ اس سے وہ لپٹ جائے۔ اور اپنے والہانہ پیار سے اپنی بہت
 پیکری آپنی کو مددوش کر دے۔ کتنی بلند خیالی تھی اس کی آپنی۔

نقور نے بھی اپنائیت، خلوص اور متفکر نظروں سے شبیلہ کی طرف دیکھا۔
 ایک ایک چند لوجان لڑکیاں ہونٹوں میں داخل ہوئیں۔ اور سیدھی دوسرے منہ
 پر آگئیں۔ اور ایک بیز خالی ہوتے ہی اس کے رد پڑی ہوئی گدے دار کرسیوں پر —
 براجمان ہو گئیں۔ وہ بات پر تقری قہقہے لگا رہی تھیں اور ان کے بیچ ایک خوبصورت
 سی لڑکی — ان کے قہقہوں سے لجائی اور شرمائی جا رہی تھی۔ گہرا حجاب اس
 کے جسم میں لپکتی سی پیدا کر رہا تھا۔ وہ اسے کسی خاص بات پر چیر رہی تھیں۔ اسی لیے
 وہ شرم و حیا کا پیکر بنتی جا رہی تھی۔

ان میں سے ایک لڑکی کی نگاہ شبیلہ پر پڑی — پہلے اس کی نظر میں
 حیرت پھر خوشی کی چمک پیدا ہوئی۔ — شبیلہ نے بھی اسے بغور دیکھا اور وہ

اسے پہچان کر مسکرائے لگی۔

”ہا — ہا — شہیا تم ہو —“ وہ اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔

”شہیا! کہاں چھپی رہتی ہو —“ دوسری شوخ آواز ابھری۔

”شکوہ مجھ سے اور چھپی خود رہتی ہو —“ شہیلہ شکایتی لہجہ میں بولی۔

”اچھا بھئی! — گلے شکوے پھر کر لینا —“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

”اب تم اس میز پر چلو! — وہ لڑکی دیکھ رہی ہونا! —“ وہ جو

شرمائے جا رہی ہے — اس نے شرمائے والی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں دیکھ رہی ہوں۔“

”جانتی ہو وہ کون ہے۔“

”نہیں؟“

”وہ میری کزن ہے — برسوں اس کی شادی ہے اسی لیے شرمناک

ہے۔ پھر اسے دیکھ کر بولی — اب تم مل گئی ہو —“ انہیں بھی آنا پڑے

گلا شادی میں۔

”اگر میں نہ ملتی تو شاید نہ بلاتی —“ شہیلہ مسکرا کر بولی۔ — وہ شرم سے

سرخ ہو گئی۔ اس کے یونے سے پہلے شہیلہ نے کہا۔

”نہ ملتی تو شاید مجھے یاد نہ کیا جاتا؟“

”تم بھی کوئی بھلا نے کی چیز ہو —“ وہ دوستی جتا کر بولی — ”اچھا

اب اٹھ چلو زیادہ باتیں نہ بناؤ —“ پھر اس نے بخی اور لغو کی طرف رخ کیا

”آپ لوگوں کی اجازت ہو تو لے جاؤں انھیں؟“

وہ لغو سے پر اخلاق لہجے میں مخاطب ہوئی۔

”لے جائیے —“ وہ مسکرا کر بولا۔ — آپ کی سہیلی ہیں میں کیا

اور ارض ہو سکتا ہے۔

بندیلہ اٹھ کر دوسری سیٹ پر چلی گئی۔

نقور قدرت کی اس عطا: اس بخشش پر آپ ہی آپ مسکرا پڑا جس نے بڑے اچھے ماحول میں نجی کے ساتھ تنہائی میں بیٹھے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔
 تنبیلہ کے جانے کے بعد ہی سنبھل کر بیٹھ گئی تھی وہ سبٹ سی گئی تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ چہرے کے رنگ جلد جلد بدل رہے تھے۔ وہ کسی بھی اجنبی مرد کے ساتھ تنہائی میں پہلی مرتبہ بیٹھی تھی۔ اس لیے اسے ایک استغاثی سی وحشت کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک نادیدہ سا خوف اسے پریشان کیے ہوئے تھا۔ وہ بے چین ہونے لگی تھی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ ہر اسان ہر اسان کیفیت میں بھی اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اسے وہ مسکراہٹ مونا لیزا کی مسکراہٹ سے ملتی جلتی محسوس ہوئی۔ مونا لیزا دنیا کا بہترین شاہکار جسے فرانسیسی مصور لیونارڈ دا وینچی نے پینٹ کیا تھا۔ جس نے مونا لیزا کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ چسپاں کر دی تھی۔ سبھی کے ہونٹوں پر رقصاں مسکراہٹ دیکھ کر اسے مونا لیزا کی مسکراہٹ کا گمان گزرا تھا۔ نجی کی حیا میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ تھی ہی بڑی قاتل — اسے یوں لگا جیسے اس کا دل ایک دم گھائل ہو گیا ہو۔
 نقور نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور اس کے چہرے پر محبت پاش نظر میں ڈال کر کہنے لگا۔

”آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔“

”میں — نہیں تو —“

پھر آپ بات کیوں نہیں کرتیں —

”کیا بات کروں؟ —“ وہ آہستہ سے بولی۔

”کچھ بھی کہئے۔“

”آپ باتیں کیجئے۔۔۔ میں سنتی ہوں۔۔۔ اس نے ہمت کر

کے کہا۔“

”اتھم کچھ باغ میں کر دو گی۔۔۔ یہ کہہ کر تھوڑے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ چہرے پر کسی طرح کے ناگوار تاثرات نہیں تھے، بلکہ شرم کی سرخی پھیلی ہوئی تھی وہ خاموش رہی۔

”تم اتنی خاموش کیوں رہتی ہو۔۔۔“ وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔
”میں کہاں خاموش رہتی ہوں!۔۔۔ اس نے حوصلہ کر کے نظر اٹھائی
”آپ کا دہم ہے“

”خوب!۔۔۔ اس نے بے اختیار چھوٹا سا تہقہہ لگایا۔
پھر خاموشی چھا گئی اور ایک دو بار وہ لمبی لمبی ہلکیاں جھپکا کر پھر منہ پر دیکھنے لگی۔
”میں اس وقت بڑا ہی کیفیت محسوس کر رہا ہوں۔۔۔“ وہ رومان پرور
”ہجے میں بولا۔۔۔“ یوں لگتا ہے اس وقت مجھ سے زیادہ اس دنیا میں کوئی خوش نصیب نہیں ہے۔“
”وجہ؟۔۔۔“ اس نے دھیمے ہجے میں دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

”وجہ۔۔۔ وجہ کیا تم نہیں جانتیں؟۔۔۔“ وہ پیار سے ہجے

میں بولا۔

”میں تو کچھ نہیں جانتی۔“

”سچ کہہ رہی ہو۔“

”مجھے جھوٹ بولنے کی کیا پڑی ہے۔“

ہر سال کیفیت اور نادیدہ خوف اور اس کے دل پر چھائی ہوئی دھشت
آہستہ آہستہ کم ہورہی تھی اور وہ اس نیشے ماحول میں تصور سے باتیں کرتی ہوئی۔

ایک سہ درسا محسوس کر رہی تھی اور وہ جواب تکلف اور دوری کے دھاگے لوٹا۔
چمکتے، شبیلہ کی وجہ سے جو جھپک جھپک تھی وہ دور ہو چکی تھی شبیلہ کرسی پر ان کی طرف
پشت کئے بیٹھی تھی

نقصد ایک گہرا سانس لے کر بولا — تم جیسا سا تھی سالہنہ جو تو اس
سے بڑھ کر خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اس اچانک اظہار جذبات سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اس
کا چہرہ گھٹا ہو گیا۔ وہ شرم سے سمٹ سمٹ گئی۔ اس کی پلکوں نے کئی بار دلفریب
جنبش لی کئی بار ہونٹ لرزے۔ پھر اس نے شاکی نظروں سے تصور کو دیکھا۔ مگر تصور
کے ہونٹ چاندنی کی طرح شفاف مسکراہٹ لیے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں ایک
مقدس چمک تھی جس میں جھوٹ اور ریا کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کے چہرے پر گہری
محبت کے لبریز تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ اور وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا
تھا۔

بچی کو تپا دل ہاتھوں سے جاتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بے خود سی ہو گئی اور ایک
نشہ سا اس کے حواس پر چھا گیا۔ وہ جذباتی کیفیت میں ڈوبتی چلی گئی۔
”تم نے میری بات کا جواب دیا —“ وہ اس کی خاموشی سے حوصلہ
پاکر بولا۔

”کوئی اور بات کیجیے!“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔
”تم نے ایک لمحہ سب باتیں ختم کر دی ہیں۔ اب اور کیا بات کی جائے؟“
وہ غلین ہو گیا۔ ”میرے پاس کہنے کے لیے اور کیا ہے؟“ اس کے
چہرے سے یاسیت میں گھلے ہوئے سنجیدہ تاثرات ظاہر ہونے لگے تھے۔ وہ منوم
ہو گیا۔ اس نے پلکیں اٹھا کر گہری گہری نظروں سے اسے دیکھا اور ایک آہ سہر کر رہ گیا۔

بھی کورنچ و غم میں ڈوبا ہوا تصور کچھ اور خوب دکھائی دیا۔ اس کے دل نے چاہا
 وہ آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دے۔ اس کی بے لوث محبت کو قبول کر لے
 اس کے مقدس جذبوں کو اپنالے۔ اس کے دل کی استغناء گہرائیوں سے اسٹھی ہوئی آواز
 کو اپنی زندگی کا سنگیت بنا لے۔ جس کے زیر و بم میں زملے کی تمام مسرتیں اور خوشیاں
 میسر آجائیں اور وہ اپنی آرزوؤں، ارمانوں، اور خواہشوں کے مرکز کے قریب ہو
 جائے۔

سچ بیکایک وہ شرم سے کچھ اور سرخ ہو گئی۔ اُسے اپنے تصور پر اپنے خیالات
 پر اپنے چہرے ہوئے جذبات سے جیسے خود ہی شرم آگئی جیسے وہ اپنی سوچ پر خود ہی
 جھینپ گئی ہو۔ وہ سب کچھ جاننے کے باوجود بھی کچھ نہ کر سکی۔ کچھ نہ کہہ سکی۔ خاموشی
 سے میز کو تکٹی رہی۔ اور خاموشی کے بے رحم لمحے کسی بوڑھے کے قدموں کی طرح اٹھتے
 اور گرتے رہے۔

”یہ دفعتاً کتنی دلفریب اور حسینہ چکران کے لئے جن کے دلوں میں سکون ہے۔
 قرار ہے اور کسی کو پا کر محسوس ہونے والی مسرتیں ہیں۔ اس نے ایسا آہ بھری
 اور مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے میں کچھ پا کر بھی گناہ چکا ہوں۔ بھری بہاروں میں خزاں لے
 لوٹ لیا۔“

اس کی آواز سے غم کی شدت کا احساس نمایاں تھا۔ وہ مایوس اور تڑپا سا
 دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کی غمزدہ حالت دیکھ کر بھی شدید رہ گئی۔ اسے نہیں۔
 معلوم تھا کہ وہ اس کی اس بات کا اتنا گہرا اثر لے گا۔ تصور کی فطرت کا ایک عجیب
 رخ اس کے سامنے آگیا۔ وہ اسے ضرورت سے زیادہ حساس دکھائی دیا۔

مگر ایسے لوگ دل کے سچے ہوتے ہیں۔ بے لوث محبت کرنا جانتے ہیں۔ محبت
 میں مر مٹنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ وہ شاید اس کی محبت کا اقرار کر لیتی۔ مگر اسے ڈر

تھا کہ وہ اسے ہمیشہ کے لیے تاریکیوں میں چھوڑ کر نہ چلا جائے۔ نامعلوم سے خدشوں نے اسے دل کی بات کہنے سے روک دیا تھا۔ حالانکہ وہ تو اسے دل کی پوری گہرائیوں سے چاہنے لگی تھی !

”آپ تو مایوس دکھائی دینے لگے ہیں۔“ سخی انتہائی جرات سے کام لے کر اتنا کہہ گئی، اور سخی نظروں کے ساتھ اپنی بات کار و عمل تلاش کرنے لگی۔ اس کی اس جرات نے جادو کا کام کیا۔

تصور کے کرتے ہوئے حوصلے کو تقویت سی مل گئی۔ مایوسی اور قومیت کے بادل چھٹنے لگے۔ چاند کی کرنوں کی طرح اس کے چہرے پر اجالا پھیل گیا مقدس اور رنجی اجالا۔۔۔ رنجیدہ تاثرات اور جزبات پر لگا کر اڑ گئے۔ وہ مسرت کے عالم میں لہراتے پھولوں کی منکبت ذہن میں ازرقی محسوس کرنے لگا۔

”سخی !۔۔۔“ جذبوں کی گہری شدت سے لذتی ہوئی آواز اس کے ہونٹوں سے نکلا، کرایک خاموش و صمیمی سی گونج بن گئی۔

سخی کے ہونٹ لرزے مگر کوئی آواز نہ نکل سکی۔ اس کا چہرہ شرم و حیا کی۔ شفق میں نہا گیا اور تصور اس شفق کے دلکش رنگوں میں ڈوبنا چلا گیا۔

دل کی دھڑکنوں کو زبان مل گئی تھی اودان کی خاموشی انھیں نئی اُمٹیں، نئی آرزوئیں اور نئی جراتیں بخش رہی تھی۔

دقتاً شبلیہ اپنی سہیلی سے اعازت لے کر وہاں آگئی تھی۔ اس نے محبت بھری نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

”ہائے اللہ !۔۔۔ بہت وقت گزر گیا ہے اب چلنا چاہیے۔“

”آپ بیٹھے تو سہی۔۔۔“ وہ شبلیہ کی طرف دیکھ کر احترام سے بولا۔

”چلتے ہیں میرے خیال میں چائے کا ایک دور اور نہ ہو جائے۔“

کی نظروں سے بنی جائے کیوں شرانگہی اور خبیثہ نے گہرا سانس لیا۔ جیسے اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔

ثنیلہ بہن

ثنیلہ بہن

کوئی اسے بہن کہنے والا آگیا تھا۔ اس لفظ میں کتنا تقدس تھا۔ بہن اور۔۔۔ بھائی کا رشتہ کتنا پاکیزہ تھا۔ اس رشتے نے اس کے دل میں ایک سرخوشی بھر دی۔ اور اس نے بہن کے جذبوں سے مجبور ہو کر مسرورانہ انداز میں بھائی کی طرف دیکھا۔ اس نوجوان کی طرف دیکھا جس نے اسے بہن کہا تھا۔ تصور نے اس کچی کو پورا کر دیا تھا۔ جس کے لیے وہ ترستی آئی تھی۔ یہ مین رہی تھی۔ مضطرب رہی تھی۔ تصور نے اس کا بھائی بن کر اس کے دل سے حجاب کے تمام پردے ہٹا دیئے۔ اور وہ جذبات بچپن لیے جن میں وہ اجنبی تھا۔ اور جس نے ملنے میں جھجک اور ہچکچاہٹ کا احساس ہوتا تھا۔ اب وہ اس کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ وہ اس کا بھائی بن گیا تھا۔ اس نے اس رشتہ کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا تھا۔

”آپ نے مجھے بہن کہا ہے۔“ وہ لقمہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

”بہن بنا کر بھلا تو نہیں دو گے۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو۔ کہیں نہیں سمجھ سکتی ہیں؟“ وہ اپنی

آواز میں ایک غم لاکر بولا۔

”آپ کو بڑے صاحب نے یاد کیا ہے! — یہ بوڑھے چڑاسی کی۔
آواز تھی۔

”ہوں —“ شبیلہ نے نظریہ اٹھائے بغیر کہا۔
چڑاسی چلا گیا۔

وہ اپنی سیٹ سے ایک جنبش لے کر اٹھی۔ باقی لڑکیوں کے دل جل اٹھے۔ ان
کے چہروں پر ناگوار کی کئی اشاعت پھیل گئی مگر وہ ان کی طرف سے لاپرواہ راجیل کے
دفتر میں داخل ہو گئی۔

”کیسے مزاج ہیں آپ کے! —“
”بالکل ٹھیک ہوں — اللہ کا کرم ہے —“ وہ ملائم آوازیں
بولی۔

”انسان کو ہمیشہ خوش ہی رہنا چاہیے — بے بے حالات میں
بھی بتا کہ اچھے حالات میں آدمی دل کھول کر مسکرا سکے —“ اس کے لیے میں

اعلام کی منشاں تھی۔ ہماری فرم میں اگر آپ نے کچھ ناگواری تو محسوس نہیں کی؟
وہ چونکی۔

ناگواری کیسی باس! — اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ اگر میں اس فرم میں نہ
آتی تو شاید کہیں بھی سروس نہ کر سکتی۔ — ایسا پاکیزہ ماحول مجھے کسی فرم میں
نہ مل سکتا تھا۔ آپ کے حسن سلوک نے مجھے کافی تقویت بخشی ہے۔ —
شاید! — وہ اخلاق آمیز لہجے میں بولا۔

”یہ میرے دلی تاثرات ہیں باس! —“ وہ راجیل کی طرف دیکھ کر بولی۔
راجیل مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شبیلہ کو اس کی آنکھوں
میں چلتے ہوئے جذبوں کی شبیہ دکھائی دی۔ نظروں کے تقادم نے اس پر وہ راز
عیان کر دیا تو جوان دل پوشیدہ طور پر ایک دوسرے کو تانا چاہتے ہیں۔ شبیلہ نے
ذرا آنکھیں جھکا لیں۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ نظروں کے ملاپ سے
راجیل بھی کچھ گھبرا سا گیا تھا۔

کوئی ضروری لیٹر نہیں لائیں آپ! — وہ اپنی گھبراہٹ چھپا کر بولا۔
”ابھی تک کوئی ایسا خط وصول نہیں ہوا۔“ وہ نظریں جھکانے جھکانے
بولی۔ اس کی لمبی لمبی پلکیں دلچسپ انداز میں مرتعش تھیں۔
”باس! آپ نے مجھے کس کام سے بلایا ہے۔“ شبیلہ نے اسے طلسم کے مدد
جس در سے کھینچ لیا۔

”اوہ! —“ وہ ایک گھبراہٹ سے بولا۔ ”بہت ہی ضروری کام ہے“
”کہنے! —“ میں ہمدن گوشہ ہوں۔ —“ وہ ذرا سا آگے جھک کر
بولی۔

”آپ شہر سے باہر جاسکیں گی! —“ اس نے میز سے قلم اٹھا کر کہا

کس جگہ؟ — اس نے اسے ایک نظر دیکھ کر کہا۔ اس کے دل کی دھڑکن معمول پر آگئی تھی۔ اس لحاظ سے راحیل بھی خود پر قابو پا چکا تھا۔ وہ شبیلہ کو دیکھ کر بے قابو ضرور ہو جاتا تھا۔ مگر وہ اب مدعا ابھی تک زبان پر نہ لاسکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شبیلہ کو دیکھ کر اسے دیکھ کر کیا ہوجاتا تھا۔ اس کی حالت اس طرح کی کہ وہ ہو جاتی ہے۔ اسے کبھی کبھی احساس ہوتا تھا کہ کہیں وہ شبیلہ کو جا پہنچے تو نہیں لگا ہے۔ اس احساس کے باوجود وہ کبھی اپنی زبان سے ایسی کوئی بات نہ کہہ سکا تھا جس سے شبیلہ سمجھتی کہ اس کا پاس اس کی زلفوں کے پیچ و خم میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ اس کی شرافت نے شبیلہ کو ابھی تک بھی کسی ایسے تاثر کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا تھا۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ راحیل اسے اپنی زندگی کا اہم جز سمجھنے لگا ہے۔

بتایا نہیں آپ نے پاس! — ”وہ اسے خاموش دیکھ کر بولی۔ وہ یوں خاموش رہنے سے نادم سا ہو گیا۔ اور اس کا چہرہ سرخی میں ڈوب گیا۔ میرا مطلب تھا آپ کو ایک اشد ضروری کام سے کوہ مری بھیجنا چاہتا ہوں آپ جاسکیں گی؟ —“

”میں! — وہ کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔

”کام نہایت ذمہ داری کا ہے۔“ تنقوٹا سا توقف کیا، اور پھر بلا آپ اپنی ذمہ داری کو بڑے سلیبے سے نبھاتی ہیں۔ میں آپ کی کارکردگی سے بہت ہی خوش ہوں اور اپنی فہم میں سب سے زیادہ آپ کو قابل۔ تمام دیکھنے لگا ہوں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اتنی بڑی ذمہ داری میں آپ کو کبھی سوچنا۔“

”مگر میں سکوت پھیل گیا۔ شبیلہ کا چہرہ متردد تھا۔ وہ فردی طور پر کوئی۔ اب نہ دے سکی۔ آخر غلطی دیر کے بعد اس نے جسم کو ہلکی سی جنبش دی اور

راحیل کو دیکھ کر پھر نظریں جھکا لیں۔

”مجھ کا نام کی نوعیت سچا بھی تو آگاہ کیجیے۔“ وہ اپنے لہجہ کی سرزشت کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی بولی۔

”کوہ مری کے ساحلی سینٹی ٹوریم میں ایک بورڈ مار لیں ہے جس سے جا کر آپ ملیں گی۔“

”پھر! —“ شبیلہ مختصر اُلوئی۔

وہ لاہور کی اپنی اسٹیل فیکٹری بیچنا چاہتا ہے ہمارا خیال ہے اسے ہم خریدیں۔ — پھر وہ چند ثانیے رک کر بولا: ”مگر ہمارے ہاتھ فروخت نہ کرنا ہیں چاہتا وہ ہمارے خاندان کے سب افراد کو جانتا ہے۔ اس لیے ہمارا کسی کا بھی وہاں جانا بے سود ہوگا۔ وہ ہماری فرم کے پیشہ ملازمین کو بھی جانتا ہے۔ آپ چونکہ ہماری فرم میں نوادریں ہیں وہ آپ سے واقف نہیں ہے۔ آپ وہاں جا کر اپنے طور پر فیکٹری کو خریدیں۔ آپ کو اختیار ہوگا۔ ہماری شرح کے مطابق جس طرح چاہیں سود اٹھالیں رقم میں کمی بیشی آپ کر سکتی ہیں۔“

شبیلہ کے چہرے پر شش درج کے آنتا پھیلے رہے۔ پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

میرے سوا اور کوئی یہ کام نہیں کر سکتا؟ — وہ دھیمے لہجہ میں بولی۔
”آپ انکار کر دیں گی تو پھر اس کے بارے میں سوچا جائے گا۔“ وہ بہت ہی اذیت سے بولا۔

وہ پھر سوچ میں پڑ گئی۔ اچانک اس کے ذہن میں رافعیہ کی بہن کی شادی کا خیال بجلی کی طرح لہر اُگیا۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس خیال سے کچھ ڈھارس ملی۔
”اگر آپ مجھے اتنا ہی قابلِ اعتماد سمجھتے ہیں تو میں آپ کے اعتماد کو مسترد

بھی نہیں سکتی ۔

وہ فیصلہ کن انداز میں بولی ۔ راحیل کا چہرہ مسرت میں ڈوب گیا اور اس نے شبیلہ کو تحسین سے دیکھا ۔

”مگر ایک بات ہے ! — وہ متروک ہو کر بولی ۔

”کیا بات ہے بڑھتی قرآنہ بولا۔

”میں اکیلی نہیں رہا سکتی۔“ اس نے دل کی بات کہہ دی

”میں خود بھی آپ کو تنہا سمجھنے کے حق میں نہیں ہوں —“ وہ مطمئن لہجے میں بولا۔ اس نے گھنٹی کا بزن دبا دیا۔ چپڑا سی حاضر ہو گیا اور مودبانہ کمرہ اہو گیا۔

”دیکھو ! —“ چپڑے صاحب کو بلاؤ ! — وہ چپڑا سی سے بولا۔

”چند لمحوں بعد سہیل اندر آگیا۔ اس کے ساتھ ہی ارشد بھی مسکراتا ہوا۔ اندر آگیا۔ راحیل نے اسے نہیں کر دیکھا۔

”اوہو ارشد میاں! تشریف لانا ہے ہیں —“ سہیل نے پلیٹ کر ارشد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ شبیلہ نے بھی اسے ایک نظر دیکھا تھا۔

”آؤ ! آؤ ! بیٹھو ! —“ راحیل محبت سے بولا۔

”بھائی جان ! پہلے یہ بتائیے ! —“ وہ ادھر ادھر دیکھ کر مزاحیہ انداز

میں بولا۔ ”یہاں کہیں اس پاس انکل تو نہیں ہیں۔ پھر ہی بیٹھوں گا۔“

”راحیل اور سہیل نے زور سے ہنسنے لگے۔ شبیلہ لا تعلق سی بیٹھی رہی۔ وہ کچھ دیر ہنسنے رہے۔

”ارشد بہت اسی ڈرنے لگے ہو فیڈی سے ! —“ سہیل اپنی منہی

روک کر بولا۔

”بڑنگوں سے ڈرنا ہی چاہیئے بھائی جان ! —“ وہ عجیب سا منہ

باکر بولار۔

”جھا — اچھا بیٹھو! —“ راحیل نے کرسی کی طرف اشارہ کیا وہ بیٹھ گیا۔

”مجھے کس لیے بلایا ہے بھائی جان! —“ سہیل نے کہا۔

”بیٹھو جانا ہوں —“ اس نے ملائمت سے کہا۔

راحیل نے گھنٹی کا بٹن دیا یا۔ چپڑ اسی آگیا۔ اس نے اسے چائے لانے کو کہا۔ چپڑ اسی چائے لائے چلا گیا۔ راحیل نے ایک لمحے کے لیے سب کے چہروں کی طرف نظریں دوڑائیں۔ پھر وہ سہیل کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تم مس شبیلہ کے ساتھ کل صبح مری نے لیے روانہ ہو جاؤ گے۔“ راحیل نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”ہیں —“ ان کے ساتھ جاؤں گی —“ شبیلہ بوکھلا سی لگنی

”بھائی جان میں! —“ وہ گہرا سا گھبراہٹ کا لہجہ لے کر فریاد کرتی ہوئی کہ ”مگر فردا ہی شبیلہ کا تہذیب دیکھ کر مسکرانے لگا۔“

”آپ دونوں ہی جائیں گے۔“ پھر اس نے شبیلہ کی طرف دیکھا۔

”ایک قابل اعتماد فرد کے ساتھ دوسرا قابل اعتماد آدمی ہی جاسکتا ہے۔ مجھے اپنے بھائی پر کامل بھروسہ ہے۔ راہ میں یہ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوئے دے گا۔“

ایک رات کی بات ہے یہاں سے ابھی فون کر کے کل کہیے آپ کے لیے ہوں میں دو کمروں کا بندوبست ہو جائے گا۔ آپ کل صبح سینئری ٹوریم میں جا کر ٹیکسٹی کے مینیجنگ مالک سے بات چیت مکمل کر سکتی ہیں۔ سہیل آپ کا —۔ باہر انتظار کرے گا۔

آپ کے پاس دستخط شدہ چیک آہٹ ہو گی۔ آپ بیچنے کے طور پر بھی جتنی مناسب سمجھیں نقد کر سکتے ہیں۔ — پھر اس نے شبیلہ کو بغور دیکھا اور کہا۔ ”اگر آپ سہیل

”بھائی جان! ایک بات پوچھوں! — ارشد اس کی طرف حیرت سے دیکھ کر بولا۔

”آپ تو دل سے چاہ رہے ہوں گے کہ اہل حسین لڑکی کے ساتھ سفر کا کوئی موقع ملے۔ وہ شرارت سے ہنس کر بولا۔

سہیل جھینپ گیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔

”اب تمہاری شوخی ذرا میواری ہو گئی ہے ارشد! —“ وہ ہنست کو۔

مسکراہٹ کے پردے پر چھپا کر بولا۔

”بھائی جان! اسی حسین لڑکی آپ کی فرم میں کیسے آگئی۔“ ارشد نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر پوچھا۔

”یہ بھائی جان، سے دریافت کرو۔ جنہوں نے اسے ملازم رکھا ہے۔“ وہنجیگی سے بولا۔

”ہیل کی سنجیدہ دیکھ کر ارشد کبھی مزید کی شوخی کی حیثیت نہ ہوئی۔ پھر سٹوڈی دیر ۹۔۱۰ وہاں بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا اور پھر اجازت لے کر باہر آ گیا۔

”نیپا کو چونکہ کل صبح کوہ مری جانا تھا اس لیے وہ جلد ہی گھر چلی گئی۔ وہ گھر آ کر ایک لمبے عرصے تک کون سے نہ گزار سکی۔ اسے ایک اضطراب اور بے گلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دندہ تو کرائی تھی مگر جانے کو اس کا دل نہ چاہتا تھا۔

”ایک طرف وعدہ تھا — جو اس نے راحیل سے کیا تھا۔ وہ اعتماد تھا۔

جیسے اسے پورا کرنا تھا۔ لیکن دوسری طرف سفر تھا ایک لالچائی سے لہجہ کے ساتھ جس کی جذباتی کشش سے بعض اوقات اسے خود سا آجاتا تھا۔

پھر گھر سے اجازت ملنے کا سوال —

وہ ایک شدید ذہنی انجمن میں گرفتار تھی۔ ایک ادیب ٹرین تھی جس کے تالے

باے گڈنڈے ہو کر رہ گئے تھے اور وہ سارا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔
 ”آئی! آج آپ کچھ کھوئی کھوئی سی ہیں۔ یہی حال ہے جب سے آئی ہیں۔
 دھنگ سے کوئی بات ہی نہیں کی۔“

”کیا بات ہے شبیلہ بہن! —“ تقور نے گہری ہمدردی سے کہا۔
 ”کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ —“ وہ مضمحل سی آواز میں بولی: ”سوچ
 رہی ہوں کل رات کی بہن کی شادی ہے جاؤں کہ نہ جاؤں؟“
 ”آپ کو جانا چاہیے آئی! —“ آپ کی سہیلی ہیں۔ انھوں نے ہنسنے میں
 کل آپ کو کس خلوص سے دعوت دی تھی۔ — سچی محبت بھری
 آوازیں بولی۔

”واقعی —“ وہ آپ کی بڑی اچھی سہیلی ہے۔ اس کی دعوت کو ٹھکرانا
 کچھ اچھا نہیں ہے۔ ”تقور کے لیے سے اسے کچھ سہارا ملا، اور اسے یقین ہو گیا کہ
 اس کے والدین بھی اب انکار نہیں کریں گے۔“
 ”یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے چلی جانا بیٹی —“ رابعہ بیگم مانتا ہے
 بولیں۔

”اباجان! وہ ارشاد احمد کی طرف پیار سے دیکھ کر بولی۔ ”اب آپ کی اجازت
 کی ضرورت ہے۔“

”مجھے سمجھا کیا اعتراض ہو سکتا ہے بیٹی؟ —“ وہ محبت سے بولنے لگی۔
 لوگوں سے میں ملاپ میں کیا حرج ہے۔
 ”آئی! آپ کی سہیلی کہاں رہتی ہے! —“ اس سے سخی نے پیار
 سے پوچھا۔

”بھولہ گ میں رہتی ہے! —“ اس نے کہا تو دیا۔ مگر اس کا دل دھک

دھک کرنے لگا۔

کل کس وقت آجائیں گی آپ؟ ————— ”بچی نے کہا۔

کل کیجئے آسکوں گی ————— ”وہ جلدی سے بولی۔ کل رات کو تو رات آئے گی۔ ————— ”ایک رات تو ٹھہرنا ہی پڑے گا۔ پرسوں شام تک آسکوں گی۔“ ایسے دن بار بار تو نہیں آتے۔“ قصور بولا۔ ”سہیلی کی خوشنودی کے لیے ایک رات کی کیا بات ہے۔“

سب مسکراتے لگے۔ پھر وہ رات ————— ”کے تک باتیں کرتے رہے۔ رات کے کھانے کے بعد اپنے اپنے کمرے میں آگئے۔

بچی نے پڑھنے کے لیے کرسی پر بیٹھ کر کتاب کھولی اور صفحے پلٹے لگی۔ آپ پڑھو گی کیا؟ ”شبیلہ نے پوچھا۔

”جی! آپ! ————— ”اس نے اس کی طرف نظریں پھیر کر کہا۔

”کورس کی کتاب ہے! —————“

”نہیں! ————— ”وہ بولی۔ ”اس وقت کورس کی کتاب پڑھنے کو جی نہیں چاہ

رہا ہے۔“

”پھر کونسی کتاب ہے تمہارے ہاتھ میں۔ ————— ”اس نے کتاب کی

طرت دیکھ کر پوچھا۔

”ٹیکسٹ بک کے ڈرامے۔ ————— ”میکیتھ تھوڑا سا پڑھا ہے۔ خیال ہے کل کرلوں گی۔“

وہ مسکرا کر بولی۔

”لیڈی میکیتھ۔ آہ! کتنے غم اٹھا کر مرتی ہے بے چاری! ٹیکسٹ بک کتنا

شاندار کیریئر تخلیق کیا ہے۔ زندگی کو غموں میں بسر کرنا کتنا امنوس ناک انجام ہے

انسان کا۔ وہ اداس لہجے میں لہری۔ ”کیا انسان غم اٹھانے کے لیے ہی پیدا ہوا ہے؟“

”غم اور خوشی تو زندگی کے ساتھ ساتھ ہی چلتے ہیں آپ! —“ غمی پیار سے بولی
کوئی غم اٹھا کر مارتا ہے کوئی خوشیاں سمیٹ کر :

”کیا دنیا سے غم ختم نہیں ہو سکتے —“ وہ اندھیرے غلاؤں میں گھومتے ہوئے
بولی : ”انسان کیا کوئی ایسا نظام تخلیق نہیں کر سکتا جس سے غموں کا احساس ہی مٹ
جائے۔ زندگی پھولوں کی طرح مسکراتی ہوئی دکھائی دے۔ ہر سو خوشیاں، خوشیاں
ہوں کہیں غم کی پرچھائیں بھی دکھائی نہ دیں :“

”آپ! —“ اس زملے کا انسان کو ششقرق تو یہی کر رہا ہے —
اس نے رخ شبیلہ کی طرح پھیر لیا۔ دیکھئے کب کا میاں بنتا ہے۔ کب زندگی سے
چپکے ہوئے غموں کو نوچ کر پھینکنا ہے :

”یہ کامیابی۔ انسان کی عظیم ترین کامیابی ہوگی۔“ اس نے اندر دہ پیسے میں کہا۔
”مگر آپ! —“ آپ ادا اس نہ رہا کھجئے! —“ اس کا لہجہ غمزدہ ہو گیا
آپ کو ادا اس دیکھ کر کھجے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ میں پریشان ہو جاتی ہوں۔ —“
”تم ایسا نہ سوچا کرو —“ میری پیاری گڑیا —“ اس نے ایک
اندر دہ سی مسکراہٹ بخونٹوں پر پھیلائی —“ نہیں تو بس اپنی حلیم کے
متعلق سوچنا چاہیئے! —“

ایک گہرا سکوت کمرے میں پھیل گیا۔ باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں
آ رہی تھیں۔ یا کبھی کبھی پیرے دار کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ شاذ و نادر کسی گھر
میں بچے کے رونے کی آواز بھی گونجتی تھی اور کبھی کبھار باہر سڑک پر گزرتے
دالی کسی موٹر کے انجن کا شور ساکت فضا کو درہم برہم کر دیتا تھا۔

”آپ! —“ وہ اس طرح چونکی جیسے اسے اپنی بھولی ہوئی بات یاد
آگئی ہو : ”آپ! آپ! سچ سچ بتائیں آپ ہر روز کہاں جاتی ہیں۔ میں آپ سے جھوٹی

آپنی! — ایک، دو، تین، چار، پانچ، سب کے ہونٹوں سے باہر نکلے اور اس کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

آپ نے یہ کیا کیا آپنی! — آپ ہمارے لیے کتنے دکھ اٹھانے لگی ہیں؟
تم بھلی ہو — اس کے ہونٹوں پر ایک افسردہ مسکراہٹ تھی اور
بہرہ سوز غم سے پُر تھا۔ "تو ہمارے لیے میری جان سمجھنا آجائے تو معمولی بات ہے
اب رو نہیں آسنو پونچھ ڈالو، محنت میں کوئی عیب نہیں ہے، اور ہم اس برے
وقت کو محنت و مشقت ہی سے تو اچھے لمحوں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی
اور بچی کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے کرسی آگے بڑھا کر بڑے پیار سے
اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔

"اب رونا بند کر دیکھتی — شبیلہ دل پر جبر کر کے مسکرائے گی۔
دن میں بھی رونے لگے گی!"

"آپنی! وہ اس کی طرف دیکھ کر گہری محبت سے بولی — آپ کتنی اچھی
ہیں —
شبیلہ مسکرائی۔

"میں اچھی ہوں! — اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ لڑکیاں تو
کہتی ہیں، تم مجھ سے اچھی ہو۔" — شبیلہ نے کچھ اس انداز میں آخری جملہ کہا
کہ بچی بے ساختہ کھٹکھٹا کر منس پڑی۔

"میری بہت ہی پیاری آپنی! — وہ دل میں اٹھنے والی گہری
محبت سے مجھ کو کرسی سے اٹھائی اور شبیلہ سے لپٹ گئی۔ وہ بچی کے اس جذبہ
محبت سے بے حد متاثر ہوئی۔ اور اسے بڑے دالہانہ انداز میں اپنے بازوؤں
میں سمیٹ لیا۔

”آپنی! ———: بچی نے قبیلہ کی طرف بڑے دالہانہ انداز میں چپکٹی مٹی
انکھوں سے دیکھا۔

”تو آپ روپے دفتر سے لائی تھیں۔

”ہاں! وہ مسکرائی — ایڈوانس لیے ہیں۔

”اگر ابا جان کو سروس کا علم ہو گیا، وہ سمجھ گئی سے بولی: ”تو انھیں کتنا
دکھ ہوگا۔“

”اور جب مجبور یوں کی طرف دھیان جائے گا تو میرے اس اقدام کی دل میں
ضرور قدر کریں گے۔“

”بچی کے اطمینان کے لیے بولی، حالانکہ وہ جانتی تھی، اس کے والد کو اگر علم
ہو جائے تو یہ سروس کسی حالت میں برقرار نہ رہے گی خواہ انھیں کتنی بھی مالی پریشانی
ہو۔ کیے بھی برے حالات ہوں، وہ لڑکیوں کی ملازمت کے سختی سے مخالفت میں
لڑکیوں کا بے مقصد گھر سے باہر نکلنا بھی انھیں گوارا نہیں، وہ یہ سب جانتی تھی۔

”آپنی! ———

”ہوں ———

”آپ کل شادی میں جائیں گی۔“

”نہیں۔“

”آپ تو پروگرام بنا چکی ہیں۔“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔

”مجھے دفتر کے کام سے ایک رات باہر رہنا ہے۔“ وہ اسے بتانے لگی۔

”یہ جس فرم میں کام کرتی ہوں اس کے مالک کو مجھ پر بہت اعتماد ہو گیا ہے۔“

”ہر ایک فیکٹری خریدنے کے سلسلے میں کوہ مری جابری ہوں پر سوں شام واپسی ہوگی۔“

”آپ بڑھ حیران سی تھی۔“ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ اکیلی جائیں گی۔“

”نہیں! اس کا مجھ کو بھائی مائے گا“ یہ کہہ کر اس کا رنگ سرخ ہو گیا۔ یہیل کے تصور سے وہ شرم و جیا کا پیکر بن گئی۔ غمی نے اس کے جہرے پر بھیجتی ہوئی سرخی کو بغور دیکھا تھا۔

”آپنی؟ اس کا لہجہ تشویش سے پر تھا۔ وہ قابل اعتماد لوگ ہیں نا؟“
 ”بہت ہی زیادہ۔ اتنا اعتماد“ اس کا لہجہ یقین سے پر تھا۔ ”مجھے شاید خود پر بھی نہ ہو۔ اچھا اب باتیں بہت زیادہ ہو چکیں۔ سوچاؤ“ وہ مسکرا کر پیار سے یولی۔
 ”مگر ان باتوں کا بھولے سے بھی گھر میں ذکر نہ کر دینا۔“
 ”غمی زیر لیا ہنسی۔

”اوہ۔ نہیں۔ نہیں ہوگا۔“
 اس کے ہونٹوں پر ہنسی پھیلتی چلی گئی۔

ناشتے کے بعد پورا خاندان ڈرائیگ روم میں صوفوں پر براجمان تھا۔
 سہیل سفری لباس پہنے تیار کھڑا تھا۔ اور چھوٹی شاہدہ کی طرف ہنس کر دیکھ رہا تھا۔
 وہ اس کے بازو سے چپک کر جھپٹ رہی تھی پھر وہ بازو ہٹا ہٹا کر ٹوڑ بھی مٹے جھولا سا جھلنے لگا۔ وہ بڑے معصوم سے تہققے لگا رہی تھی۔
 اچھا بھئی بہت ہو چکا اب چھوڑو وہ شاہدہ کے کالہ پر پیار سے ہلکی سی۔
 تھپکی لگا کر لولا۔

”نہیں بھائی جان! ابھی نہیں“ وہ پیار سے لہلی۔
 ”باقی پھر شاہدہ! —“ ”راہیل اس کی طرف دیکھ کر لولا۔“ انہیں مزدوری
 کام سے جا ملے؟
 وہ برا سامنے بنا کر علیحدہ ہو گئی۔ ارم نے ٹپک کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔
 اور پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھرنے لگی۔
 سہیل؟ راہیل نے سہیل کو دیکھا۔

”جی سچائی حوان؟“

”یہاں آجاؤ۔“

وہ راحیل کی کسی کے قریب جا کر صوفے پر بیٹھ گیا اور اس کی بات کا انتظار کرنے لگا۔

”یہ دستخط شدہ دوسریک ہیں۔ اور یہ ٹرین کے ٹکٹ! — پھر اس نے کچھ کاغذات اس کی طرف بڑھائے۔ یہ سادہ کاغذ ہیں، شاید ضرورت پڑ جائے۔“

سہیل نے حیران حیران انداز میں سب چیزیں پڑھیں۔ اور اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیں۔

”تو کیا ہیں ٹرین سے جانا پڑے گا! —“ وہ سنجیدہ تھا۔ کار سے کیوں نہیں —“

”ہیل کا سفر ہی ٹھیک ہے۔ راحیل اطمینان سے بولا۔

”بہتر! —“ وہ مجبوراً رضا مند ہو کر بولا۔ ”آپ نے جو سوچا مناسب ہی ہوگا۔“

راحیل مسکایا اور اس کے شلے کو ہتھار سے تھپ تھپایا۔

”اب تم جاؤ۔ تمہارا ہم سفر فرم پہنچ چکا ہوگا۔“ وہ پر غلوس آواز میں بولا۔

”ہمسفر —“ سہیل نے زیر لب اس لفظ کو دہرایا جیسے اس پر نشہ چھا گیا۔

”راحیل بیٹے! کہاں بھیج رہے ہو سہیل کو۔ انتظار احمد نے راحیل کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھا۔

”کہہ مری! —“
 ”کہہ مری! —“ کچھ نہ سمجھ کر بولے۔ کیوں آخر؟
 ”وہ ارجمند صاحب میں نا۔“

”ہاں وہ اسٹیل فیکٹری والے جن سے کاروباری معاملات میں ہمارا تھیکڑا سبھی چلتا رہا ہے۔“ افتخار احمد سوچتے ہوئے بولے۔

”جی بالکل دہی! —“ راحیل بولا: ”وہ اپنی فیکٹری بیچ رہے ہیں۔ اور سالی سینی کوثریم میں بیار پڑے ہیں۔ میں سہیل کو اپنی ایک کلرک کے ساتھ فیکٹری کا سودا طے کرنے کے لیے وہاں بھیج رہا ہوں۔ ارجمند چونکہ ہمارے ساتھ فیکٹری فروخت نہیں کرے گا اس لیے سودا کر کے میانہ ہماری کلرک اپنے نام لکھا لے گی بعد میں میں نے نام ہمارے نام لکھا جانے گا۔“

”بہت اچھا پروگرام ہے۔“ وہ غرور و انبساط سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر بولے ”مجھے یہ جان کی بہت ہمتی ہوئی ہے کہ تم اب پیچے بزنس میں نہ لگے ہو۔ مجھے یقین ہے تم اسی طرح لگن سے کام کرتے رہو گے۔ اب تو سہیل بھی تمہارا چلتا بننے لگا ہے۔ اسے بھی سمجھا لگتی ہے۔ سہیل مسکرانے لگا۔

”کیوں ڈنڈی! ہمارے بھتیجا کو کی نا سمجھ تھے! —“ شاہدہ سہیل کی حمایت میں بولی۔

”جیسی تم بڑوں کی باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔“ ارم نے شاہدہ کو پیار سے ٹھٹھا۔ اس کی بات پر سب کے ہونٹ تھیم ہو گئے۔

”میں تو سمجھتا ہوں۔ ہربانی ہے اس کی جو میرا لہجہ بٹانے لگا ہے۔“ راحیل سہیل کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

”ہربانی کیسی بھائی جان! وہ سادات مندی سے بولا۔ اپنا فرض ادا کرنے

• علی لا احسن فرسٹ کلاس میں ان کی ریزرو سیٹ تک پہنچا دیا۔
 قلی کے جانے کے بعد وہیں نے پورے برتھ پر قبضہ کر لیا۔ سانسے کے
 برتھ پر تین متر عرض تھی۔ اندر سے برتھ پر دو پہی گران بیسی تھیں جو عجیب سی
 نظروں سے مشرقی ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کے علاوہ کوئی مسافر کپارٹمنٹ
 میں نہ تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ دم میں ہلکی ہلکی خوشگوار خوشی رہی ہوئی
 تھی۔ جو موسمِ برسات میں نعمتِ شیرِ مرقبے سے کم نہیں ہوتی۔
 وہیں نے اچھی کیس برتھ کے نیچے کھسکا دیا۔ اور اپنے سانسے کھڑی شیلہ
 کی طرف دیکھا۔

• آپ ابھی تک کھڑی ہیں۔ اس کا لہجہ پر تپاک، پُر اخلاق اور سنجیدہ تھا۔
 "تشریف لے گئے نا؟"

• وہ حیران تھی کہ ایک کھلنڈا سا لڑکا ایک اتنا سنجیدہ اور لائق سا ہو گیا
 ہے۔ اس لیے اسے ایک دھماکا، اسکا ناسا دکھ ہوا۔ اور دل کو ہلکا سا حذبِ باقی دھماکا لگا۔ مگر
 اس نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی تھی کہ چلو فعلِ باتوں سے تو جان چھوٹی۔ مگر وہ ملنا
 سوچ کر بھی خود کو مطمئن نہ کر سکی۔ وہ اس کے چہرے پر شرمیلی اور آنکھوں میں شرارت
 دیکھنے کی تمنا کرنے لگی۔ مگر سہیل تو جیسے بالکل ہی بیکل گیا تھا۔ اس نے کوئی ایسی حرکت
 نہ کی جس سے اس کی جھلکی طبع کا اظہار ہوتا۔

شیلہ ذرا پے بہت کر گم مسم بیٹھ گئی تھی۔ اور امین لڑکیوں کو دیکھ رہی تھی
 انہوں نے اسے دوستانہ ہنگاموں سے دیکھا مگر گفتگو کا سلسلہ شروع نہ ہوا۔
 "میں ذرا کچھ رسالے خرید لاؤں۔" وہ اس سے مخاطب ہوا۔ سفر لمبا ہے یونہی
 طے نہ ہو گا۔

• ہوں! — — اس نے مختصر اُلٹا اور وہ پھر متر متر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

جو آپس میں ہنسیوں باتیں کر رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں خاک نہ آ رہا تھا۔ کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں اور کیا سن رہی ہیں۔ امرین گرازا بالکل جانوش نہیں جیسے ان کے گھنے کو کوئی بات نہ کہہ سکتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد سہیل کچھ رسائل لے کر آگیا جو اس نے بڑے دلنشین انداز میں بڑھوپہ پھینک دیئے ماسے سہیل کا یہ انداز بڑا پیارا لگا۔ اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

شبیا: وہ ایک میگزین اٹھا کر دیکھنے لگا۔

آپ نے مجھے کچھ کہا — وہ ایک دم چونکی اور اسے مستفرا نہ انداز میں دیکھنے لگی۔

شبیا: وہ شکر آیا۔

کچھ کرنا بھی سہیل کو — یکبارگی شبلیہ کی تیوری چڑھ گئی: میں ایسی بے تکلفی کو پسند نہیں کرتی؟

جب اس نے سہیل کے چہرے پر نظر دوڑائی تو وہ سمجھ گیا تھا۔ اس سے اسے ہلکی سی تداوت کا احساس ہوا۔ مگر اسے اپنا نام بار بار دہرائے جاتے پر رنج ضرور تھا۔ اور وہ متعجب بھی تھی کہ اسے یہ نام کیسے معلوم ہوا۔ اس نام سے تو اسے صرف کالج ہی میں پکارا جاتا تھا۔ وہ عجیب شش درج کے عالم میں تھی — میں نے آپ سے تو کچھ نہیں کہا۔ وہ اسے تھوڑی دیر گہری نظروں سے دیکھ کر بولا: دیے مجھے یہ جان کو خوشی ہوئی ہے کہ آپ کو شبیا کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اس کی آواز قنات لیے ہوئے تھی۔

یہ نام بتائے گا شکر یہ؟

میں نے یہ نام بتایا ہے آپ کو: وہ مستند تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا

تھا۔ جب وہ اس کی طرف دیکھتی تو وہ اُسے بالکل متین دکھائی دیتا تھا۔ اس کے دل سے آواز اٹھتی تھی کہ یہ بھی اس شروع ترین طبیعت کا ایک شریر ترین رنچ نہ ہو اگر وہ سنجیدہ بننے کی کوشش کر رہا تھا تو بلاشبہ اس کی اداسی قابلِ داد تھی۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔ آپ ہی نے بتایا ہے!۔۔۔۔۔ وہ اُسے گھور کر

بولتا۔۔۔۔۔“

”کیا مصیبت ہے نہ اُسے شاکی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ سہیل کے دل نے چاہا کہ بے اختیار قہقہہ لگائے اور اس وقت تک ہنستا چلا جائے جب تک خبیلی کی شفات آنکھوں میں آئیں تو نہیں آجائے۔ مگر اس نے دل کے اس خفیہ کو جلد ہی مسترد کر دیا۔ وہ غم کر چکا تھا کہ سفر میں اس سے کسی قسم کی شوخی نہیں کرے گا۔

”کہاں ہے مصیبت؟۔۔۔۔۔ وہ بولا: آرام سے تو بیٹھی ہیں آپ۔“

”ہونہہ آرام!۔۔۔۔۔“ وہ طنز سے بولی: آپ کے ساتھ آرام کی توقع فضول

”جیز ہے۔“

سہیل کو یوں لگا۔ جیسے شبیلہ نے یہ غلط نہیں کہے تھے بلکہ کھلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں ڈال دیا تھا۔ اُسے ہلکا سا طیش آگیا۔ اس فضول طنز سے اسے انتہائی رنج ہوا۔

”مس صاحبہ! وہ دیکھیے جوئی کی مقرر تھراپٹ سے بولا: میں آپ کو اپنی طبیعت کو بالکل قابلِ اس کے آرام پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور آپ ہیں کہ الٹا الزام لگاتے رہی ہیں مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔ بہت رنج پہنچا ہے۔ چونکہ آپ میری محفویہ اس لیے میں نے تمام شوخیوں کو ترک کر کے کی ٹھان لی ہے۔ تاکہ آپ یہ خیال نہ کریں کہ سفر میں تکلیف پہنچی ہے۔ میں اس کی بھی معافی چاہتا ہوں کہ پہلے میں آپ کو تنگ کر رہا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے انگلیں رسالہ اس کی نظروں کے سامنے کر دیا۔

اس کے نائیل بیج پر کسی غیر ملکی اداکارہ کی رنگین نقوشیں سکار ہی تھیں اور نیچے لکھا تھا۔
 ”ہالی وڈ کی مقبول ترین اداکارہ شہینا۔“

خبر پڑھ کر وہ انتہائی نادم ہو گئی۔ اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا وہ سنا
 دجاند بیٹھی رہ گئی۔ اسے آزار پہنچانے والے اپنے ردیے پر بے حد رنج ہوا۔ وہ نظریں
 جھکائے خفت کے عالم میں خاموش بیٹھی رہی۔ کچھ کہنے کے لیے اس کے لب کئی بار
 لڑے پلکوں کو کئی بار جنبش ہوئی مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

”اب تو آپ تسلیم کریں گی کہ آپ ہی نے مجھے اپنا پیٹ نام بتایا ہے۔ شاید
 آپ کو گھراور کالج میں اسی نام سے پکارا جاتا ہوگا۔“ بھر وہ گہری اپنائیت سے بولا۔
 دلیہ نام بہت پیارا ہے۔“

اس کے دل نے چاہا کہ اپنی زیادتی کی معافی مانگ لے مگر وہ ایسا نہ کر سکی
 گہری شرم آڑے آگئی۔ اور وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔

”اس سے پہلے کہ آپ معافی مانگیں آپ کو معاف کر دیا گیا۔“ وہ اس کی طرف
 تھوڑا سا جھکا۔ اب اتنی پیشانی بھی اچھی نہیں آپ کو میں نے بھی کافی تنگ کیا ہے
 تھوڑا سا آپ نے تنالیا حساب برابر ہو گیا۔ اب آپ اپنا من مانت کر لیجئے۔“

سہیل کی آنکھوں کی گہرائی دیکھ کر اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اور وہ
 شرم سے لال ہو گئی۔ اب اس کے چہرے پر ندامت کی جگہ شرم کی شفق پھیل گئی تھی
 اور وہ دل خوش کن جذبوں میں ڈوب اورا بھر رہا تھا۔ وہ اس کے اس پر غلوس جذبے
 کو دل ہی دل میں رکھ رہی تھی۔ گزریاں سے اس کا اظہار نہ ہو سکا تھا۔ وہ اس
 کی خوشنودی کے لیے سمنیہ تھا۔ اس نے اسے اپنے موڈ کو کیسر تبدیل ڈالا
 تھا۔ کتنا پر غلوس اورا پنا رکھنے والا لاجراں تھا سہیل۔

سہیل

سہیل
اس کے دل کی دھڑکنوں نے کئی بار یہ نام پکارا۔ اور یہ پکار ادبجی ہوتی
جلی گئی اور شور سے لکل کر لاشعور میں جا پہنچی۔
• شیار •

وہ چونکی اور سہیل نے ہنس کر رسالہ نظروں کے سامنے کر لیا۔ جانے کیوں
اس کے ہونٹوں پر بھی دبی دبی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ وہ چور نظروں سے
اس کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔

گلاڑی نے دسل دیا۔ وہ ٹا ہوا اسٹیشن پر اپنا وقت پورا کر رہی تھی۔ سٹیشن
یارڈ سے باہر نکل کر تیز آگے بڑھ رہی تھی۔ چند میل کے فاصلے پر جا کر وہ
فرانے سمبر نے لگی۔ درخت اور بجلی کے کھمبے اس کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے
دکھائی دے رہے تھے۔ کھیتوں میں سبزہ، سی سبزہ لہلہا رہا تھا۔

سہیل کے دل میں اشکوں کے کنول کھل رہے تھے۔ خواہشوں کے پھول
مسکرا رہے تھے۔ ارمانوں کی لکھیاں چٹک رہی تھیں وہ بے خود سا ہوتا جا رہا تھا۔
ایک وجدانی سی کیفیت اس پر مسلط ہوئے لگی تھی۔ وہ رسالہ نظروں کے سامنے
کیے برقعہ کی دیوار سے ٹیک لگائے رنگین نقوشات کے سحر میں کھویا ہوا تھا۔
ماحول پر ایک کیفیت یا رسکوت چھایا ہوا تھا۔

شبیلہ دیوار کا سہرا۔ ایسے ادنی رسالہ دیکھ رہی تھی۔ کوئی افسانہ اس کے
زیر مطالعہ تھا۔ اب امریکن لڑکیاں بھی آپس میں گھٹگو کرنے لگی تھیں اور بات بات
پر مسکراتے لہکتی تھیں۔ سہیل اور شبیلہ کے درمیان پھر کوئی خاص گفتگو نہ ہو سکی۔ وہ
اپنے اپنے خیالوں میں مگن سفر گزارتے رہے۔ کئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔
جب گلاڑی جہلم کے اسٹیشن پر رکی تو بیچ کا وقت ہو رہا تھا۔ بیرہ آگیا۔

’بچ کیجئے گھاسب : اس نے مودبانہ پوچھا۔
 ’ہوں — لے آؤ — پھر اس نے قبیلہ کی طرف دیکھ کر کہا : دو
 آدمیوں کا کھانا لاؤ۔“

’بہتر خیاب ! —‘ بیرہ لگے بڑھ گیا۔ وہ دوسری مسافر خاتون کی
 طرف بھی متوجہ ہوا تھا۔ مگر وہ اپنی باتوں میں اتنی مشغول تھیں کہ اس نے آگے بڑھ
 جانا ہی مناسب سمجھا۔ اس کے آگے نکل جانے کے بعد ایک مسافر خاتون چونکی اور
 انھوں نے قبیلہ کی طرف رخ کیا۔

’بیٹی ! ذرا اپنے میاں سے کہو کہ بیرہ کو آواز دیں —‘
 خاتون قبیلہ سے بڑے پیار بھرے انداز میں مطالبہ ہوئی۔ قبیلہ اس
 کی اس بات سے کٹ کر رہ گئی۔ شرم سے کئی بل کھا گئی — گہری لاج نے
 اس کی آواز گنگ کر دی — اس کی گردن جھٹی جا رہی تھی۔ — وہ ہر لمحے
 اپنے جسم کو سمیٹتی جا رہی تھی۔ وہ اس کی حالت سے لطف اندوز ہو کر مسکایا اور
 تھوڑا سا گھوما۔

’بیرہ —‘ اس نے بیرہ کو بلند آواز میں پکارا۔ بیرہ بھی زیادہ دور
 نہیں گیا تھا۔ وہ گھوما اور اس کے قریب آگیا۔ ’جی فرمائیے : اس نے ادب سے کہا
 ’وہ آپ کو بلاتی ہیں۔ اس نے مسافر خاتون کی طرف اشارہ کیا۔
 ’جو کچھ ان خاتون صاحبہ نے کہا ہے اب اس میں میرا کوئی تصور نہیں ہے۔
 اس نے تین شرارت کی۔ قبیلہ نے بجا کر شرمیلی آنکھوں سے اسے نظر دیکھا اور پھر
 گردن جھٹک لی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے دل کی دھڑکن
 معمول پر آنے لگی۔ وہ سوچنے لگی۔
 کتنی حسین غلط فہمی ہے۔

کیسا پیارا مقابلہ ہے
کس قدر رنگین تصور ہے۔

سہیل بھی کچھ یوہنی سوچ رہا تھا۔ خاتون نے کیسی سادگی سے شبیلہ کو اس کی
بیوی بنا دیا تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ ان کے درمیان ازدواجی رشتہ نہیں ہے تو
کتنی ندامت محسوس ہو دے۔
بیرہ کھانے کی ٹرے میز پر رکھ گیا۔

گاڑی پھر چل پڑی۔
اردہ کھانا کھانے لگے۔ انہوں نے خاموشی سے پینچ تناول کیا۔ مقرر خاتون
بھی کھانا کھا رہی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر میں ہی کھانے سے فارغ ہو گئے۔ دوسرے
اسٹیشن پر بیرہ رتن اسمٹلے آیا۔ اسے چائے کا آرڈر دیا گیا۔ جب وہ چائے پی چکے
تو بیرہ کو بل دے دیا گیا۔

وہ پھر خاموشی سے رسائل سے صفحات پر نظریں دوڑانے لگے۔ کچھ دیر بعد
سہیل رسالے سے اٹھا گیا اور شبیلہ کو گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ خاموشی سے اس
کے حسن کا نظارہ کرنے لگا۔ اچانک شبیلہ نے نگاہیں پھیر لیں اور اسے اپنی طرف
دیکھنے پر مجبور کیا۔ وہ بھی خفیف سا ہنسا۔

”آپ کب تک پرستی رہیں گی؟ وہ خفت کو بات کے پردے میں چھپا کر بولا۔
”جب تک گاڑی چلتی رہے گی۔“ اس نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔
”اگر گاڑی تمام زندگی چلتی رہتی۔“ وہ بھی اسی انداز میں بولا۔

”تو میں تمام زندگی یوہنی پرستی رہوں گی۔“ وہ شیریں لہجے میں بولا۔
”آپ سفر میں کیا محسوس کر رہی ہیں۔ وہ اسے بغور دیکھ کر بولا۔ ”میرا مطلب

ہے کوئی نئی بات؟“

بھڑی کا سفر ہے کئی بار کیلئے وہ خدا کی پھر لولی : نئی بات کیا ہوگی ؟
 شاید کوئی بڑا : وہ اس کے جواب سے انصرہ ہو گیا
 آپ کا ہمسفر ہوتا ایک نئی بات ضرور ہے : وہ سنجیدگی سے بولی اور سہیل کا
 دل ضرور سے دھڑکنے لگا۔ اور وہ کسی خاص سوچ میں ڈوبا ہوا دکھائی دینے لگا۔
 میں کیسا ہمسفر ثابت ہوا ہوں۔ آخر کار وہ ذہن میں ابھرتے ہوئے سوال کا
 اظہار کر ہی گیا۔ شبیلہ نے اسے غور سے دیکھا

”دل چسپ —“

”اور کچھ —“

”ابھی تو سفر باقی ہے۔ قبل از وقت کیا کہا جاسکتا ہے۔ آنے والا وقت خود ہی
 فیصلہ کر دے گا۔ اس نے متین لہجے میں کہا۔ اور پھر رسالے کے اور اقسام پلٹنے لگی۔ اور
 وہ ذہن کے صفحات دیکھنے لگا۔ جن پر شبیلہ ہی شبیلہ لکھا تھا۔

ایک حسین سفر کی پہلی منزل ختم ہو گئی۔

لاہور سے آنے والی خیر میل راولپنڈی اسٹیشن کے یارڈ میں پہنچ کر رک گئی۔ پلیٹ فارم پر کائی گھاگھی تھی۔ سواریاں ڈبوں کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ گاڑی کے ٹھہرتے ہی سواریاں اترتی اور چڑھتی شروع ہو گئی تھیں۔ سہیل نے قلی کو اشارے سے بلایا۔ اور اسے اپنی کپس اٹھانے کو کہا۔ قلی نے اپنی کپس اٹھا لیا۔ اور ان کے ساتھ ساتھ گاڑی سے نیچے اترا۔

وہ گیٹ سے گذر کر باہر آ گئے۔ اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر کوہ مری کے لیے روانہ ہو گئے۔ ڈرائیور نے قریباً دو گھنٹے میں انہیں مری پہنچا دیا۔ اور وہ کوہ مری کے ٹیکسی سینٹر پر اتر گئے۔ سہیل ڈرائیور کو اس کی مزدوری دے کر فارغ ہوا ہی تھا کہ اچانک اس کی نظر سامنے دوکان سے فروٹ خریدنے والی ایک فیشن ایبل حسین و جمیل لڑکی پر پڑی۔ وہ بھی بالکل گھمی۔ دونوں کی حیران حیران سی نظریں ٹکرائیں۔ پھر دوسرے لمحے حیرت کی جگہ مسترت و خوشی نے لے لی۔

تمثیلہ! — سہیل کے منہ سے نکلا۔

سہیل — تمثیلہ بھی بے اختیار پکارا تھی۔

وہ لڑی ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے، شبیلہ ان کے اس ملاپ سے متوجہ ہوئی اور پیشانی سے ہونگئی تھی اور تمثیلہ کا ڈرائیور انہیں مسکراتی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔
تمثیلہ سہیل کو بڑے تپاک اور جوش سے ملی، اس کے اس جوش نے شبیلہ کو کسی حد تک اندر دھک دیا تھا، اور وہ بھی بھی نظر آنے لگی تھی اس کے خوبصورت چہرے پر تاریک سی پرجھائیاں دوڑنے لگی تھیں۔ سہیل نے گھوم کر اسے ایک نظر دیکھا، اور اندھا بخیدہ ہو گیا۔

آپ یہاں کہاں؟ — تمثیلہ خوش کن موسیقی نواز لہجے میں بولی۔

بہر سوال میں آپ سے پوچھتا ہوں؟ — وہ ہنستے ہوئے برجستہ

بولی۔

شبیلہ انا تعلق سے کھڑی تھی۔

ہم تو ہمیں اپنی کوشش میں سیزن گزار رہے ہیں۔ — وہ مسیحا آواز میں

بولی۔

اور ہم ایک دن گزارنے آ گئے ہیں۔

خوب! — پھر وہ شبیلہ کی طرف مڑی، اس کے چہرہ اور سر آپا کو بھرد

دیکھا جیسے کیوں اس کے چہرہ پر ایک بھینسا سا رنگ بکھر گیا وہ کچھ بخیدہ سی ہو گئی، شاید

وہ اس کی رعنائی دیکھ کر بھجے ہوئی تھی، بہر حال اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا، اور

ہونٹوں پر قہقہہ آمیز دلفریب مسکراہٹ چھپالی۔

آپ کی تعریف! — وہ شبیلہ کی طرف دیکھ کر سہیل سے مخاطب ہوئی

شبیلہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اور چہرہ کئی رنگ بدل گیا وہ شرمائی لمبائی اور انسو

ہو گئی۔ سہیل اسے بھر پور نظروں سے دیکھ کر بولا۔

”یہ میری عزیز ہیں! — سہیل نے بڑی خوبصورتی سے شبیلہ کے قدم میں اضافہ کر دیا۔ اور شبیلہ کو یوں لگا جیسے یہ شوخ سالو نوجوان عالی ظرف انسان تھا۔ قی بلند کردار انسان ہے۔ اس کے دل میں اس کے لیے، قدر اور توصیف کے جذبات پیدا ہو گئے۔ پھر اس نے والہانہ انداز میں اسے ایک نظر دیکھا۔ وہ ایک نظر تو منتظر تھا عرصے سے ایسی ہی نظروں کی خواہش لیے بیٹھا تھا۔ اسے یوں لگا دو تیر تھے کہ چھوٹے میں اتر گئے تھے اور ایسے زخم بنا گئے تھے جن سے ٹیس کا احساس ہونے کے بجائے نشہ دہندہ سے لبریز کسک محسوس ہوتی ہے۔ وہ اس کسک کی لطافت میں کھو گیا۔

تمثیل ذرا سے توقف کے بعد آگے بڑھی اور ہونٹوں پر ہنسی بکھرتی ہوئی کہنے لگی۔

”میں تمثیل ہوں۔ ایک مرتبہ ڈی بیٹ میں حصہ لینے کے لیے لاہور یونیورسٹی چھپی گئی تھی میں سہیل صاحب سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں؟ وہ بنا دنی محبت کا مظاہرہ کر کے شبیلہ سے مخاطب ہوئی۔

”جی! — بڑے ہی دلچسپ آدمی ہیں — وہ سہیل کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولی۔ اور آج تیران کے دل چسپ ہونے کا مکمل یقین ہو گیا ہے۔“

”جی! — تمثیل نے اس چوٹ کو نہ سمجھتے ہوئے انھن سے دیکھا شبیلہ گڑبڑا گئی۔

”میرا مطلب ہے آپ جیسے پُر اخلاق لوگوں سے میل جول یہ ان کے دل۔ چسپ ہونے کا اظہار ہی ہے۔“ اس نے صاف آواز میں کہا۔ اور چہرے پر خوشگوار تاثرات بکھیر لیے۔ وہ اس طنز کو بھی نہ سمجھ سکی اور اپنی تعریف پر مسکائی مگر تمثیل کے برعکس سہیل کے چہرے پر عرقی افعال بکھر گیا تھا اور وہ پیشانی سے سرخ ہو گیا

تھا کہ چونکہ شبیلہ نے تمثیلہ کے نیم عریاں لباس کی طرف دیکھ کر لطیف طنز کیا تھا اسے اس چوٹ کا بھی طرح سمجھ گیا تھا۔ اور شبیلہ سہیل کے چہرے پر نہایت سے لبر پر کشمکش کے آثار دیکھ کر دل ہی دل میں غفلت ہو رہی تھی۔ اسے عجیب سا مزاج رہا تھا۔ سہیل نے ایسی نظروں سے دیکھا تھا جیسے کہہ رہا ہو اس میں میرا کوئی دوش نہیں ہے یہ علامات تو لبس اتفاق ہے۔

”آپ صرف ایک دن کے لیے آئے ہیں، آخر کبوں؟“ تمثیلہ نے بڑھتی ہوئی خاموشی کو توڑ کر سہیل سے پوچھا۔

”جی!۔۔۔“ وہ سنبھلا اور اس نے تمثیلہ کی طرف دیکھا۔ انہیں یہاں ایک اشتہار دی کام ہے اس لیے یہاں آنا پڑا۔ یہ اکیلی نہیں آنا چاہتی تھیں؟ وہ مسکرا دیا۔ اور شبیلہ نے ہلکا سا سر جھکا لیا۔

”ہوں!۔۔۔“ تمثیلہ شیریں لہجے میں بولی۔ ”آئیے پھر گھر چلیں۔“
”مگر اس لیے میرے سے کہا۔ ہم نے ہوٹل میں کمرے بک کر ایسے ہی بھائی جان نے ہوٹل گرینڈ والوں کو مطلع کر دیا تھا۔“

میرے یہاں ہوتے ہوئے آپ لوگ ہوٹل میں نہیں ٹھہر سکتے۔ تمثیلہ نے اخلاص آگیاں لہجے میں کہا: اگر میں نہ ملتی تو عذرا بات سختی۔ ہمارے پاس کافی جگہ ہے می اور میں ہی تو پوری کو سٹی میں رہتی ہیں۔ مجھے آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ سہیل تہذیب میں پڑ گیا اور شبیلہ دل سے چاہنے لگی کہ یہاں تمثیلہ کی بات مان ہی لے تو بہتر ہے۔ اسے ہوٹل میں ٹھہرنے کے نام ہی سے دھت ہوئی تھی وہ ہوٹل میں ٹھہرنے کو اچھا نہ سمجھتی تھی۔ وہ تو ایک مجبوری کے تحت چلی آئی تھی۔

اس نے ایک نظر سہیل کو دیکھا۔ سہیل کے چہرے پر سوچ کی لکیریں بکھری ہوئی

تھیں۔

”آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟“ تمثیلہ ایک دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔
 ”گھر ہی لے جا رہی ہوں کسی عقل میں تو نہیں۔“

تمثیلہ کے آخری جملے پر وہ زور سے چوٹا۔ شبیلہ بھی اس جملے پر زور سے چوٹا نکلتی تھی اور تمثیلہ سہیل کو سنی نیز انداز میں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

”یہ بات تمہیں ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”پھر اور کیا بات ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

ہوئی میں کمرے نہ ٹیلے ہوتے تو اور بات نکلتی: ”وہ متروک ہو کر بولا۔ جب بھائی جان کو یہ پتہ چلا کہ ہم ہوئی میں نہیں ٹھہرے تو ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے گی۔ اور میں یہ نہیں چاہتا۔“

شبیلہ کا اس پہلو کی طرف دھیان ہی نہ گیا تھا۔

”اتنیس ہوئی سے ٹیلیفون کیا جا سکتا ہے۔“ تمثیلہ نے حجاز کی ایک نئی ماہ نکال کر امر کہا۔

”نہیں۔“ سہیل نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ ”میرے نہیں کر سکتا۔“

”یہ پھر اگر کبھی موقع ملا تو آپ کے پاس ضرور ٹھہروں گا۔“

تمثیلہ نے اس کی بات پر برا سامنہ بنایا۔ ”ہوئیوں کو سیکرٹریٹ ٹھاٹھ میٹھا کیا۔ اور کئی ذرا بیٹے بدلے۔ وہ اپنی دانست میں اس ادا کو پٹا حشر سامان سمجھتی تھی۔ مگر سہیل نے اس کے اس غمزے کا کوئی اثر نہ لیا۔ اور نیچے رکھا ہوا اٹیچی کیس اٹھا لیا۔ تمثیلہ جلدی سے گئی۔“

”ڈرائیور!۔۔۔۔۔“ اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھ کر رعوت سے کہا۔

”جی!۔۔۔۔۔“ چپٹی ٹی بی۔۔۔۔۔ ”ڈرائیور فوراً چند قدم آگے بڑھ گیا۔

”یہ اٹیچی کیس اٹھا کر لائی، رکھو۔“ وہ اٹیچی کیس کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”اس وقت تو جالہ می دو تھیلہ؟ وہ گھبرا کر بولا۔ ”پھر مجھی آپ کے گھر ضرور مٹھروں گا۔“
تھیلہ نے نیلے سانچہ چھوٹا سا تھیلہ لگایا۔

وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ تھیلہ بھی تھیلہ کو متوجہ نہ دیکھ رہی تھی
”میں نے آپ کی بات مان لی ہے۔“ وہ ہنس کر لولی ڈرائیو کو اچھی کس
تو دیکھے۔ وہ گاڑی میں رکھے اور آپ لوگ میرے ساتھ چل کر بیٹھیں تاکہ آپ کو جلدی
ہوئل پہنچا دے۔“

”اوہ!۔۔۔“ وہ مطمئن ہو کر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔“

”سبھی! بڑے خشکی ہیں آپ!۔۔۔“ وہ چلتے ہوئے اسے ترجیحی نظروں سے
دیکھ کر لولی۔ اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ آسمان پر یاد دل اُمتد آئے تھے۔ اور تیرہ چھاپنی
شروع ہو گئی تھی۔ سرنگھک پہاڑوں پر کالی گھاٹوں کا منظر بڑا ہی کیف بار تھا۔ وہ آسمان
کی طرف ایک نظر دیکھ کر مسرور سے ہونگے اور تھیلہ کو کو ہساری ہوا کی خشکی سے اپنے جسم
میں کپکپی کا احساس ہولہ سہیل کو بھی سردی محسوس ہوئی۔ سہیل نے تھیلہ کے جسم کی تھر تھرا
کو دیکھ لیا۔ وہ ہاسا اس کی طرف رٹھا۔

”یہاں کا موسم بدلے تو یہ نہیں لگتی۔ آپ تو کوئی گرم کپڑا بھی ساتھ لے کر نہیں آئیں؟“
سہیل نے خلوص سے کہا۔

”وہ مصنوعی انداز میں چونگی۔

”اوہ اس کا مجھے خیال نہیں رہا۔“ وہ اسے اپنے چوری چوری آنے کے بارے
میں تو نہ بتا سکتی تھی۔

”آپ نے بھی تو کوئی گرم کپڑا نہیں پہنا ہوا ہے۔“ تھیلہ نے اس کی طرف دیکھ
کر نرم لہجے میں ہمدردی جتائی۔

”نہی کیس میں میرے گرم کپڑے ہیں، برفی پہنچ کر پہن لیں گا۔“ سہرہ تھیلہ کی طرف

اور بولا۔

”مال پر پہنچ کر آپ کے لیے ایک پل اور کی شاہنگ بھی ضروری ہوگئی۔“
وہ مسکرا کر رہ گئی۔

وہ تمثیل کی شیرازہ میں بیٹھ کر ال پرائے اسٹریٹ نے فاروقی سنٹر سے ایک
پل اور خریدار جسے تمثیل نے دکان میں ہی پہن لیا اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر ٹول گرینڈ
آگے جو ایک اونچے مقام پر واقع تھا۔ ہوٹل کے منیجر نے ان کا پر تپاک خیر مقدم
کیا۔ وہ راحیل کا دست تھا، کمرہ میں پہنچ کر تمثیل نے وعدہ لے لیا کہ وہ پورے چھ
بچے انہیں لینے آجائے گی۔ اس نے انہیں ڈر پر مدعو کیا تھا۔ جسے سہیل نے قبول
کر لیا تھا۔ تمثیل کے ساتھ مل کر انہوں نے شام کی چائے پی۔ اور جب وہ چلی گئی تھ
اپنے اپنے کمرے میں چلی گئی

شام کے چھ بجے تھیلہ اپنی گاڑی میں میچ کر ہوٹل آگئی اور سیرھیوں پر چڑھ کر دوسری منزل پہنچی۔ اس نے سہیل کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔
 ”آجائیے!“ سہیل نے اندر سے آواز دی۔

وہ بڑی نزاکت آفریں انداز میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔
 ”کیا پروگرام بن رہے ہیں؟“ اس نے شانِ دلربائی سے کہا۔
 ”آپ ہی نے پروگرام بنایا ہے!“ وہ اس کی طرف نظریں اٹھا کر بولا۔

”دیکھ لیجئے میں دقت کی کتنی پائیداریوں —“ اس نے ہونٹوں پر دینی جینی مسکراہٹ سجھایا کر کہا۔ ”ذرا بھی دیر نہیں ہوئی؟“

”شکریہ!“ اس نے اخلاق کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ اتنی تکلیف کیوں کر رہی ہیں۔ ہم ڈنر ہوٹل میں ہی کھاتے تھے۔“
 ”اے — سہیل — وہ ہونٹ سیکڑ کر پیارے انداز میں

بولی۔ ”آپ جیسے بڑے لکھ انسان بھی دنیا کی کسی خیالات رکھتا ہے ماؤرن۔
 سوسائٹی میں دعوت کو تکلیف نہیں کہہ سکتا۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ ”میں
 اس سلوک کو کیسے فراموش کروں جو آپ نے میرے ساتھ میں لاہور میں کیا تھا۔“
 ”اخلاق کا تقاضا بھی تو کوئی چیز ہے۔ سلوک کیسا؟“

”تو بھر میرے اخلاق کے تقاضے بھی پورے ہونے دیجئے۔“
 ”ہوں ہن۔“

”چلیے! — گاڑی نیچے کھڑی ہے پھر وہ ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔
 ”وہ آپ کی عزیز کدھر ہیں؟“

”اپنے کمرے میں ہیں۔۔۔۔۔“ وہ سکا! ”بلایےجئے؟“
 ”آپ ہی بلایئے،“ وہ ذرا سنجیدہ ہو کر بولا۔

آئے!۔۔۔

وہ باز آگئے سہیل نے دروازے پر زلی می دتکار ادا دی۔
 ”تشریف لے آئیے! شیلہ نے شائستگی سے ”ارزوی۔“

وہ اندر چلے گئے شیلہ، تمغید کوہ کمر بند یہ۔ مقدم کے لیے کھڑی ہو گئی۔
 ”آئیے تشریف رکھیے!“

”بیٹھنا کا وقت نہیں پلے!۔۔۔۔۔“ وہ کھانڈ پر بندھی ہوئی۔ رستہ پڑ
 کی طرف دیکھ کر بولی۔

”جگہ آپ کو؟“ ”اے! بنا چاہتی ہیں۔۔۔۔۔“ وہ دیکھے لہجہ میں بولی۔
 ”آج آپ میرے ہاں ڈنر کریں گی۔“ ”ممنوع جیہ رستہ سے بلایا۔“
 ”نیوٹن گئی کیا؟“

”یاد ہے۔۔۔۔۔“ ”ایک اسٹریڈ سٹاکا ہو گا،“ ”پر پکھیر کا بونہ۔“

”پھر آپ نے پوچھا کیوں؟“
 ”میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔“ وہ گڑبڑا کر بولی۔ ”آپ سہیل صاحب کو ملے
 جالیئے!۔۔۔۔۔“

”آپ سہیل۔۔۔۔۔ کے ساتھ نہیں ہیں کیا؟۔۔۔۔۔ وہ معنی نیز انداز میں
 بولی۔

”شبیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ شرماسی گئی۔
 ”آپ کیا سمجھ لے بیٹھیں۔۔۔۔۔ سہیل تمثیلہ کی طرف دیکھ کر بولا۔
 ”یہ چلیں گی۔۔۔۔۔“

”تو پھر دپر کس بات کی ہے۔۔۔۔۔ تمثیلہ ہونٹوں کے زادیوں پر بیل کپڑے لگا
 سے بولی۔

”آپ کے لیے فرار کی گنجائش نہیں ہے مس شبیلہ۔ سہیل کا لہجہ شیریں تھا۔
 ”تملوں کو ٹھکرایا نہیں جاتا۔“

اس نے دو تین بار تمثیلہ اور سہیل کو دیکھا۔
 وہ حیدرآباد کا رہنے والا تھا۔ ویسے بھی تمثیلہ کو کسی تنگ میں مبتلا نہ دیکھنا چاہتی تھی
 ”وہ نہیں چاہتی تھی۔ اس کی کوئی حرکت تمثیلہ کو کسی قسم کے غلط اندازات قائم کرنے
 میں مدد دے۔“

شبیلہ اور سہیل نے اپنا کمرہ بند کیا اور نیچے اتر آئے۔ باہر گاڑی کھڑی تھی۔
 آسمان پر بادل کا جم غفیر تھا۔ اور کشمیر کے پہاڑوں پر بجلی چمک رہی تھی۔ کبھی کبھی باد
 بھی گرجنے لگتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کالی کالی ٹھنائیں آجھی برس پڑیں گی اور برستی
 چلی جائیگی مگر وہ بھی برسی نہیں تھیں۔ ویسے بارش کا جلد ہی شدید بارش ہو رہا تھا۔
 ”سہیل نے اچھی کہیں سے قیمتی سوٹ نکال کر زیب تن کر لیا تھا نیلے سوٹ میں۔“

وہ بڑا سمارٹ لگ رہا تھا۔ اس کا سرخ و سفید رنگ گلاب کے پھول کی طرح دیک
رہا تھا اور آنکھوں میں پہاڑوں پر چمکنے والی بجلی جیسی چمک رہی تھی۔
شبیلہ ان ہی کپڑوں میں تھی لیکن وہ ان سادہ کپڑوں میں بھی تمثیل سے زیادہ
رغنا اور دلکش کا حسین پیکر دکھائی دے رہی تھی۔

تمثیل پوری حشر سامانیوں کے ساتھ انھیں لینے آئی تھی۔ اس نے بڑے
پیالے پر میک اپ کیا تھا۔ اور سینٹ اسپرے بڑی افراط سے کیا گیا تھا۔ اس کے
جسم سے خوشبو ہی خوشبو اڑ رہی تھی۔ پالش زدہ انگلیاں بار بار حرکت کرتی تھیں۔ گورے
گورے۔ ہاتھ بار بار ذنا میں لہراتے تھے جسم متانہ لپک کھاتا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ
گہری پوری تھی۔ اس نے اپنی سیدھی جھجج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

تمثیل نے نیچے اترنے اترنے ہونٹوں کھ کھڑا پلے بدلے اور ایسے انداز
اختیار کیے تھے جن سے سہیل اس کی طرف متوجہ ہو۔ نگردہ اس کی طرف ذرا بھی
مائل نہ دکھائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے ہی خیالوں میں کھڑا ہوا ہو اور۔
— شبیلہ سب کچھ دیکھ رہی تھی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ
سی مسکراہٹ تھی۔ اور یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے اسے ان باتوں کی مطلق۔
پر وہ نہیں ہے۔ وہ بے نیاز سی بیٹھی تھی۔

اس کا دل پرسکون تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سہیل تمثیل سے ذرا سی سمجھ بوجھ
ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ مجبوراً اس کے ساتھ
جا رہا تھا۔ اخلاق کے لحاظ سے پر یا کسی کا دل نہ توڑنے کے خیال پر عمل پیرا ہو کر۔
وہ گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گاڑی کے نزدیک پہنچ کر وہ رُک گئی۔
ایک ایک جنبش کے ساتھ سہیل کا بازو بکڑا اور ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا۔
بیٹھے! میرے ساتھ! — وہ دیر بھرے بیٹے میں بولی۔ شبیلہ کا

دھک دھک کرنے لگا۔ اور اُسے تمثیل کی یہ حرکت بہت بری معلوم ہوئی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ اس کے حق پر ٹکڑے ڈالنے لگی ہو۔ اس جذبے سے اس کے دل پر ٹھیس لگی اور اُسے صدمے اور رنج کا شدید احساس ہوا۔

بہرہ خود ہی اپنے اس ناتر پر حیرت کا اظہار کرنے لگی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کے جذبات اس پنج پر کیوں پہنچے اگر تمثیل ایسا کرتی ہے تو کیسے۔ اُسے سہیل سے کیا سرکار، وہ اُس کی کیا لگتی ہے۔ ایک ملازمہ کو ایسے احساسات سے دور ہٹنا چاہیئے۔ ایسا تصور کرنا بھی اس کے لیے رنج و غم کا باعث بن سکتا ہے۔ وہ ایک غریب لڑکی ہے اور وہ رئیس زادہ، آگ اور پانی کا ملاپ نہیں ہو سکتا اور وہ کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ ان کے درمیان چاندی کی دیوار مائل ہے اور وہ اس دیوار کو نہیں چھلانگ سکتی اور نہ اسے یہ کوشش ہی کرنی چاہیئے مبادا وہ اس دیوار سے ٹکرا کر جان دیدے وہ کبھی ایسا نہ کریگی ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔

دل کو سمجھانے کی کوشش کی مگر دل تھا کہ مانتا ہی نہ تھا۔ وہ تمثیل کی سہیل سے بے تکلفی کو کسی طرح گوارا کرنے کو تیار نہ تھی۔ اُسے تمثیل کی ہر حرکت پر شدید تلخی کا احساس ہوتا تھا۔ مگر وہ بھی کیا کر سکتی تھی مجبور ہو تھی اب اسے تلخ احساسات کا زہر پینا ہی تھا۔ اور وہ پی رہی تھی۔ طاقت نہ رکھنے کے باوجود سب کچھ برداشت کیے جا رہی تھی۔ اسے اس خیال سے بھی وحشت ہوتی تھی کہ سہیل اس کے ساتھ پھلی سیٹ پر بیٹھ اور اسے اس بات سے بھی رنج پہنچ رہا تھا کہ سہیل تمثیل کی ساتھ والی جیڈ پر بیٹھا تھا وہ بڑی اچھن، ہند بذب، گومگو اور شش دینچ میں پھنس گئی تھی۔ اس کے چہرے پر کشمکش اور پریشانی کے آثار تھے۔ اس نے سب کچھ برداشت کیا اور صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئی وہ پھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ تمثیل اور سہیل فرسٹ سیٹ پر بیٹھ تھے۔ ایک ایک تمثیل گھومی۔

”آپ کچھ خاموش خاموش سی دکھائی دے رہی ہیں؟ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔
 اے یوں لگا جیسے تمہیلے نے یہ بات کہہ کر اُسے مجھوڑ دیا ہو۔ اس کا دل تیزی سے
 دھڑکنے لگا۔ اور اس نے اس کے میک اپ زدہ چہرے کی طرف بغور دیکھا۔
 ”زندگی کے بعض مقامات ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں پہنچ کر انسان کو خاموش
 ہی رہنا پڑتا ہے۔“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔

اس کے اس جواب سے تمہیلے کے لبوں پر طنز پرست مسکراہٹ پھیل گئی۔
 ”تو آپ ایسے مقام پہنچ گئی ہیں؟“ اس کے لہجے میں چوٹ تھی۔
 شبیلہ خاموش رہی۔ اس نے تمہیلہ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ تمہیلہ اس کی
 طرف حیران حیران سی دیکھ رہی تھی۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“
 ”ہر انسان کو کسی نہ کسی مقام پر پہنچنا ہی پڑتا ہے۔ شبیلہ کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔
 ”اب آپ خود ہی محسوس کیجئے کہ جس مقام پر آپ اچانک پہنچ گئی ہیں وہاں پہنچنے کا آپ
 کو یقین تھا۔ حالات انسان کو کوئی تو مقام دیتے ہی ہیں۔“

اس طنز نے تمہیلہ کا رنگ اڑا دیا۔ اور وہ خاموشی سے گھوم گئی۔ سہیل نے بھی
 پلٹ کر اسے غور سے دیکھا۔ شبیلہ نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اُسے یوں لگا۔
 جیسے سہیل کی نگاہیں کہہ رہی ہوں۔ میری طرف سے تمہیلہ کو کوئی مقام نہیں ملا ہے۔
 تم نے میرے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے۔ ان نظروں سے اس کے دل میں طمانیت کی
 ایک لہر دوڑ گئی اور اس کے بوٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ اترنے لگی جسے تمہیلہ نے
 آئینہ میں دیکھا۔ اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اس نے اسی لمحے گاڑی اسٹارٹ کی اور
 اسے آگے بڑھانے لگی۔

سارا آگے بڑھتی چلی اور وہ بالکل خاموش بیٹھ گئی۔ ریکارڈنگ نے کارماں سے

نیچے ایک گھائی میں اتر دی۔ وہاں رش بالکل نہ تھا۔ اس نے اسپید بڑھائی شروع کر دی اور کد گھائی نامہ سرکہ پر بھاگنے لگی کبھی موڑ آئے کبھی سڑکیں بدلیں۔ آخر کار تمثیلہ نے شیور لیٹ ایک بڑی خوشنما کو سٹی کے گیٹ میں داخل کی۔ اور گاڑی جن سے گزر کر پیدلیک میں اگدرک گئی۔ چھوٹے سے چمن میں بے شمار پہاڑی پھول کھلے ہوئے تھے جن کے رنگ برنگے چہرے بے خوشنما انداز میں ہوا کے جھونکوں کی جھیر لچھاڑے سر ہلا رہے تھے۔ بہت ہی دلکش منظر تھا۔ کوٹھی جدید ماہان آرائش سے آراستہ تھے اسے دیکھ کر راحت اور طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔

تمثیلہ کا سامنے نیچے اتر می اور دروازہ کھول کر سہیل سے مخاطب ہوئی۔

”آئیے! ————— یہ چراس نے تمثیلہ کی طرف نظر پکھائی۔

”آپ بھی اتر آئیے! —————

”اتر رہی ہوں —————“ وہ مسکرا کر یولی ————— ”اب کاریں تو بیٹھی

ہی نہ رہوں گی۔“

اس کی مسکراہٹ اچھ جواب سے تمثیلہ جل بھن گئی مگر چہرے پر کسی قسم کی تلخی کے تاثرات نہ پھیلنے دیئے۔ اس کے برعکس شبیلہ خوش خوش دکھائی دے رہی تھی تمثیلہ کی پریشانی اور انجن سے اُسے فرحت و انبساط کا احساس ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی ہر حرکت سے احساس مسرت ٹپکا پڑتا تھا جسے محسوس کر کے تمثیلہ بے قرار و بے چین ہوئی جا رہی تھی۔

ایک بوڑھا ان کی طرف لپکا۔

”چھوٹی بی بی ————— آپ آئیں ————— وہ شفقت سے بھرے ہوجیس

موڈیانہ بولتا۔

”ہاں امین بابا —————“ اس نے جواب دیا۔

بڑی بیگم آپ کی طرف سے بڑی پریشان تھیں! —۔ وہ محبت

سے لولا۔

”مکیوں! —۔ تمثیلہ کی پیشانی پر حیرت کی سلوٹس بکھر گئیں۔

”موسم اچانک بدل گیا ہے۔“ وہ سیر خلا میں آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔

”خیال ہے زیر دست طوفان آئے گا؟“

”یہاں تو روز ہی طوفان آتے ہیں بابا۔ پھر گھبرا کر کیا؟ یہ کہہ کر اس نے تمثیلہ

کی طرف دیکھا اور تمثیلہ نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ ”عزم اور وقار پھیلایا۔ اور ہونٹوں پر بے پردہ سی مسکراہٹ بسائی۔ تمثیلہ نے اچھی سے تعارف کر دیا۔

تمثیلہ اور سہیل نے مناسب انداز میں انھیں آداب کہا جسے انہوں نے خندہ پیشانی سے قبول کیا۔

تمثیلہ نے تمہارا غائبانہ تعارف کرا دیا تھا۔ انہوں نے سہیل سے مخاطب

ہو کر کہا: ”تمثیلہ جب ڈی بیٹ میں حصے کر لیا ہو تو سہیل کو تو تمہارے

حسن سلوک سمجھتا تھا تو اب تو سہیل کو تعریفیں کرتی تھی۔“

”ان کی ہنسی ہوتی ہے۔ وہ ادب و اخلاق کو ملحوظ رکھ کر بولا۔ ”رنہ میں تو خود کو

کسی قابل نہیں سمجھتا۔“

”آپ کو قابل بنا دیا جائے گا، تمثیلہ نے ادا سے کہا۔ اور تمثیلہ کیوں لگا جیسے

اس کے دل پر کسی نے بھاری پتھر رکھ دیا ہو۔ اس کی تمام لاپرواہی رخصت ہو گئی اور

اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ چہرے پر اضطراب پھیل گیا۔ خوشی میں ڈوبا ہوا

چہرہ اندر دھک دھک گیا۔ دل کا سکون اور طمانیت یکایک غائب ہو گئی۔ وہ توانائی دانست

میں تمثیلہ کو شکست دے بیٹھی تھی۔ مگر تمثیلہ کی اچانک اس تبدیلی نے اسے گھرا دیا۔

تمثیلہ کے دل میں ابھرنے والے عزم نے اسے پھر سے مضطرب سا کر دیا۔ اس کے

حوصلے کی دیوار میں دراز پیدا کر دی۔

وہ چلتے ہوئے ایک گیلری سے گزرے اور پھر ایک لاؤنچ پارکر کے ڈرائیونگ روم میں آ گئے۔

ان کے چہرے پر خوشی اور ہنٹوں پر ایک دلنشین مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس عورت کا لباس بھی نمیشلہ کی طرح نیم عریاں تھا۔ اس عمر میں یہ لباس معمولہ خیز سا۔ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھی میک اپ میں رنگا ہوا تھا۔ وہ بھرے بھرے جسم والی درمیانہ قد کی عورت تھی۔ گورا چارنگ روپ جو کبھی خاما پر کشش رہا، ہوگا اب راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی طرح ہو کر رہ گیا تھا۔ چنگاری جسے مغربی تہذیب کے سہارے شعلہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

اپنی بیٹی کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھ کر بولی — بڑی دیر کر دی تم نے؟

”دیر تو کچھ بھی نہیں ہوئی ممتا! — ذہ پیار سے اپنی ممتا کو پٹ کر بولی پھر اس نے ان سے علیحدہ ہو کر رخ موڑا۔ اور سہیل اور شبیلہ کی طرف ایک نظر دیکھا —“

تمثیلہ کی ممتا نے شبیلہ کی آمد سے کسی طرح کی خوشی محسوس نہ کی تھی، ان کے سر د اور خشک سلوک نے اسے اور بے تاب کر دیا تھا۔ وہ یہاں آ کر اپنی تفہیم محسوس کر رہی تھی۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ اپنے آپ پر بھینچا لے لگی تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے یہاں آنے کی غلطی کیوں کی۔

”یہ لڑکی کون ہے سہیل؟“

تمثیلہ کی ممتا نے شبیلہ کی طرف بے پردہ ہی سے اشارہ کیا۔

”یہ میری عزیز ہیں۔“ وہ دھیمے دھیمے لہجے میں بولا۔ شبیلہ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اسے

انتہائی کوفت اور ندامت کا احساس ہو رہا تھا جو اسے پریشان کر رہا تھا۔
 کس قسم کی عزیز ہیں؟ — وہ دھیمے لہجے میں بولیں۔ میرا مطلب
 ہے کیا رشتہ ہے؟

وہ چند ثانیے خاموش رہا۔ اس کی نگاہیں تمثیلہ کی طرف اٹھیں جس کے چہرے
 پر کش مکش کے آثار تھے پھر اس نے شبیلہ کو دیکھا جو محبوب و پریشان کھڑی تھی۔ آخر
 کار اس کی نگاہیں تمثیلہ کی محی کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔
 ”میرے انکل کی لڑکی ہیں: وہ بڑے ادیب سے بولا۔

”ہوں۔“ پھر وہ اس طرح چونکیں جیسے انھیں کچھ یاد آگیا ہو۔
 ”تم لوگ کھڑے کیوں ہو، بیٹھو نا“

وہ سب قیمتی صوفوں پر بیٹھ گئے۔ شبیلہ بیٹھنے کو تو بیٹھ گئی تھی مگر اُسے نرم نرم
 صوفہ کیوں کی طرح لگ رہا تھا۔ جو اس کے جسم میں اترتی چلی جا رہی تھیں اور اس کی
 روح میں ہر ساعت نیاز خم بنا رہی تھیں۔

”آپ کچھ کھوئی تھوئی سی لگ رہی ہیں“ تمثیلہ اس کی حالت سے لطف لے کر بولی
 اس نے نظریں اٹھا کر اس کے مسرور چہرے کو گہری نظروں سے دیکھا۔
 ”کنفیوشنس کا مقولہ ہے انسان کو اپنے آپ میں گم رہنا چاہیئے۔“ اس نے
 لاپرواہی سے جواب دیا۔

”خوب! آپ کا مطالعہ خاصا معلوم ہوتا ہے۔“ تمثیلہ نے اپنی دانت میں
 طنز کیا۔ مگر شبیلہ کی سنجیدگی اتنی رٹھ چکی تھی کہ اس نے طنز کا ذرا بھی تاثر نہ لیا۔
 ”مطالعے کے بغیر لوں لگتا ہے جیسے انسان تاریکیوں میں زندگی گزار رہا ہے۔“
 وہ گہری آواز میں بولی۔

”تو آپ روشنیوں کے بیچ زندگی گزار رہی ہیں، تمثیلہ نے پھر طنز کیا۔

”اگر آپ کی نظر میں میرا مطالعہ خاصا ہے۔ تو یوں ہی سمجھ لیجیے۔ اس نے عیب سے لہجہ میں کہا۔

”ہوں“ تمثیلہ صوفے پر پہلو بدل کر بولی۔

پھر ایک گہرا سکوت کمرے میں پھیل گیا۔

”چھوٹی بی بی“ لڑکھڑکے میں آکر مودبانہ بولار۔ ”آپ کے دوست آئے ہیں“ انھیں اندر بھیج دو۔

چند لمحوں بعد تین لڑکھڑکے میں داخل ہوئے وہ ان کے استقبال کے لیے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ہیلو! میجر فیاض“

”ہیلو! یکین رشید“

”ہیلو لیفٹنٹ! اشتیاق“

تمثیلہ نے باری باری ان کے نام پکارے۔

”ہیلو بس تمثیلہ۔ وہ ایک زبان ہو کر بولے۔ پھر چند ثانیوں میں سب کا تعلق ہو گیا۔

تمثیلہ ان کی آمد سے گھراسی گئی تھی۔ وہ ایسے ماحول کی عادی نہیں تھی اس لیے اس کا گھیرانا ایک فطری امر تھا۔ سہیل نے بھی ان کی آمد کو برا بھلا نہیں کیا تھا۔

اور وہ چہرے سے کبیدہ خاطر دکھائی دے رہا تھا۔ تمثیلہ اپنے نئے بھائیوں سے باتوں میں مشغول تھی۔ اس لیے وہ سہیل اور تمثیلہ کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثرات کو نہ دیکھ سکی تھی۔

جب رات کا اندھیرا اچھی طرح پھیل گیا اور بتیاں روشن ہو گئیں تو انہوں نے۔

شاندار ڈرائنگ روم میں جا کر ڈنر کیا۔

خوشبودار کا پیپے کے بعد ڈرائنگ روم میں آگئے۔ تمثیلہ کے دوستوں نے

بھی مس تشیلہ سے زندگی کا مفہوم سمجھ لیجئے۔

وہ اس طنز سے چونکا اور تادم سا ہو گیا۔ جھٹے کا رنگ اس کے چہرے کو کانوں تک سرخ کر گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے تشیلہ نے اس پر طنز ہی نہیں کیا بلکہ اس کے سینہ میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ وہ لیکام لکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب ہمیں جانا چاہیئے۔“

کچھ دیر تو اور رک جائیئے۔ تمغیلہ شیریں لہجہ میں بولی۔

”نہیں۔ صبح ہمیں بہت ضروری کام ہے۔ جلدی اٹھنا ہے۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”سہیل وہاں سے جلد سے جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ جہاں شرافت جیسے نام کی کوئی چیز اسے نظر نہ آئی تھی۔ اس ماحول نے اسے بیزار کر دیا تھا۔ وہ پریشان اور کینہہ خاطر ہو گیا تھا۔ اس پر ایک وحشت اور گھبراہٹ سی طاری ہو گئی تھی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ تشیلہ کو یہاں لاکر اپنی نظروں میں خود ہی گر گیا ہے۔ تشیلہ کے طنز سے اس نے گہری ندامت محسوس کی تھی۔ تشیلہ کو اسے اس جگہ لانا نہ چاہیئے تھا۔ اگر اسے ایسے ماحول کا ذرا بھی احساس ہوتا۔ تو واقعی وہ کبھی تشیلہ کو اس جگہ نہ لاتا۔“

”تو آپ جا لے پھر بعد ہیں۔“ تمغیلہ اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔

”جی ہاں۔“

”تو پھر چلیے میں آپ کو چھوڑ کر آتی ہوں۔“ وہ اپنے لیے یہ اکتاہٹ کو کم کر کے پیار سے بولی۔

”آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔ ڈراما یڈر سے کہئے چھوڑ آئے گا۔“ وہ اس کے ساتھ جاتے ہوئے گھبراہٹ سی محسوس کرنے لگا تھا۔

”میرے ساتھ جاتے ہوئے آپ کو کیا تکلیف ہے؟“

”نہیں — نہیں تکلف تو نہیں۔“
 ”کچھ تو ہے آخر۔ جو آپ کو ڈرائیور یاد آیا ہے؟“
 ”نہیں میں تمثیلہ — میں نے تو آپ کی تکلیف کے خیال سے کہا ہے۔“
 ”میری یا اپنی عزیزہ کی تکلیف کے خیال سے؟“
 ”یعنی — سہیل چونک کر بولا۔
 ”یہی کہ شاید وہ میرے ساتھ آپ کی ہم نشینی پسند نہ کریں۔“
 ”جی نہیں — مجھے ایسا کوئی غم نہیں —“ ”تمثیلہ نے ٹھہر ٹھہر کر
 پر اعتماد لہجہ میں کہا۔

اور وہ نفرت سے منہ سیکڑ کر رہ گئی — اور اس کی حالت اس لحظہ
 کی سی تھی جسے الزام بتائے بغیر سزا دی گئی ہو۔
 ”تو پھر چلے —“ سہیل بالآخر بولا۔
 ”تمثیلہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اسخوں نے مناسب الفاظ میں تمثیلہ کی محی سے اجازت لی۔ اور ڈرائیونگ
 روم سے باہر آ گئے۔ وہ اپنے اپنے خیالوں میں گم چلے ہوئے پورٹیکو میں آئے
 تمثیلہ نے پھر مندر کے سہیل کو اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھایا۔ جب تمثیلہ
 پچھلی سیٹ پر آرام سے بیٹھ گئی تو اس نے ٹکاڑھی اشارت کر دی۔ تمثیلہ کی
 کوسٹھی سنسنی ٹنک کے علاقے میں واقع تھی۔ وہاں سے گریڈ ہوٹل کا
 مناصلہ تین میں تھا۔

وہ عید ہی گریڈ ہوٹل پہنچ گئے۔ اور اس نے اسخیں ہوٹل کے کمپاؤنڈ
 میں اتار دیا۔

”شکریہ —“ سہیل نے اخلاقاً کہا۔

"تشکر یہ کی کیا بات ہے۔" وہ موسیقی نواز غمزے میں بولی،
 "میں تو سوچتی ہوں جیسے میں آپ کے لیے کچھ بھی نہ کر سکی۔"
 "کھانا کھلا دیا۔ پھر ہوٹل پہنچا دیا۔" وہ اخلاق آمیز طنز سے بولا۔
 "ابھی آپ نے کچھ کیا ہی نہیں؟"

سہیل اپنے دروازہ کے قریب پہنچ کر یکایک پلٹا۔ اور تہمتہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا شبیلہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ شبیلہ قدموں کی آہٹ سے چونکی اور پلٹ کر دیکھا اس کے چہرے پر حیرت اور ہلکی سی دہشت کے آثار تھے۔

”آپ! — وہ لیجے کی لڑخی کو قابو کرتے ہوئے بولی۔ ”میرے کمرے میں؟“
 وہ یہ کہہ کر اپنی بات کا رد عمل اس کے چہرے پر دیکھنے لگی مگر اسے سہیل کے چہرے پر کتنی قسم کی گھبراہٹ دکھائی نہ دی۔ وہ ہونٹوں پر ایک حسین مسکراہٹ لہرائے کھڑا تھا۔

”جی ہاں! میں آپ کے کمرے میں“ وہ بے پردائی سے بولا۔ شبیلہ نے اس کی شوخی کو کھٹکتی نظروں سے دیکھا

رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ اس وقت آپ میرے کمرے میں کیا لیٹائے ہیں۔ وہ ہلکی سی گھبراہٹ کے تحت بولی۔

”میں کچھ لیٹے نہیں آیا ہوں“ وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے اپنی ابھرتی ہوئی

خطری شہنشاہ کو فوراً دبا لیا کیونکہ اسے یاد آگیا تھا کہ وہ اپنی شرارتوں کو چھوڑنے کا اس سے وعدہ کرچکا ہے۔

”تو پھر —“ وہ حیرت اور پریشانی سے بولی
 ”پھر یہ کہ آپ کے پاس کوئی سیلنگ ڈریس نہیں ہے : وہ مطمئن لہجے میں بولا۔
 ”رات کو آپ سوئیں گی تو اس سادھی کاستینا تاس ہو جائے گا : اس نے اس کی سادھی
 پرنٹس جمدیں۔ اگر آپ چاہیں تو میرا سیلنگ سوٹ لے سکتی ہیں، میرے اچھی کیس میں
 دو سوٹ ہیں“

وہ خاموش ہو گیا۔

شبیلہ کا چہرہ شرم و حیا کی وجہ سے سرخ ہو چکا تھا۔ وہ لگا گئی۔ اُسے شرم و حیا کا
 شدید احساس تھا۔ اس کا سر خود بخود جھک گیا اس کی نظریں اٹھ نہیں رہی تھیں ماس
 کے اس انداز پر سہیل کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کا یہ اندازہ محشر بڑا مان تھا۔
 نقشہ انگیز تھا۔ شبیلہ اٹھا اور وہ نشہ و سرور میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

”مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اور لہجہ
 متین تھا۔ میں اس طرح سونے کی عادی ہوں۔ میری سادھی کو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ
 تشریف لے جائیے مجھے فائدہ پہنچا رہی ہے۔“

اس کے ان الفاظ سے اسے دکھ سا پہنچا۔ اور اس نے کربناک انداز میں اس
 کے سر پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ایک گہرا سانس لیا اس کے چہرے پر لگی سی حزن و ملال کی لہر چھا گئی
 ”آپ میری روح کی گہرائیوں میں کبھی نہ جھانک سکیں گی شاید ! اس نے اتنا کہا
 اور تیزی سے پلٹا۔ پھر اس کے قدم اپنے کمرے میں آکر رک گئے۔ اس نے سوچا تھا فولاد
 ذرا نرم کھائی دیا تو وہ اپنے چلتے ہوئے جذبات کی ضرب سے اسے اور نرم کرنے کی ..
 کوشش کرے گا۔ مگر فولاد کی سختی تو اپنی جگہ برقرار تھی۔

سلیگ سٹ چہرہ۔ شب از ہو کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن بہت
 سی بے چین کروٹیں بدلنے کے بعد بھی اسے نیند نہ آئی۔ اس کے سینے میں بڑا دکھ
 رہی تھی۔ اور دل میں بے کلامی اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ خیالات کی گہری ٹوٹتی جا رہی
 تھیں۔

ساتھ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ چہاڑوں پر بار بار بجلی چمک رہی تھی جس سے درخت
 اور پہاڑ نمایاں ہو جاتے تھے۔ اور ایک دلکش منظر ابھرا کرتا تھا۔ اس کے دل میں
 درد بھرا ہوا تھا۔ اسے قدرت کی یہ دلکشی اس وقت بڑی محسوس ہوئی۔ اور اس نے
 اٹھ کر جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔

وہ پھر سلیگ پر آکر لیٹ گیا۔ وقتاً بابت فضا میں سیٹیاں سی سجھنے لگیں۔ ہوا انتہائی
 تیز ہو گئی تھی۔ باد و باران کا شدید طوفان اٹھ اٹھا۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک میں
 اضافہ ہو گیا تھا۔ کوہساری فضا وحشت انگیز انداز میں چپنے لگی تھی۔ مگر اس کے
 دل سے ابھرتی ہوئی آواز کو بڑے سے بڑا طوفان بھی نہ دبا سکتا تھا۔ اسے اپنے دل
 کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ شبیدہ تم سے کسرتی ہے خون کھاتی ہے شاید
 وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی تمہاری نہ بن سکے۔ شاید تمہارے ذہن میں جھلکاتے ہوئے
 رنگین تصورات حقیقت کا جامہ نہ پہن سکیں۔ تمہاری محبت اظہار سے پچھلے ہی شاید
 موت کی دلدلوں میں سو جائے۔ اور تم تمام زندگی کھٹا منوس ملنے کے لیے تنہا رہ جاؤ۔
 نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ کبھی نہیں ہو گا۔ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ میں اپنی
 محبت کی شمع اس کے دل میں فروزاں کر کے ہی رہوں گا۔ میں اس سے الگ نہیں رہ
 سکتا۔ اور نہ وہ مجھ سے جدا رہ سکتی ہے۔

وہ اپنے دل میں ابھرتے ہوئے اسی عزم کو تقویت پہنچانے کے لیے نئی راہیں
 سوچنے لگا۔ وقت گزرتا رہا۔

رات گزر رہی تھی۔

تیز ہوا کی تھار کے مطابق اس کے خیالات بھی دعاں دعاں تھے۔
 پھر چلنے کب اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ سینوں کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔
 صبح جب وہ بیدار ہوا تو کمرے میں سورج کی سنہری سنہری کرنیں خشتوں سے
 چھن کر آتی ہوئی دیواروں پر اڑے ترچھے طلائی نقوش بنا رہی تھی۔ اور ان کے بیچ۔
 لہراتے ہوئے ننھے ننھے ذرات بڑے پیارے لگ رہے تھے۔

وہ کمرے میں دھوپ کی کرنیں دیکھ کر جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ اور باتھ روم میں۔
 جا کر جلدی سے منہ ہاتھ دھویا۔ اس کے بعد اس نے کپڑے تبدیل کیے اور تیار ہو کر باہر
 نکلا۔ گو وہ تمام رات سو نہ سکا تھا۔ پھر بھی چند گھنٹوں کی نیند نے اسے کافی ہتاشی۔
 ہتاشی بنا دیا تھا۔ اور اس کے چہرے پر کسی طرح کی کشمکش اور تردد کے آثار نہ تھے۔
 وہ شبیلہ کے کمرے کے دروازے پر آکر رک گیا۔ اور آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔
 "کون؟" اندر سے میٹھی سی آواز آئی۔

"سہیل!۔۔۔ اس نے خوشگوار لہجے میں مختصر آجھا۔" کیا آپ تیار ہو چکی ہیں؟
 "میں تیار ہوں! آجائیے۔"

وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ شبیلہ نے منہ دھونے کے بعد باتھ روم سے
 باہر آکر دروازہ کا شتر اُتار دیا تھا۔ اور بال سنوارنے لگی تھی۔

جوں ہی سہیل کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ پرش ویش پر رکھ کر سنگھار
 میز کے آئینے کی طرف سے گھومی اور اس کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔
 "معلوم ہوتا ہے رات آپ آرام سے سوئی ہیں۔" وہ اپنے لہجے کو شیریں بنا
 کر بولا۔

"کیا آپ آرام سے نہیں سو سکے؟" وہ دبی دبی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر بولی۔ وہ اس

اس انداز سے مسرور ہو گیا۔ اور اسے گہری نظروں سے دیکھ لگا۔ غلام تو فتح شہید کا
مورڈ بہت خوشگوار تھا۔ وہ مسکرایا۔

”اگر آرام سے نہ بھی سو سکا ہوں تو آپ کو اس سے کیا؟“

”کیا ایک ہمسفر ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ پوچھنے کا حق نہیں بنتا؟“ اس نے
نظریں اٹھائیں۔ ”آپ نے بھی تو ابھی ابھی ہمسفر کی حیثیت سے ہی میرے سونے کے
متعلق پوچھا تھا۔“

”ایک کو دوسرے ہمسفر کا خیال رکھنا ہی چاہیے۔“ پھر وہ ڈرا کا اور حوصلہ کر کے
بولتا۔ ”مگر مجھے تو اس سفر میں یوں لگتا ہے جیسے ہمسفر مجھ سے دُور دور رہنا چاہتا ہو۔
جیسے میں کوئی بلا ہوں۔“ اس نے آخری جملہ ایسے مذاحیہ انداز میں کہا کہ وہ بے اختیار
کھل کھلا کر ہنس پڑی

”یہ آپ کا دہم ہے۔“ وہ شیریں لہجے میں بولی۔ اگر میرے دل میں ایسے خدشات
ہونے تو میں آپ کے ساتھ سفر ہی نہ کرتی۔ آپ کے ساتھ تنہا یوں مری نہ چلی آتی۔
پھر وہ یکایک سنجیدہ ہو گئی۔ ”میں اس حد تک ہی قریب رہنے کو پسند کرتی ہوں جس
حد تک کہ شرافت اجازت دے۔“

”ہوں۔“ سہیل نے اتنا کہا اور خاموش ہو گیا۔ اس نے اس کے اظہارِ
خیالات کو اپنی سنجیدگی سے پھر سنا دیا تھا۔ اور وہ شہید کے چہرے پر یکایک پھیلی
ہوئی سنجیدگی کو دیکھ کر پھر کچھ کہنے کی حیرت نہ کر سکا تھا۔ اس نے ایک تھنڈی
آہ بھری اور اسے چند لمحوں گہری گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔

”چلیے! ناشتہ کر لیں۔ پھر کام کے لیے بھی جانا ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں
بولتا۔ شہید نے کھکیوں سے اس کے چہرے پر اچانک پھیل جانے والی افسردگی کو دیکھا۔
اس سے اسے دھیمے سے قلعی کا احساس ہوا۔ مگر اس نے اس احساس کو جلد ہی دبا دیا

شبیلہ
سہیل

کے چہچہے، پیچھے ملتے ہوئی ہوٹل میں آگئی۔ وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھے ہی پیرہ آگیا۔ سہیل نے اسے ناشتہ لانے کو کہا۔ ہال میں زیادہ رونق نہیں تھی۔ شاید پہاڑوں پر آکر سکین ڈھونڈنے والے ابھی بیدار نہ ہوئے تھے۔ اسمین اپنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہ تو وہاں سیر و تفریح کے لیے آئے تھے۔ اس زمانے کا انسان کتنا آرام طلب اور عیش پرشش ہو گیا ہے۔ دولت کی فراوانی نے انسان سے محنت چھین کر اسے سستے اور کاہل بنا دیا ہے۔ اس کی رنگ رنگ میں بے حسی اور آرام طلبی کی لہر دوڑا دی ہے۔ شبیلہ غالباً سنجیدگی سے یہی سوچ رہی ہے۔

پیرہ آگیا اور ناشتہ میز پر لگا کر چلا گیا۔ وہ خاموشی کے عالم میں ناشتہ کرنے لگے۔ جیسے ہی وہ ناشتہ سے فارغ ہوئے شبیلہ آوارہ ہوئی۔ اس کی آند کو دونوں نے بیزاری سے قبول کیا۔ مگر رسمی آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے انہوں نے کسی طرح کی ناگواری کا اظہار نہ ہونے دیا۔

”آئیے! — سہیل کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ چائے پیئے گا۔“
”نہیں —“ وہ چمکی: ”میں ناشتہ کر کے آئی ہوں۔ جبرست ہے آپ لوگ اتنی صبح اپنے کمرے سے نکل آئے ہیں آپ لوگوں کو اوپر ڈھونڈ کر ہال میں آئی ہوں۔“

”آپ ابھی صبح کبہر رہی ہیں، گھڑی کی طرف دھیان دیجئے“ وہ بولا۔
”نہیں، یہ ہیں افدگر میوں میں تو کافی دن چڑھے بیٹھے ہیں۔“
شبیلہ شبیلہ کو نظر انداز کئے اس سے باتیں کئے جاری تھی۔

اب آپ کہاں جائیں گے، تھیلہ موضوع بدل کر بولہ
 انہیں: اس نے شیلہ کی طرف اشارہ کیا: "ساتھی سنی لوٹیم میں ایک شخص سے
 دل کر فیکٹری کی خرید کے سلسلے میں بات کرنی ہے۔ وہیں جا رہے ہیں۔"
 "تو بھر چلیے!" وہ جلدی سے بولی۔ "میری گاڑی حاضر ہے۔"
 اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ اس نے انگساری سے کہا: "ہم ٹیکسی میں
 چلے جائیں گے۔"

"پھر وہی جی جملانے کی باتیں: وہ ہونٹوں کے کئی زاویے بدل کر بولی۔
 اب چلیے بھی نا؟ اس نے بڑی ہی بے تکلفی سے سہیل کے بارود تھام کر اسے باہر کی
 طرف کھینچا۔ اس کے اس انداز سے شیلہ کے چہرے پر ناگاری کی لکیریں ابھر آئیں۔ اور
 اس کے چہرے سے نفرت جھلکے لگی تھی۔ سہیل نے اس کی طرف نظر دوڑائی۔ خود اس
 کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ چپس گیا ہو۔ اور مجبوری میں یہ سب کچھ بردہ
 ہے تھیلہ نے بھی اس کی طرف دیکھا مگر ایسی نظروں سے جس میں فاتحانہ چمک تھی۔ اس
 کا چہرہ مسرت میں ڈوبا ہوا تھا مگر اس نے اس کے اس انداز کا کوئی تاثر نہ لیا۔ وہ اپنے
 مقام پر بالکل سنجیدہ تھی۔

دن روشن اور چمکیلا تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا: ناشپاتی
 سیب اور خربانی کے درخت پھلوں سے لڈے ہوئے کوہساری ہوئے سرگوشیا
 کندہ تھے۔ چیرمہ کے درختوں کے جھومر دھنوں کی پیشانی پر جھلکاتے ہوئے مجھومر
 کی طرح دھوپ میں دمک رہے تھے۔ لبلبے چنار ان کی طرف حسرت سے تکتے ہوئے
 محسوس ہوتے تھے۔

دند سکرین سے مہن کر آئے والی چند ٹریڈ کریں شیلہ کی زلفوں کو چومنے لگی
 تھیں۔ تھیلہ اور سہیل دھوپ میں نہائے ہوئے تھے۔ اور ان کے سالیوں سے بچنے والی

وہ اہمہ آوازیں اس لیے باقی کر رہی تھیں کہ شبیلہ نہ سن سکے۔ اور ان کی طرف سے
مشکوٰۃ ہی رہے۔

شبیلہ کا انداز سرد تھا۔

وہ لائق سی بیٹھی تھی۔

”میرا یہ مطلب تو نہیں،“ سہیل ذرا سا اس کی طرف رخ پھیر کر بلند آواز میں بولا۔
”میں نے تو کہا تھا کہ ہم ٹیکسی میں چلے جائیں گے۔ آپ خود ہی امرار کو کسے لے آئی ہیں؟“
اس جواب سے وہ بھیلا سا لگتی اور اس نے آنکھیں پر نظر ڈالی اسے شبیلہ کے چہرے پر ایک
تلخ سی مسکراہٹ ابھرتی محسوس ہوئی اور اس مسکراہٹ نے اس کے دل میں نفرت کی
ایک لہری دوڑادی۔

”آپ تو ہر بات کا مطلب الٹ ہی سمجھتے ہیں،“ اس نے چلانے کے سے انداز میں
تکلف سے کہا۔ وہ جھلانی جا رہی تھی، اس جھلاہٹ میں اس نے گاڑی کی رفتار بھی بڑھا دی
تھی۔ وہ شبیلہ کو جھلانے اور تڑپانے میں نالام ہو گئی تھی۔ اور اسے شبیلہ کے چہرے پر لہرائی
ہوئی مسکراہٹ نے بے کل کر دیا تھا۔ وہ گہرے انداز میں ڈوب گئی تھی۔ ہر لمحے گاڑی
کی رفتار بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

یہ بھی نفرت کے اظہار کا ایک رخ ہے۔

شبیلہ یہی سوچتے ہوئے متبسم تھی۔

گاڑی موڑ کاٹتی تو اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور ادھر ادھر چھل جاتے۔ اس کے
باوجود اس کی رفتار میں کمی نہ ہو رہی تھی۔

”میں شبیلہ پہاڑی علاقہ ہے رفتار ذرا کم رکھیے!“ اس نے تشویش پور
ہجے میں کہا۔ شبیلہ نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔ تنقوڑی دیر خاموش رہی۔
”کیوں! جان بہت پیاری ہے!“ وہ جوش سے بھڑکتھراتے

بچے میں بولی

جان کھے پیاری نہیں ہوتی ! ————— سہیل نے بے پردائی سے۔

جواب دیا۔

۔ مگر اس پیاری جان کو کس کے لیے بچا کر رکھنا چاہتے ہیں آپ ! —————

اس نے سخی خیز لہجے میں چوٹ کی۔ اور آئینہ میں شبیلہ کے عکس کو خشکیوں نظر دے دیکھا۔

سہیل کے ہونٹوں پر ایک عریب سی مسکراہٹ لہرانے لگی۔

”اپنے لیے ————— پھر وہ صیغے لہجے میں بولا۔ بقول ارسطو۔ زندگی بہت ہے۔

بڑی نعمت ہے اور جو اس نعمت کی قدر نہیں کرتا، انتہائی بد بخت انسان ہے :

۔ تو میں بد بخت ہوں۔ تمہیلہ کے ہونٹوں پر زہرین بھی ہوتی تلخی نمایاں ہو گئی۔ اس

کے چہرے پر یکایک دشت خود کرائی۔ چہرہ سرخ ہو تا عباد ہوا تھا۔ اور نکلیں نم آلود سی ہو گئی تھیں۔ اس کے چہرے سے ذہنی خلقتا ر نمایاں ہو رہا تھا۔

سہیل یہ حالت دیکھ کر کانپ گیا۔ اسے ڈر ہوا کہ کہیں تمہیلہ اپنا ذہنی توازن بھی نہ کھوے اور گاڑی کسی گہری کھد میں جا گرے۔ اور ان کا رشتہ ہمیشہ کے لیے اس فانی دنیا سے کٹ جائے۔ وہ گھبرا اٹھا تھا۔

۔ آپ کو تو میں نے بد بخت نہیں کہا میں نے تو اس شخص کو بد بخت کہا ہے جو زندگی

کی قدر نہیں کرتا۔ وہ نرم لہجے میں بولا۔

۔ تو پھر مجھ لیے اس وقت مجھے زندگی بہت ہی قیمتی دے رکھائی دے رہی ہے۔ اس کا

بہرہ دشت آگیا تھا۔ دل چاہتا ہے اسے چٹاؤں سے نکلا دوں اور ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاؤں؟

تمہیلہ کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ تھی احساں کا پاؤں کا دباؤ ایک سیلیر پیر

علمیے بڑھا جا رہا تھا۔

”مس تشیلہ! — آپ ایسے خیالات رکھتی ہیں۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آپ کو کس چیز کی کمی ہے۔ کیا نہیں ہے آپ کے پاس، موٹر، منگلا، لوگر چاکر اور سب کچھ ہی ہے آپ کے پاس! — وہ نرم ہلچے میں بات کرنے لگا تھا۔

”میرے پاس سب ہی کچھ ہے — اس کے ہلچے میں دل سے ابھرنے والا انتہائی درد پیدا ہو گیا۔“ لیکن محبت نہیں ہے۔ بے پناہ، بے لوث اور سچی محبت سے میں کو سوں دور ہوں، اس کی آواز آتسوؤں میں بھیگ گئی، سختی مگر اس نے آنسو پلکوں سے نہ بچے نہ اتارے۔ دیکھتے تھے۔ اس کی آواز کے درد سے ہیل کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ انتہائی مظلوم لڑکی کے پہلو میں بیٹھا جو اپنے سینے میں غم کے جو الاکھی چھپائے زندگی کے بار کا کھائے ہوئے ہے۔ ہیل نے کئی گہرے گہرے سانس لیے۔

”آپ جس ماحول میں زندگی گزار رہی ہیں اس سے باہر نکل آئیے۔ وہ اسے سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔“ مغربی تہذیب کے مدد و جزر میں آپ کو سکون نہیں مل سکتا۔ یہاں زندگی ایسے ہی مظلوم بنی رہے گی۔ سچی اور بے لوث محبت تو ہر کنارہ۔ خلوص بھری نظریں بھی نصیب نہ ہوں گی۔ نالاشی اور کھوکھلی زندگی انسان کو دکھ ہی بخش سکتی ہے؟

”اب قومیت کے بعد ہی میں اس تہذیب کو الوداع کہہ سکتی ہوں۔“ اس کے ہلچے کی دقت برقرار تھی۔ ”میں اب اس ماحول کو نہیں چھوڑ سکتی؟“ تو پھر ترستی رہنے سچی محبت کو۔ وہ دیکھ رہی تھی بولا۔

”اگر آپ مجھ پر یقین دلائیں — وہ اسے کلکیوں سے دیکھ کر باثر ہوئی بولی کہ مجھے سچی محبت مل جائے گی۔ تو شاید میں اس تہذیب کو سچی چھوڑ دوں؟“

میں۔۔۔۔۔ وہ بوجھلا سا گیا: میں کیا یقین دلا سکتا ہوں؟
 شبیلہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اور اس کا دل کسی ایسے خوف
 سے دھڑکنے لگا تھا۔ مگر سہیل کے آخری جملے سے اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ
 مرتے مرنے پہنچ گئی ہو۔ اپنے اس جذبے پر وہ حیرت زدہ اور پریشان سی تھی۔
 آگ جس میں وہ جلتا نہیں چاہتی تھی۔ جذبات جنہیں قبول کرنے کیلئے وہ
 تیار نہیں تھی۔ اور تعلق جو پیدا کرتا نہیں چاہتی تھی۔ وہ خود ہی کیوں اسے اپنے
 احاطے میں لے رہی ہیں۔ یہ کون سا جذبہ ہے جو اسے بے خود بنا رہا ہے۔ سہیل سے
 وہ تعلق بھی پیدا کرتا نہیں چاہتی۔ تمثیل سے اس کے لبط و ضبط کو دیکھ بھی نہیں سکتی
 یہ آخر کیلئے ہے؟

اور پھر تمثیل۔۔۔۔۔ ایک بیارذہن، مغرب زدہ لڑکی۔۔۔۔۔ آہ بے چارہ
 اس کا دل تمثیل کی بے بسی پر کڑھنے لگا۔

وہ نفورات میں کھوئی ہوئی تھی۔ لیکن کان تمثیلہ کی طرف تھے۔
 ”جب آپ یہ یقین نہیں دلا سکتے۔۔۔۔۔ تمثیلہ کے لبوں پر زیر آلود مسکراہٹ
 بکھر گئی۔ میں ہمیں سے مغربی تہذیب میں پل ہوئی اپنے ماحول سے کیسے باہر نکل سکتی ہوں۔
 کہہ دیتا آسان ہے اور عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ بہت ہی مشکل ہے۔“

سہیل کچھ نہ بولا۔ اور پچھلے بوئے پھانڈ کی طرف دیکھنے لگا جو دوپ کی آغوش
 میں مسکراتے ہوئے چہروں سے آسمان کو حیرت سے نگاہیں رہے ہیں۔ اور نیلے آسمان پر
 کہیں کہیں سفید لکڑے اور جو خرام تھے تمثیلہ بھی خاموش ہو گئی تھی۔ شبیلہ بھی پیچھے پیچ
 چاہتی تھی۔ اب تمثیلہ کا خوش مانہ بڑھ چکا تھا۔ اور وہ پرسکون ہوئی جا رہی تھی۔
 اس کے چہرے کا رنگ بھی اعتدال پر آ گیا تھا جس طرح سمندر طاعلم کے بعد پرسکون ہو
 جاتا ہے۔ وہ بھی طوفانی دوسے باہر نکل آئی تھی۔ اور گاڑی کی رفتار جدید گھٹ کر

”اور وہ اجنبی جس کے نام کا بھی اسے علم نہیں؟
 کیا کسی اجنبی سے کچھ خریدنا نہیں جاسکتا؟ بات مدلل تھی۔
 سہیل نے مزید وضاحت کی۔

”بھائی جان کو پتہ چلا تھا کہ ارجمند صاحب اپنی اسٹیل فیکٹری فروخت کر رہے ہیں
 انہوں نے تھیلہ سے مشورہ کیا۔ تھیلہ خریدنے پر تیار ہو گئی اور بھائی جان نے اس کا پتہ
 دے کر انہیں یہاں میرے ساتھ بھیج دیا۔
 ”مگر چیک تو آپ نے دیا ہے؟ وہ اُسے گہری اور فحشی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ وہ
 ان نظروں سے گزرا سا گیا۔

”تھیلہ نے چیک میرے پاس رکھ دیا تھا۔ وہ خود کو جلدی سے سنبھال کر ایک خوب
 صورت چھوٹ کا سہارا لے کر بولا۔ مگر اس کے اس انداز سے تھیلہ مطمئن نہ ہوئی۔ اس
 کے چہرے پر ہنرکش مکش پھیلی رہی اور تذبذب بکھرا رہا۔

”تھیلہ نامانی کپڑوں کے ساتھ فیکٹری خریدنے کو مری آئی ہے۔ اور اس کا چیک
 آپ کے پاس ہے۔ وہ اچھے اچھے لیوے میں بولی۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ پھر اس نے
 ایک ٹھنڈی آہ بھری، ”خیر اگر آپ سچی بات بتانے سے گریز کر رہے ہیں تو آپ کی مرضی؟
 مجھے دوسروں کے راز جاننے کا کیا حق ہے۔“

اس کے لہجے کی انجمن اور طنز سے چند لمحوں کے لیے سہیل کے چہرے پر گہری ندائت
 بکھر گئی۔ اس نے دیکھا اور محسوس کیا مگر اس نے کچھ کہا نہیں خاموش رہی۔ مگر اسے اتنے
 سے ہی یقین ہو گیا کہ معاملہ وہ نہیں جو سہیل نے بتایا ہے۔ اس کے پس منظر میں کوئی راز مضبوط
 ہے جس کا اظہار وہ نہیں کرنا چاہتا۔ اگر وہ راز عیاں کرنا نہیں چاہتا تو نہ سہی۔

تھیلہ کا چہرہ تار تار تھا کہ اسے سہیل سے شکایت ہے۔ کہ اس نے اس سے ڈر
 چھپا یا ہے۔ اُسے اس کے راز دارانہ رویہ سے صدمہ پہنچا تھا۔ اس کا دل اچھ سا گیا تھا۔

تنبیلہ نے بھی بھیجی تھی لگا ہوں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ پہلے ہی سکراتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس تصادم کی تاب نہ لاسکی۔ اس کی نظریں جھٹک گئیں۔ اور بچوں سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی۔ وہ اس کی مردانہ وجاہت سے۔ سپر انداز میں نظر آتی تھی۔

سہیل وپنی اس کامیابی پر مسکرایا۔

دقتاً سہیل نے گھوم کر دیکھا۔ تنبیلہ حزن و ملال کی تصویر بنی تیز تر قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ اس کی چال سے گہرے اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ قریب آ کر کھڑی گئی۔
”کیوں خیریت تو ہے آپ پریشان کیوں ہیں؟“ وہ گہرا کر بولا۔ تنبیلہ نے جھپک اس کے ہاتھ میں چھلایا۔

”سیٹھ! ارجمند کل رات فوت ہو گئے۔“ وہ گہرے تاسف سے بولی۔ اور یہاں ہمارے پہنچنے سے نصف گھنٹہ پہلے ہی ان کے لواحقین ان کی لاش کو لے کر گئے ہیں۔“
”اے بے چارہ سیٹھ! ارجمند!“ تنھوڑی دیر خاموشی رہا۔ پھر وہ تنبیلہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ مگر آپ کیوں رنغا کرتی ہیں جانے دیجئے فیکری نہیں ملی تو نہ سہی۔“

وہ چپ چاپ کھڑی رہی اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ارجمند نہیں مرا۔ اس کا اپنا کوئی عزیز فوت ہو گیا ہو۔ ایک انسان کے لیے ایک انسان کے ایسے جذبات عقلت کے گہرے نشان تھے۔ اور انسان بھی جو مچھا ہو مگر انسانیت تو نہیں مری تھی۔ انسانیت جس کا مفہوم کچھ ہی لوگ جانتے ہیں۔

سہیل کو تنبیلہ کے اس جذبے نے بے حد متاثر کیا تھا۔
کچھ دیر سکوت رہا۔

کھڑی کیوں ہیں آپ! اندر بیٹھے چلیں۔ تنبیلہ سے مخاطب ہوا۔
تنبیلہ آہستہ آہستہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی اور دروازہ بند کر دیا گیا۔

”میں تمثیلہ! بوٹی چلیے! ————— سہیل نے تمثیلہ کی طرف رخ کیا۔ ہم اسی وقت
لاہور واپس جانا چاہتے ہیں۔“

”کیوں! اس وقت کیوں؟“ ————— وہ زور سے چونکی، ”ایک روز اور نہیں ٹھہر
سکتے آپ! آج آپ کو سیر و تفریح کراتی ہوں؟“
”سچ کبھی اگر ادھر آنا ہوا اور آپ ملی گئیں تو ضرور ٹھہروں گا؟ وہ فیصلہ کن۔
انداز میں بولا مگر اب نہیں۔“

تمثیلہ اس کے انکار سے زچ ہو گئی۔
”تمثیلہ نے مطمئن انداز میں ایک گہرا سانس لیا۔“

راولپنڈی سے آئے والی ریل کار لاہور اسٹیشن کے یارڈ میں پہنچ گئی
 سہیل ایک قلی کو انیچی کیس اتارنا کر شبیلہ کے ہمراہ پلیٹ فارم پر اترا۔ اور گیٹ سے
 نکل کر باہر آگیا۔ قلی نے انیچی کیس لے جا کر ایک ٹکیسی میں رکھ دیا۔ اور اپنی مزدوری
 لے کر چلتا بنا۔

ڈرائیور نے ان کے بیٹھنے کے لیے پچھلا دروازہ کھولا۔ شبیلہ بغیر کسی جھجک کے
 پچھلی سیٹ پر بیٹھنے لگی۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھنے کے پچھلے دروازے کی طرف
 لپکا۔

”ادھر نہیں“ اس نے ہونٹوں پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ بچھ کر اگلی سیٹ
 کی طرف اشارہ کیا: ”ادھر“۔ ایک شگفتہ مسکراہٹ سہیل کے ہونٹوں پر لہرا گئی۔ اور
 وہ خضع انداز میں گردن ہلا کر برسامنہ بناتے ہوئے اگلی سیٹ کی طرف بڑھا۔
 ”ہوں! —“ وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”یہ حجاب کب پر دے کب تک جائے
 رہی گئے“

”شبیلہ شرم و حیا کی دل کشش تصویر بن گئی۔ اور ہونٹوں پر دہی دہی مسکراہٹ اٹھنے لگی۔
 نظریں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ وہ کچھ نہ بول سکی۔ میٹر ڈاؤن کرنے کے بعد ڈرائیور
 نے اپنی سیٹ سے نیچال کنگاڑی اشارت کر دی۔ اور اپنی گردن کو متحرک کرنا شروع کیا۔
 ”کہاں چلوں! صاحب! —“

”گلبرگ چلو! —“
 شبیلہ چونکی اور نظریں اٹھا کر سہیل کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں پھرے اُسے شرم
 انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں سے شبیلہ کا دل دھک دھک کرنے
 لگا تھا اور اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

”ڈرائیور پہلے بنک کو آرٹرز چلو! —“

”نہیں پہلے گلبرگ چلو! —“

ڈرائیور حیرت سے دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ان کی تکرار بڑھنے لگی۔ سہیل بھی
 آنکھوں میں شرارت اور شبیلہ کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ آخر وہ روکنے کے قریب
 ہو گئی۔ اور دروازہ کھول کر پیچھے اترنے لگی۔

چلو معاف کیا! — ”وہ پیار سے بولا۔ مگر وہ دروازہ کھول چکی تھی،
 ”ارے کیا کرتی ہو؟“

”نہیں اب میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ وہ روہانسی ہو کر اترے کے
 سے انداز میں آگے لپک کر بولی۔ ”میں دوسری ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔“
 سہیل نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”قسم لے لو جواب کسی قسم کی بات کروں۔“ پھر مضحکہ خیز سامنے بنا کر بولا۔ ”مگر ختم ہو گیا
 قسم ٹوٹ گئی۔ لیکن اس شرارت کے بعد ہی پھر قسم کھاتی پڑ گئی۔ بڑی ہوشیار
 ہیں آپ۔“

ہے ساختہ سنس پڑی۔

”چھوڑیے میرا ہاتھ۔۔۔۔۔۔“ وہ تازے ہاتھ جھٹک کر بولی
 پہلے آرام سے ٹھکی میں میٹہ جالیے پھر ہاتھ چھوڑ دیں گا۔ وہ انتہائی اپنائیت سے
 لٹا کر اس کے لمبے میں جانے کو نا ظلم چھپا ہوا تھا کہ وہ غیر ارادی طور پر اپنی سیٹ
 پہ بیٹھ گئی۔

”بہت تنگ کرتے ہیں۔“ اس کے منہ سے اچانک یہ جملہ نکل گیا۔ اور دوسرے
 لمحے ہی اس کے چہرے پر شرمگین مسکراہٹ چھا گئی۔
 ”بہت تنگ کرتے ہیں آپ۔“ وہ بربرایا کستی شیریں بات ہے لیکن کتنا
 غلط الزام۔۔۔۔۔۔“

”پر نگہری شرم مسلط ہو گئی۔
 سہیل نے ذرا نیور کی طرف دیکھا۔
 ”جلو۔۔۔۔۔۔ بھائی۔۔۔۔۔۔“ وہ مسرورانہ انداز میں بولا: پہلے تنگ کو ارٹ رہی
 تھی؟

”بڑی جلدی ہاں تسلیم کر لی ہے آپ نے!۔۔۔۔۔۔“ ڈراما نویس نے مسکرا کر کہا۔ وہ
 بھی کوئی زندہ دل اور پھلا انسان تھا۔ سہیل نے اُسے ایک نظر دیکھا اور وہ مسکرایا۔
 ”ایک وقت آنکھ بے جب بارنا پڑ سکے۔“

ڈراما نویس بھی شاید اس فلسفے کو سمجھ گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہنسی بکھر گئی۔ اور شبیلہ
 نے دیکھا ہے آپ ہی آپ کٹ سی گئی۔ دوسرے لمحے گاڑی سڑک پر بھاگ رہی تھی۔
 ”تمی سڑک کوڑ سے ہوتی ہوئی گاڑی اس جگہ پہنچ گئی جس جگہ شبیلہ بارش کی رات میں
 (۲) سے بیٹھ ہوئی تھی۔

”وہ مجھ آگئی جہاں سے حسین نصورات کو آغاز ہوا تھا۔۔۔۔۔۔“ وہ حسین خیالاً

میں ڈوبتا ہوا بولا۔

”ڈرائیور گاڑی ہمیں روک دو۔“ شبیلہ اس کی بات کو نظر انداز کر کے
برلی۔

”ڈرائیور نے سہیل کی طرف دیکھا۔“

”ہاں ڈرائیور گاڑی ہمیں روک دو۔“ وہ بڑے خوابناک لہجے میں بولا: ”میں خود بھی
اس حسین جگہ سے آگے بڑھنا نہیں چاہتا۔ فی الحال یہی میری منزل ہے۔“
”ابھی تو بے شمار منزلیں آئیں گی۔“ وہ گاڑی سے اترتے ہوئے پر خیال انداز میں بولی
اور اسے دیکھ کر بغیر آگے بڑھتی چلی گئی۔ اس کے پردہ سماعت سے ابھی تک ایک دلکش
نغمے کی طرح شبیلہ کے ہونٹوں سے نکلا ہوا جملہ تکرار ہاتھا، اور سرور انگیز بازگشت پیدا کر
رہا تھا۔

”ابھی تو بے شمار منزلیں آئیں گی؟“

”واقعی ابھی تو بے شمار منزلیں آئیں گی۔“ وہ زیر زبانا، میں اسی جگہ کو منزل سمجھ بیٹھا ہوں
مگر یہ جگہ زندگی بھر بھلائی بھی نہ جاسکے گی۔“ شبیلہ اسے نئی زندگی کی راہ دکھا کر چلی گئی تھی
وہ بڑے ہی حسین انداز میں ان راہوں کے پسے دیکھتے لگا تھا۔ جو اسے نئی منزلوں پر پہنچانے
میں مددگار بنیں گی۔ اس کی مونس و غمخوار بن کر اسے آگے بڑھائیں گی۔

”اب کہاں چلوں خیل۔“ ڈرائیور کی آواز پر وہ چونکا۔ اس کے ہونٹوں
پر ایک دلکش سی مسکراہٹ بکھری اور اسے خمار آلود سی نگاہوں سے دیکھا۔

”اب کجک چلو۔“ اس کا لہجہ خوشگوار تھا۔ اور آواز میں خوش کن۔
خوش کی تھر تھر اہٹ تھی۔

ڈرائیور نے ٹیکسی کلاخ موٹا انداز سے بگڑ گئے والی سڑک پر ڈال دیا۔
جوں ہی شبیلہ نے اپنے کھارٹر کے دوا دے سے اندر داخل ہو کر صحن میں قدم رکھا

تو اس کے قدموں کی آہٹ سے سب نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے والد کے کمرے میں شام کی چائے پی جا رہی تھی۔
چہروں پر خوشی کی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ گلاب کے پھول کی طرح کھل اٹھے۔ وہ دلکش انداز میں چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

لوہاری بیابھی آگئی! ——— ارشاد احمد سرت پھرے لیے میں بولے۔
تہاری سہیلی کی شادی خیر و عافیت کے ساتھ ہو گئی بیٹی! رابعہ بیگم مامتا بھرے لیے میں بولیں۔

بڑی اچھی طرح امی جان جھوٹ بڑھانے کی اس کو شمش میں اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ بچی نے چائے کی ایک پیالی بنا کر اس کے آگے میز پر رکھ دی۔ اس نے نیپائی اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا پھر پیالی کو اسی جگہ رکھ دیا۔ سب چائے بنا رہے تھے۔ اور باتیں کر رہے تھے۔ جینز کی بات، شادی کی بات، گہاگہی کی بات اس سے عجیب عجیب باتیں پوچھی گئیں۔ اس نے کئی باتوں کا تو سہم سہم کر جواب دیا۔ جینز کی باتوں پر اس کے والدین پر ایک دم گہری انسردگی پھیل جاتی تھی۔ اس انسردگی کو محسوس کر کے اسے کافی دکھ ہوا تھا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ اس کے والدین کے خیالات کہاں پہنچ گئے تھے۔ انھیں جوان لڑکیوں کی جینز کی نمکے بلے چین کہیا تھا۔ پھر اس نے بڑی ذہانت سے علی دی مو صوفیہ بدل دیا تھا۔ اس کے والدین کے چہرے خیالات کا رخ بدلنے سے پرسکون ہو گئے اور اسے پینٹے سیالوں سے نجات مل گئی۔ اس نے بھی اطمینان کا سانس لیا تھا۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے اسے کتنے ہی جھوٹ بولنے پڑے تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر کچی، شبیلہ اور نصر کچھ دیر وہاں بیٹھ رہے۔ پھر سوتے۔

کی نیت سے کمروں میں جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”کیوں چل دیے میرے پتھر؟“ ارشاد احمد نے پیار بھرے لہجے میں..

پوچھا:

”کچھ تھکناٹا کا احساس ہو رہا ہے ابا جان! —“ شبلیہ اپنے والد کی طرف

دیکھ کر بولی۔ ”اس لیے اب سونا چاہتی ہوں۔“

”ہاں — ہاں میٹھی! —“ جاؤ گھر میں کچھ شادی بیاہ کے ہنگامے سے

بے حد تھکن ہو جاتی ہے۔ پھر انہوں نے بھی ادا تھور کی طرف دیکھا، تم بھی

جانا چاہتے ہو:

تصدقے نظر میں جھکا لیں۔ اسی طرح کا انداز بھی کا تھا۔ اور اس کے مونٹوں میں

دینی دینی مسکراہٹ تھی۔

”جی نہیں سبھی اجازت دیجئے!“ وہ دیکھے لہجے میں بولا۔

”چھا بھئی —“ وہ مسکرائے — جاؤ —

”تینوں کمرے سے باہر نکل آئے۔ اور ایک کمرے کے سامنے آکر دک گئے۔

”شبلیہ بہن! آپ اتنی تھکی ہوئی تو معلوم نہیں دیتیں۔ وہ منہس کر بولا۔

”اندر چلے۔“ لڈو کھیل لیں گے؟

”بھئی مجھے تو معاف ہی کرو۔ وہ اکٹاہٹ سی ظاہر کر کے بولی۔ اس وقت موڈ

نہیں ہے بچی کے ساتھ کھیل لو۔“

اس اجازت سے بچی گھبرا سی گئی اور صحن میں جھگڑاتے ہوئے یلب کی روشنی میں

اس نے اپنی بہن کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ مگر اس کے ہرے پر شکستہ مسکراہٹ

کھیل رہی تھی۔

”میری طرف کیا دیکھ رہی ہو؟“ وہ پیار سے اس کا کال ٹھپک کر بولی۔ ”جاؤ کھیلو۔“

جا کر! —————

شبیلہ اپنے کمرے میں آگئی اور نجی تصور کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اپنے سامنے
کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تصدیق درمیان میں پڑی ہوئی مینر پر لگد بھلادی۔
چند لمحوں خاموشی سے گزر گئے۔

نجی کی نظریں بھی ہوئی تھیں۔ اور وہ تصویر کی طرف سے کھیل کے آغاز کی منتظر
تھی۔ —————

تصور کو ان کا ایمان بنے کئی دن گزر گئے تھے اور اسی عرصے میں اس نے نجی
کی جھجک اور تکلف کو مٹا دیا تھا۔ مگر اس کے فطری جواب کو دور نہ کر سکا تھا۔ تنہائی
میں اسے تصور سے مل کر شرم کا گہرا احساس ہوتا تھا۔ اور وہ سمٹا سمٹ جاتی تھی
جب خاموشی برپا ہوتی تو نجی نے نظریں اٹھائیں اور اسے اپنی طرف گھورتے دیکھ کر
گھبرا گئی۔ شرم و حیا سے اس کا چہرہ کئی رنگ بدل گیا۔

”آپ میری طرف کیوں گھور رہے ہیں؟ وہ ہانپتے ہوئے ہوئے سے
انداز میں بولی۔ ”کھیلے نا۔“

”کیا کھیلوں؟“

”کھیل آپ کے سامنے پڑا ہے اور پوچھنے سے رہے ہیں؟ وہ مضطرب سے
شریں لیے میں بولی۔“

”کھیل سے پہلے میری کل والی بات کا جواب دیجیے! ————— وہ محبت
بھرے لہجے میں بولا۔“

”کوئی سی بات کا! ————— وہ دانستہ اسٹائن بن کر شرم آلود آوازیں
بولی۔“

”جو کل میں نے باغ جناح میں کہا تھی۔ وہ سنجیدگی سے بولا: میں تمہیں اپنی

زندگی کی راہوں میں ساتھ ساتھ چلتے دیکھتا چاہتا ہوں۔ میں نہیں تمام زندگی کے لیے اپنا مسفر بنانا چاہتا ہوں؛
ٹھوڑی دیر سکوت رہا۔

• بولے نا! — وہ سکوت کوڑھ کر جذبات کی شدت سے لرزے ہوئے
لبے میں بولا۔

• سفر تو شروع ہو چکا ہے : وہ مشکل کہہ سکی۔ گہری حیا سے اس کی آواز حلق
میں چھنس گئی۔

• ہرے! — وہ خوشی سے بے تاب ہو کر چلتا یا۔
بچی کو پسینہ آگیا۔ — وہ بجلی کی طرح تیزی سے آٹمی اور بواکے۔
جھونکنے کی طرح دروازے سے باہر نکل گئی اور وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔
• بقدر کے چہرے پر خوشیاں ہی خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس کا دل مسرور تھا
اس کی روح وحید میں لہرا رہی تھی۔

بچی نے تصور کے کمرے سے باہر آ کر اپنی بکھری سانسوں کو ہموار کیا۔ ادھر پہنچنے
کمرے میں داخل ہو گئی۔ آسمان ابر آلود تھا۔ ادا لائی کھٹاؤں میں بار بار بجلی چمک رہی تھی۔
کبھی کبھی بادل بھی گرجنے لگتا تھا۔

• قدموں کی آہٹ سے پلنگ پر لیٹی ہوئی شبیلہ نے ایک مفعول سی کوٹ لی ادھبھی
کی طرف حیرت سے دیکھا۔

• کھیلنے کودل نہیں چاہا کیا : اس سے اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔
• آپنی! — وہ منہ بنا کر شرمیلی آواز میں اٹھلا کر بولی — سونے کودل چاہا
چلی آئی : یہ کہتے ہی اس نے سوچ دیا اور کمرے میں اندھیرا بھیل دیا۔ پھر اپنے
پلنگ پر گر پڑی۔

ہنگلی نہیں کی۔ شعیلہ نے پیار سے کہا۔

• بھئی تدبیری میں اپنی بہن کا اتنا بہت سنا پیارِ دل میں بسائے تصور
 کے حسین خیالوں میں کھو گئی، کھوئی چلی گئی۔ ————— حتیٰ کہ وہ نیند کی
 حسین دالیوں میں پہنچ گئی۔

موسٹر ٹیبلڈ کے دفتر میں اگر شبیلہ کو اپنی سیٹ پر بیٹھ زیادہ دیر نہ گزری
تھی کہ چہرہ اسی اُسے بلانے آگیا راحیل نے اُسے بلایا تھا۔ وہ چہرہ اسی کے جانے کے بعد اُٹھی
اور بڑے پروقار انداز میں چلتی ہوئی راحیل کے کمرے میں داخل ہوئی۔
وہ دفتر کے اندر پہنچی تو راحیل نظریں اٹھائے اُسے آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس
کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

”اسی کوئی ضروری خط نہیں آیا ہے باس! —“ وہ ادیب سے بولی۔
”نہ سہی —“ چہرہ اس نے اُسے غور سے دیکھ کر کسی کی طرف اشارہ کیا۔

”بیٹھیے! —“

شبیلہ مناسبت آلود حیا اپنے لبوں پر سلیر پر وقار انداز میں بیٹھ گئی ہلکے میک اپ
اور سادہ پنک ساڑھی میں آج اس کا رنگ کچھ اور نکھر آیا تھا۔
راحیل نے نظر سحر کر اُسے ایک بار دیکھا اور پھر نظریں جھکادیں۔
”شبیلہ نے محسوس کیا۔ آج راحیل کچھ بدلا بدلا سا ہے۔“

کچھ دیر یوں ہی گزر گئی۔

”باس! ——— آپ نے کس کام سے مجھے بلایا ہے؟
کوئی خاص کام نہیں۔ جیسے راحیل کی آواز کہیں دھڑ سے آئی ہو۔ اہستہ
خوانک اور دھڑے قنار۔

”جی! ——— شبیلہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔
”آپ کو سفر میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟“
”جی نہیں! ——— اس نے مختصر سا جواب دیا۔
”میرا مطلب ہے سہیل نے آپ کو تنگ تو نہیں کیا۔ وہ بے حد شریف ہے لیکن
اتنا ہی شریف بھی۔“

سہیل کے ذکر سے شبیلہ کی نظر جھک گئی۔ دل کی لہریں کچھ گڈمڈ ہوئیں۔ ——— نہیں
بالکل نہیں۔ ہمارا سفر بالکل خوشگوار اتلاؤں گزرا باس! ———

لفظ باس پر اس نے خاص طور پر زور دیا:
”ہوں۔ ——— راحیل بھی گہری سوچ میں تھا۔
”راحیل کی اگلی ادھر گہری محویت کو شبیلہ نے شدت سے محسوس کیا۔
ایک خیال اس کے ذہن میں سرسرایا۔

”راحیل کی سوچ ادھر محویت کا مرکز نہیں اس کی ذات تو نہیں بنی۔ ——— اور وہ
کانپ اٹھی۔

سہیل ——— راحیل ——— وہ نام اس کے ذہن سے ٹکرانے لگے۔ اوردہ
ملک کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔

اور راحیل وہ اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔
شبیلہ جس کادھ سے اسے خاموشی سے مطالعہ کرتا ہوا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

اور وہ اس کی موجودگی سے بے نیاز اپنے ہی خیالوں میں دوڑ بہت دوڑ بیچ چکا تھا۔
 شبیلہ نے جس دن سے دفتر میں قدم رکھا تھا۔ وہ اس کے لیے ایک سوال بن گئی
 تھی؛ ایک ایسا سوال جو بھی تک لائے مل تھا جس کا جواب اُسے نہ مل سکا تھا۔ شبیلہ کیلئے؛
 اس کی جھکی جھکی سی مرقع نظر، اس کی آواز اور بھری بھری زلفیں، زیبائش سے بے نیاز
 سادہ سا چہرہ، لا پرواہ انداز اور اپنے ہی کام میں منہمک رہنے والی دبی بتلی سی لڑکی نے
 وہ جانے کیوں اُسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

کبھی کبھی وہ جھجھکا اٹھتا سمجھنے کیا ہوتا جابار ہے؟ میں اس کے بارے میں کیوں سوچتا
 ہوں؟ آخر وہ بھی تو اس دفتر میں بہت سے ملازم ہیں، اسخان کی ذات میری تو بڑی گراہی
 طرف کیوں نہیں کھینچتی۔ اس کا جواب وہ اپنے آپ سے مانگتا۔ اور پھر خود ہی چونک پڑتا۔
 وہ اپنی ذاتی زندگی میں بے حد شریک، کم گو اور اپنے ہی آپ میں مست رہنے والا
 انسان تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد باپ کے وسیع کلمہ بار کا تنہا نگہان تھا۔ اور اتنی بڑی
 ذمہ داری نے آج تک اسے کسی طرف مائل نہ ہونے دیا تھا۔ اس کی دلچسپی اور انہماک کا
 مرکز صرف اپنا کاروبار تھا۔ لیکن اب وہ کچھ دلوں سے اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کر رہا
 تھا۔ شبیلہ نے اُسے بے حد متاثر کیا تھا۔ اور متاثر کر دیے والی یہ اسخانی قوت روز بروز،
 لمحہ بلمحہ اُسے اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔ اکثر تھانی میں اُسے شبیلہ کا معصوم اور بے خود
 کر دینے والا حسن ایک سوال بن کر اس کی نگاہوں کے سامنے آ جاتا۔ اور وہ پریشان سا ہو کر
 رہ جاتا۔

اور بالآخر ایک سفیدہ سالو حجام ایک منجر پر پہنچ چکا تھا۔ ایک ایسے فیصلہ پر جس کے
 بارے میں شبیلہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے اس لمحہ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی امتحان
 گاہ میں ہو اور ابھی ابھی اُسے کوئی بہت ہی اہم انٹرویو دینا ہو۔ ایسا انٹرویو جس کا میا پانی
 پر ہی اس کی آئندہ زندگی کا دار و مدار ہو۔

مجھے انوس ہے ! — فیکٹری نہ خریدی جا سکے ! سرسراہند ہمارے پہنچنے سے
قبل ہی انتقال کر گئے تھے۔

مجھے علم ہے کہ وہ اس کو معنی نغزوں سے دیکھ کر بولا۔ کل اتنے ہی پہلے مجھے
تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا کہ کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی اور فیکٹری خریدنے کی کوشش
کر لی گئی۔ جو سکتا ہے اس کے عزیز واقارب وہی فیکٹری ہمارے ہاتھ فروخت کر دیں۔
بہر حال آپ کی جو محنت ہے وہ قابلِ داد ہے۔ آپ نے خرم کو کسی طرح گزند نہیں پہنچائی
پوری توجہ سے کام لیا ہے۔ خرم آپ کو اس کا معاوضہ دیتی ہے یہ کہہ کر اس نے چیک
لیک اٹھائی اور ایک سو روپے کا چیک کاٹ کر اس کی طرف بڑھایا۔
”یہ سو روپے کا چیک خرم کی طرف سے آپ کی محنت کا معاوضہ ہے ! وہ یہ اخلاق
لیجے میں لویا۔

”تقوا ملتی ہے تو اس کی کیا ضرورت ہے —“ وہ متردد ہو کر بولی :
”جیب خرم کسی کارندے کو ہاں بھیجتی ہے تو اس کی محنت کا معاوضہ الگ دیا جاتا
ہے ! —“ وہ زور دے کر بولا — ”اُسے رکھ لیجئے —“ یہ آپ
کا حق ہے —

راہیل کی آواز انتہائی پر خلوص تھی۔ اور لیجے میں اخلاق آئیز اسٹند مانتی۔ اس نے
پاؤنڈ آگے بڑھایا اور چیک لے لیا۔

”مس شبیلہ ! اس نے ایک گہری آواز میں سرگوشی کی — شبیلہ نے اس کے لیے
سے اُسے چوم کر دیکھا۔

جی : وہ مقرر تھی۔

”مس شبیلہ ایک التجا ہے۔ اگر آپ ٹھکرا نہ دیں تو —“ اس کا لہجہ سرشار سا
تھا۔ بے حد متین سا تھا۔

”الہا کیسی! — وہ متوجہ تھی — آپ تو حکم دیتے ہیں۔
 ”حکم کا وقت اور ہے! —“ وہ بے خودی سے بولا، اور میں اس وقت
 کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔“

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ — وہ حیران حیران نگاہوں سے اس کی
 طرف دیکھنے لگی۔

”میں کچھ سمجھی نہیں ہاں — وہ اب کچھ پریشان ہو چکی تھی۔ اس نے
 اس کی پریشانی کو محسوس کیا۔

”وعدہ کیجیے! میری انتہا کو ٹھکرائیں گی نہیں آپ! —“ وہ اپنی آواز کو انتہائی
 لطیف بنا کر بولا۔

”مگر کچھ پتہ بھی چلے! —“ وہ جھٹلا سی گئی تھی — وہ حیران تھی کہ سارا میل کو
 ہو کیا گیا ہے۔

”آج شام پانچ بجے آپ چائے میرے ساتھ شیزان میں پیئیں گی۔“ اس کے لیے میں
 پیار بھری اسناد عاتقی۔

”میں —“ وہ گھبرا گئی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں ہو سکتا! —“ وہ مسکرا کر بولا۔

”ایک شریف آدمی کے ساتھ آپ کو چائے پینے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟
 ”جی یہ بات نہیں ہے۔“ وہ بوکھلا سی گئی۔

”اور کیا بات ہے —“ وہ اس کی گھبراہٹ سے لطعت اندازہ نہ کر پولا۔

”غیرائے گھبرائے انداز میں وہ اُسے بہت ہی دکش لگی تھی، اس کا دل سینے میں اچھلنے لگا۔

”جیسے وہ بیٹھنی دلیا میں توڑ کر باہر لکل آئے گا۔

”میں اس گھبراتے سے تعلق رکھتی ہوں۔“ اس نے اپنی گھبراہٹ پر کسی قدر تالو بایا

”جو ہو ٹٹل میں آئے جانے کی آزادی نہیں دیتا۔“

”ہول! — یہ لیا یکا افسردہ ہو گیا۔ اور اس کے چہرے پر گہرے رخِ غم کے آثار پیدا ہو گئے۔ اور شبیہ کو اس کے چہرے پر نظریں دوڑا کر بہت ہی دکھ پہنچا۔ وہ راحیل جیسے درد مند انسان کو آزار پہنچا رہی تھی۔ اس نے اس شخص کو دکھ پہنچایا تھا۔ جس نے اس کی برے حالات میں مدد کی تھی۔ اس کے دکھ کو پناہ دکھ جانا تھا۔ آپ کسی بہاؤ سے بھی آسکتی ہیں۔“ اس نے انتہائی سوز و غم میں ڈوب کر کہا۔

وہ خاموش رہی۔ چہرے پر کشتِ کشت بھیلی ہوئی تھی۔ اور ذہن سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

”پلیز! — آپ کو آنا ہوگا — اس کے لیے میں درد بھیری التجا سہتی، آپ کو ضرور آنا ہوگا۔ سوچئے نہیں۔ میں بار بار آپ سے اس طرح کی التجا نہ کروں گا کچھ باتیں ہیں جو میں آپ سے اسی ملاقات میں کہہ دینا پسند کروں گا۔ دیکھتے ہیں تقدیر کیا فیصلہ کرے گی۔“

اس کے اس انداز سے وہ چونکی۔ اس کا دل دھک سمدھک گیا۔ اور اس نے لیور راحیل کو دیکھا جو افسردہ تھا۔ وہ اس کی افسردگی سے منسوب ہو گئی۔ اور اپنی نظریں جھکائیں۔

”اگر کوئی بہت ہی ضروری کام ہے تو آجاؤں گی۔“ چہرہ کچھ سوچ کر بولی مگر اس یہاں بھی جوابات کی حاجت تھی۔

”نہیں یہ فضا ایسی بات کے لیے مناسب نہیں ہے۔“
اس کے چہرے سے یوں لگتا تھا جیسے وہ آنکھوں میں پڑ گئی ہو۔
”ٹھیک اسی وقت دفتر کا ہیڈ کلرک صدیقی کمرے میں داخل ہوا۔ راحیل نے اسے

دیکھا اور ٹھیلہ کی طرف رخ کر کے کھنڈے لگا۔

”اچھا اب آپ جلیے میں نے جو کام بتایا ہے اسے آج ضرور کرنا ہے۔“
 ”جی بہت اچھا۔۔۔۔۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے لڑکا۔ اور اس نے دیکھا کہ
 راحیل کا چہرہ مسرت میں ڈوب گیا ہے۔

”شبیلہ اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ کٹش مکش کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے
 راحیل اس سے کیا کہنا چاہتا تھا، خیزان میں ہلکا سا سے کیا کہنا ہے۔ اس کا متردّد لہجہ اس
 کی سرشارانہ کیفیت، سنجیدگی، انسردگی اور اس کے انکار سے اس کے لہجے میں رخ و غم کا
 پیدا ہونا۔ یہ باتیں کیا ظاہر کرتی ہیں۔ کیا وہ ان ہی راہوں پر نہیں چل پڑا جن پر اس کا جھوٹا
 سمجھائی کا وزن ہے اور وہ باوجود چاہنے کے بھی اس کا ساتھ نہیں دے سکی۔ ابھی تک
 اس کی ہمسفر نہیں بن سکی۔

کیا دونوں سمجھائی ایک ہی منزل کی تلاش میں سرگرداں ہیں، سہیل کی منزل تو وہ خود
 سچی اس کی تلاش کا توا سے پتہ تھا، مگر راحیل کی منزل کو کسی ہے۔ راحیل کو تلاش کیا ہے۔
 اس کا اُسے پتہ نہیں تھا۔ اگر راحیل کی منزل بھی وہ خود ہوئی تو کیا ہوگا؟ — دو سمجھائی
 — دو قریب — یہ کیا موڑ تھا — یہ کیا خیال تھا۔ وہ کانپ
 گئی۔ وہ لرز گئی۔ اس کے جسم میں کیکچی پیدا ہو گئی وہ بدحواس اور سر اسلمیہ سی دکھائی
 دینے لگی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے انتہائی غم چھانکنے لگا۔ پریشانی اس کے
 دل کی استقامت گہرائیوں میں کلپلانے لگی۔ وہ رخ و غم میں ڈوب کر رہ گئی۔

ایکایک سہیل کا چہرہ اسی اس کے پاس آیا۔

”آپ کو چھوڑنے صاحب نے بلایا ہے با۔۔۔۔۔ وہ مودباہ لولا۔
 شبیلہ چونکی۔

”دفتر کے محلے نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ کئی لمبوں پر تلخ مسکراہٹیں پھیل گئیں۔

وہ ان مسکراہٹوں کا چہرہ نظر دل سے جائزہ لے کر اور مضطرب ہو گئی۔
 "اوت! یہ پریشانیوں، یہ الجھنیں، وہ بڑبڑائی۔" اب شاید مجھے نوکری چھوڑنی ہی
 پڑے گی۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا: نوکری لے اُسے بڑبڑاتے دیکھ کر کہا۔
 "نہیں! —" وہ سنبھلی: "تم جلدی میں آتی ہو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے
 پرس میں جیکب رکھ لیا، اور پھر معمول انداز میں آگئی اور سہیل کے کمرے میں چلی گئی۔
 "فرمائیے! —" اس کا لہجہ بے حد ملگن تھا۔
 "سہیل نے اُسے حیرت سے دیکھا۔

"کیا بات ہے، آپ کچھ اداں دکھائی دیتی ہیں؟" اس نے ہمدی سے کہا۔
 ہمدی کے چند لفظوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اور قبیلہ کی آنکھوں میں آنسو چھپک
 آئے۔ مگر اس نے کمال ضبط سے انھیں پلکوں کی چمکنے کے بیچے ہی روک دیا۔ اس نے
 آنسوؤں کو بہنے نہ دیا۔

سہیل بے چین اور مضطرب ہو گیا۔
 "آپ کی آنکھوں میں آنسو؟"

"نہیں — نہیں تو —" قبیلہ نے بنیادی مسکراہٹ لبوں پر لا کر کہا۔
 "اس تلفظ کو جانے دیں۔ سچ بتائیں کیا ہوا۔ دفتر میں کسی نے کچھ کہا آپ سے؟"
 غصے سے بولے، لیکن اس نے کہا۔

"نہیں آپ کا وہم ہے، ایسی تو کوئی بات نہیں!"

"وہم — وہم — آخر یہ وہم بلا کیل ہے؟ —" وہ طیش میں آگیا۔
 "میں آپ کا اندرہ چہرہ ادا آنسو پھیری آنکھیں دیکھ رہا ہوں، ادا آپ اسے وہم کہہ کر
 ٹال رہی ہیں۔ آپ کس کو بے وقوف پانا چاہتی ہیں؟" مجھے یا اپنے آپ کو —

”اپنے آپ کو ——— بے ساختہ شبیلہ کے منہ سے نکل گیا۔
وہ دم بخود ہو گیا۔ شبیلہ کے ایک ہی فقرے نے اس کی زبان بند کر دی تھی۔
وہ بولا۔

”آخر کیوں؟ — کیا ضرورت پر لگی ہے آپ کو بے وقوف بنانے کی؟
کچھ تپہ بھی تو چلے۔“

”پلیز — اس قہقہے کو جانے دیجئے۔“ مجھے دکھ پہنچا کہ آپ کو کیا ملتا ہے۔
میں — میں سہیل صاحبہ — کچھ نہیں کہتا چاہتی — کچھ نہیں سننا چاہتی
— میری طبیعت سخت خراب ہے برائے ہر بات یہ بتائیے آپ نے مجھے کس لیے
کہا یا ہے۔“

”باقی کتنے کے لیے۔ وہ جھٹکا سا گیا۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ کیا ایک منزل سے دوسری
منزل پر پہنچنے والے ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ جیسا میں ہوں اور کیا نئی منزلیں دکھانے والے
ایسے ہی ہوتے ہیں جیسی آپ ہیں۔ کیا اسی طرح منزلوں کو تماشہ کیا جا سکے۔ اتنا حقیر سلوک
تو اس سے بھی نہیں کیا جاتا جس سے کوئی پرانی عداوت ہوئے۔ سہیل کے چہرے
پر رخ و غم کی پرچھائیاں تھڑک رہی تھیں اور وہ دل کو پکڑے بیٹھا تھا شبیلہ نے اُسے
دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے دل کو مسمیٰ میں لے کر مسلمانا شروع کر دیا ہو۔ اس
کا رنگ اڑ گیا۔ دل کی دھڑکن کچھ اور تیز ہو گئی۔ وہ بے حد اس سی ہو گئی۔

”آپ ہنسیں گی نہیں۔ اس کا بوجھ بہت ہی اندر دھکا۔“ اتنی بے رخی بھی اچھی
نہیں ہوتی۔“

وہ اس کے بوجھ کے انتہاء درد، اور کڑکڑاہٹ سے بے چین ہو کر غیر ارادی طور پر
فوراُٹ بیٹھ گئی۔ جانے اس کی آواز میں کیسا سحر تھا۔ جس نے اُسے بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا
”شکریہ! — آپ نے میری اس خواہش کو تو نہیں ٹھکرایا۔ وہ کھویا ہوا

سلہ کھائی دے۔ مٹھا، آکپہ شکل مٹتی دل فریب اور محسوم ہے! کاش، طبیعت بھی آتی محسوم ہوتی۔

”اس مومن کو میں پسند نہیں کرتی۔“ اس نے سر دلیچے میں کہا۔ وہ اس کی بات سے ایک بار سچر جھٹکا گئی تھی۔

”آپ جانے کس کو پسند کرتی ہیں اور کس کو نا پسند؟“ اس کے لیے میں معنی خیز طعنے سناتا۔

”ہلنر! کام کی بات سمجھیے۔“

”ہونہہ! کام! —“ اس نے سختی سے کہا۔ کاش آپ کے سامنے انسان نہ ہوتے صرف مٹینس، ہوتیں جن سے آپ سر نکرا نکرا کر آتا جاتیں۔ ادا انانوں سے ملنے کی شدت سے آرزو مند ہوتیں۔“

”شاید آج آپ نے پہلے کا موڈ بنالیا ہے! —“ وہ اسے شاکی نظروں سے دیکھ کر بولی۔

یہ ایک اٹھے اپنے رعبے پر شدید ندامت کا احساس ہوا۔ اور وہ مضطرب ہو گئی۔

”کیا کہا آپ نے! میں پہلے لگا ہوں —“ وہ رنج و غم میں ڈوب کر بولا۔ اس نے اسے غور سے دیکھا۔

”مگر یہ کیا۔ آپ نادام کیوں ہیں۔ آپ کے چہرے پر پشیمانی کا رنگ کیوں بکھیرا ہے۔“

”اس جملے سے وہ کچھ اور سرخ ہو گئی اور بمشکل نظریں اٹھائیں

”معافی چاہتی ہوں!“ اس کے لیے میں شدید تاسف سناتا تھا۔ ”مجھے ایسا نہ کہنا

چاہیے تھا۔“

”آپ جو جی چاہے کہہ سکتی ہیں میں تو سر دسلوک کے گھاؤ کھلنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ شاہینزخوں کی زیادتی کی وجہ سے بہک بھی گیا ہوں۔ سوچتا ہوں آج بہک ہی جانا چاہیئے، بس جان لیجیو کہ میں آپ کو چاہتا ہوں — اور تاقیامت چاہتا ہوں گا — زندگی کے آخری سال تک — میں اب کسی کو یہ مقام نہیں دے سکتا۔ جو میں آپ کو دے چکا ہوں۔ آپ میری زندگی کی ایک اہم حسرت بن گئی ہیں اور زندگی کے لیے مسافر سے علیحدگی موت ہوتی ہے۔ اس سے شدت جذبات سے دل کا سارا غبار باہر نکال دیا۔ اور وہ راز عیاں کر دیا جسے چھپانے کی کوشش میں وہ معطل رہے ہیں اور مضطرب رہنے لگا تھا۔ اس نے وہ راز کہہ دیا۔ جس کی نقاب کشائی کے لیے وہ خود میں ہمت نہ پاتا تھا۔ اُسے حوصلے نہ ملتے تھے۔ شبیلہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا — اس پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ اس کے لب لرزے لیکن ان سے کوئی بات نہ نکل سکی۔

زندگی کا کیسا بوڑھا جس پر وقت نے اسے لاکھڑا کیا تھا۔ سہیل کی بات گرجے اس کے لیے غیر متوقع نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے لیے کئی باریہ بات کہنے کے لیے چلی ہیں۔ اس نے یہ راز کہنا چاہا ہے۔ لیکن ہر بار اس نے جان بوجھ کر ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ کہ وہ یہ بات دل کے اندرونی گوشوں سے باہر نہ نکال پائے۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس بات کے برملا اظہار کی، یا اسے سننے کی اپنے میں قوت نہیں پاتی تھی۔

سہیل ایک سرمایہ دار خاندان کا لالہ ابائی سا لڑکا تھا۔ اور وہ ایک غریب خاندان کی محبوبہ اور بے بس لڑکی۔

وہ اپنے آپ کو، اپنے خاندان کو سرمایہ داری کی دہلیز پر جھکا ہوا دیکھتا نہیں چاہتی تھی۔ سیم زندگی چکا چوند پر اپنے آپ کو قربان کرنا اُسے منغلبد نہ تھا۔

سہیل بے شک ایک حساس لڑخوان تھا۔ لیکن ایک امیر زادے کی محبت اس کا احساس کفہ دن باقی رہے گا۔ اس میں کتنی پائیداری ہو سکتی ہے۔ شبلیہ کسی وقتی جذبے کے تحت مستقبل کے غم بردہ نہیں چاہتی تھی۔
وہ اس آگ سے الگ دور رہی رہنا چاہتی تھی۔

اس سے اپنا دامن بچانا چاہتی تھی۔
اگر کبھی اس کے دل میں سہیل کے لیے کوئی جذبہ اُبھرنے بھی لگا تھا تو اس نے اسے سختی سے سُدا دیا تھا۔ اس آواز کو دیا دیا تھا جو کبھی کبھی اس کے دل میں ایک خاموش سی لہر بن کر سرگوشی کرتی تھی۔
”زندگی کو فاضل سوچنے کی نذر نہ کرنا چاہیے؛ ———“ وہ اُسے خیالوں میں گم دیکھ کر بولا۔

”زندگی سوچوں کی قطع ہی قہر ہے؛ ———“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولی؛ جو لوگ سوچ سمجھ کر قدم نہیں اٹھاتے۔ ہمدیہ ٹھوکر ہی کھاتے ہیں۔ ———“ یہ کہہ کدہ اٹھی اور دروازے کی طرف تادم بڑھانے لگی۔

”سینے؛ ———“ وہ پیچھے سے پکارا۔ اس کے قدم رک گئے۔
”آپ سوچ سمجھ کر جو بھی فیصلہ کریں گی مجھے منظور ہوگا۔ چاہے وہ فیصلہ سن کر مجھے تڑپ لگنا پڑے۔“

”وقت فیصلہ خود کر دیتا ہے؛ ———“ اس نے گھومے بغیر کہا۔
”اپنی امانت تو لیتی جائیے؛ ———“ وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولا۔ اس کے قدم رک گئے۔

”کیسی امانت؛ ———“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔
”وہ جی جی جوکل آپ ٹیکسی میں بھول گئی تھیں۔ ———“ اس نے یاد دلایا۔

وہ اہستہ سے پلٹی۔

”یہ میری نہیں آپ ہی کی ہے۔“ ایسے آپ ہی نے خرید لیا تھا۔ وہ بخیرگی سے بولی اس نے کئی جرسی کو خانہ تنہا کیسی میں چھوڑ دیا تھا کہ اگر وہ جرسی گھر لے گئی تو اس سے کئی سوالات کئے جائیں گے۔ اور وہ گھروالوں کو کسی قسم کے شک کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

”مگر خسر بھائی تو آپ کے لیے ہی تھا۔“ اس کا لہجہ رنجیدہ تھا۔ اس کی اس مناورت سے سہیل کے دل پر چوٹ سی لگی تھی۔ وہ اس قسم کے سلوک کا قطعاً متوقع نہ تھا۔ اس کے چہرے پر انسر دگی پھیل گئی۔ شبیلہ نے انکاپیں اٹھا کر اس کا جائزہ لیا۔ اُسے اس کی رنجیدہ حالت سے بہت صدمہ سا پہنچا۔

”اچھا! لائیے!۔“ وہ نرم لہجے میں بولی۔ کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں اخلاق سے عاری ہوں۔

اس کے ان الفاظ سے سہیل کے چہرے پر چھائے ہوئے انسر دگی کے بادل چھٹ گئے۔ اطمینان اور سکون کی لہر دوڑ گئی۔

وہ بجائے بجائے سے پردہ خانہ میں آگے بڑھی۔ اس کے ہاتھوں سے وہ لفافہ لیا جس میں جرسی تھی اور واپس پلٹ کر نیز تیر قدم اٹھاتی باہر آ گئی۔

آپنی آپ اتنی بن سند کر کہاں جا رہی ہیں؟ قصد کے قریب کھڑی ہوئی بجھی
 نے شبیلہ سے پوچھا۔ اس کے ان الفاظ سے شبیلہ بھر مار گئی۔ اور اس کے ہلکے سے میک اپ
 زدہ چہرے پر خفت کی لہر بکھر گئی۔

”اتنی کہاں بنی سندی ہوں۔۔۔۔۔ اس نے خفت کو ایک دل کش مسکراہٹ
 میں چھپا لیا۔ ”سادہ سی ساڑی ہے، ہلکا سا میک اپ ہے۔“

”ہائے اللہ آپنی!۔۔۔۔۔ وہ بولی۔ ”آپ تو اس طرح بھی قیامت دکھائی
 دے رہی ہیں۔“

قصد مسکرا دیا۔ اور شبیلہ اس کی طرت دیکھ کر شرم و حیا کی تصویر بن گئی۔ پھر اس نے
 آگے بڑھ کر بجھی کے گال پر ہلکی سی تھپکی لگائی۔

”چل شریر کہیں کی؟“ اور وہ آگے بڑھ گئی

”بیٹی کہاں چلی ہو!۔۔۔۔۔“ رابعہ بیگم نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر اس

سے کہا۔

”اچھا! ایک جگہ جائے کی پارٹی ہے۔“ وہ ماں کو پیار سے دیکھ کر بولی۔ بس وہی

جاد ہی ہوگی۔

”اپنے ابا سے اجازت لے لیا کرو بیٹی! ——— رالیوہ گیم بولیں۔ تمہارے د۔

پوچھ کر جانے سے ان کا دل بُرا سا ہو جاتا ہے۔ وہ گھنٹوں سوچوں میں ڈوبے رہتے ہیں۔“

”اچھا! ——— وہ بچوں کی طرح اٹھلائی۔“ ”اُس سے اجازت نہ کر ہی

تو جاتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے بیٹی! ———“ یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے۔

شبیلہ بھی باہر چلی گئی۔ اس نے بڑے پیار کا اظہار کر کے اپنے والد سے جانے کی اجازت لے لی۔ اور باہر آکر بس پکڑی بھڑکی دیر کے بعد وہ ریگل مال کے بس اسٹاپ پر اتری اور آہستہ خامی سے چلتی ہوئی، شیزان کے قریب ہونے لگی۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد شیزان کے سامنے اپنی مرسیڈز کے قریب کھڑا ہوا اُسے راحیل دکھائی دے گیا تھا۔ جیسے وہ بڑی بے تابی سے اس کا منتظر تھا۔

راحیل نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔ لیکن شبیلہ کی طرف سے کسی قسم کی گوجوشی

کا اظہار نہیں ہوا تھا۔

وہ چہرے پر منتانت لیے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کی طرف آرہی تھی۔

چند منٹوں کے بعد وہ اس کے قریب آکر رک گئی۔

”میں تو سمجھا تھا۔۔۔۔۔ وہ مسکرا کر بولا۔“ ”شاید آپ نہ

آئیں گی۔“

”وعدہ کر لیا تھا۔۔۔۔۔ وہ آہستگی سے بولی۔“ اس لیے ہی آنا

دولوں آگے بچھ چلتے شیزان کے گھٹ میں داخل ہوئے۔
 آہستہ چلتے ہوئے ایک کارزدانی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ خاموش خاموش نگاہیں
 ایک دوسرے کا جاڑو لیتی رہیں اور جھکتی رہیں۔۔۔ اور بھگتی رہیں۔۔۔
 ”کیسے بڑا خاموشی کا سحر توڑ کر بولی۔“ وہ کون سی باتیں ہیں۔ من کیلے
 آپ نے مجھے یہاں بلایا ہے۔“

وہ اس کے متین انداز سے گھرا سا گیا۔ اس ایرکنڈلش حڈ ہال میں بھی اُسے
 ہلکے سے پسینے کا احساس ہوا۔

”سکون سے بیٹھتے تو سہی۔۔۔“ وہ اپنی حالت کو بمشکل قابو کر کے بولا
 ”باتیں بھی بوجائیں گی۔۔۔“ پھر اس نے سامنے کھڑے ہوئے ایک ویٹر کو
 اشارے سے بلایا۔

”کیسے، آپ کیا پینا پسند کریں گی؟“

”کسی چیز کی خواہش نہیں ہے۔“

”کلفت کی بھی مدد ہوتی ہے۔“

”کہا تو ہے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“

”چائے لے آؤ!۔۔۔“ بالآخر اس نے ہیرے کو اپنی مرضی سے۔
 آرڈر دے دیا۔

”بہتر حنفہ!۔۔۔“ ویٹر ادب سے بولا۔ اور ہر ڈر کی تکمیل کے لیے چلا

گیا۔ اس اثناء میں دولوں کے درمیان خاموشی پھیلی رہی۔ سکوت کے پردے۔۔
 حائل رہے۔ دولوں کچھ سوچ رہے تھے۔ جالے کھینسی سوچیں ان کے پردہ ذہن پر
 سحر کر رہی تھیں۔

”چائے آگئی!۔۔۔“ اس کے ساتھ کھانے کے لوازمات بھی آگئے۔

شبیلہ نے چائے بنائی۔ ایک کپ راحیل کے آگے رکھ دیا۔ اور ایک اپنے آگے رکھ لیا۔ جب شبیلہ چائے بنا رہی تھی تو راحیل اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

خاموشی کا سلسلہ اسی طرح قائم رہا۔ ایک الجھن سی چہرے پر اسی طرح پھیلی رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے شبیلہ کو یہاں بلایا تھا۔ یہ خوشگوار فضا منتخب کی تھی۔ مگر وہ کچھ بھی کہنے کی جرات نہ پا رہا تھا۔ یہ پُرسکون فضا بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس کا حوصلہ استوار نہیں کر رہی تھی۔ وہ گھبرا سا گیا تھا۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور چائے سے اٹھتی ہوئی گرم بھاپ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بھاپ ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بھاپ کپوں سے اٹھتی ہوئی آرمی ترجمی لکیروں میں اوپر جاتی تھی اور فضا میں تحلیل ہو جاتی تھی۔

”یہاں کی ہر چیز فانی ہے!“ وہ دھیمے لہجے میں بڑبڑایا۔

شبیلہ نے نظریں اٹھائیں۔ اسے ایک ایسا دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔

”خلوص تو فانی نہیں ہے۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

”خلوص سچی فانی ہے۔ جب تک انسان زندہ رہے گا۔“ خلوص بھی زندہ

رہے گا۔ جب انسان فنا ہو جائے گا۔ خلوص بھی فنا ہو جائے گا۔“ ہاں البتہ۔

”وہ سوچ کر بولا۔“ کہتے ہیں محبت فانی نہیں ہے!“

”اگر محبت کو فنا نہیں تو خلوص بھی فانی نہیں ہے۔“ وہ شیریں لہجے

میں بولی۔ محبت خالص ہے۔ خلوص سچی خدا ہے۔ اور خدا کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔

”اور اچھا فلسفہ بیان کیا ہے آپ نے۔“ وہ اُسے تعین آمیز لہجے

میں غصیلے ہوا، ”مجھے آج آندانہ ملا۔ آپ بے حد ذہین بھی ہیں۔“

وہ اپنی تعریف پر لگا گئی۔ شرم دھیا کے رنگ اس کے چہرے پر بکھرتے گئے

راحیل نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شفاف مسکراہٹ لہرانے لگی

پھر انہوں نے چائے کے کپ اٹھالیے۔ اور ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھتے ہوئے چائے پینے لگے۔ راجہ اپنے دل کی بات کہنے کے لیے کوئی موضوع تلاش کر رہا تھا اور اس موقع سے فائدہ اٹھانے والا تردد اس کے چہرے کو اپنی پیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ ہوٹلوں سے باہر سڑکوں پر شام کے ہنگامے پر دس پارہے تھے۔ شام ہوتے ہی انسان کا ہجوم سیر و تفریح کی غرض سے سڑک پر پھیل گیا تھا۔ جوہر آن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے موسم کچھ سرد سا ہو گیا تھا۔ اور خوشگوار ہوا ختم ہونے کے دھیمے دھیمے جھرنے شام جان کو تازہ کر رہے تھے۔

سہیل نے مال کی ایک خوبصورت دکان کے سامنے اپنی کار روک دی اور اتر کر دکان کے اندر چلا گیا۔ اُسے شاہدہ کے لیے ٹافیاں خریدنی تھیں، وہ قریب قریب رند ہی شاہدہ کے لیے ٹافیاں لے کر جایا کرتا تھا۔ اُسے شاہدہ سے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ بھی اُسے بہت چاہتی تھی۔ دلوں میں بھائی ایک دوسرے کو بہت ہی پیارے لگتے تھے۔ دلوں کی عادتیں ایک جیسی تھیں۔ شوخ اور چمپل۔

اس نے ٹافیاں کا پکیٹ خریدا اور دوسری رو سے ہو کر دکان سے باہر آئے۔ لگا۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر اپنی دمن میں مست آ رہا تھا۔

اجانک ناخسہ اس کے آگے آگئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر ناخسہ کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی

”ادہ! آپ! — وہ بوجھلا سا گیا۔ کیا خریدنے آئی ہیں۔“

”آپ؟ —“

”یوں ہی ضرورت کی چند چیزیں —“ وہ موسیقی لواز آواز میں

لگاؤ سے بولی۔

”ضرورت کی چند چیزیں! —“ وہ ہنسا! میک اپ کا سامان! —

اور کیا ہو سکتی ہے آپ کی ضرورت؟“

”ہوں۔ وہ جوٹ بیکر شریپل سے انداز میں بولی

”تو پھر خریدیے! —“ وہ اگے قدم بڑھا کر بولا۔ ”میں تو چلا —“

”مٹھریے! —“ وہ بولی دساتھ ہی چلتے ہیں۔“

”مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“ وہ جان چھڑانے کے سے انداز میں

بولا۔ ”دیر ہو جائے گی۔ خواتین چیزوں کی خرید میں اس طرح گم ہو جاتی ہیں کہ انہیں۔۔

وقت کا احساس ہی نہیں رہتا۔“

”بڑا تجربہ ہے آپ کو ان باتوں کا۔“ وہ مسکرا کر پیار بھرے لہجے

میں بولی۔

”ذاتی تجربہ تو کوئی نہیں ہے۔“ وہ جھینپ کر بولا۔ ”دیکھتے ہی ہیں۔ مکان

میں کھڑی کتنی دیر دیر تک خواتین چیزیں خریدتی رہتی ہیں۔ اور ان کی پسند کا لانا ہی

سلسلہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔“

گہرائی میں نہیں؟ وہ پیار سے بولی — ”میری پسند کا سلسلہ جلد ہی ختم ہو

جائے گا۔“

”پھر بھی کچھ نہ کچھ تو ذرا لگ ہی جائے گی۔“ وہ اٹھن میں پڑتے

ہوئے بولا۔

”جتنی دیر آپ نے باتوں میں لگا دی ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”اس سے کم دوڑیں خارغ

ہو جاؤں گی۔ یہ بات جلد ہے کہ آپ مجھے ساتھ لے جانے سے گریز کرتے ہوں؟

اس نے برا سامنے بنایا اور اپنی بات کا رد عمل سہیل کے چہرے پر تلاش

کرنے لگی۔

وہ اس طنز سے کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

آپ کو ساتھ لے جانے میں مجھ کیا عاص ہے۔ اس نے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔
 تو پھر آپ جلدی سے فارغ ہو جائیں چلتے ہیں۔

ناخروہ کے چہرے پر رونق آگئی اور فرحت و انبساط کے رنگ لہرا گئے اور اسے
 مسکراتی ہوئی قاتل نگاہوں سے دیکھا۔ پھر وہ آگے بڑھی۔

اور چند ہی لمحوں میں کچھ چیزیں خرید کر واپس پلٹ آئی۔

”کیوں! —“ وہ مسکرائی — ”جلد ہی فارغ ہو گئی ہوں نا!“

”واقعی! —“ وہ بھی مسکرایا — ”آپ نے بڑی پھرتی کا ثبوت

دیا ہے۔ —“

لفظ پھرتی پر اس نے لہجہ کرکڑن مچھکائی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی
 باہر آگئی۔

ناخروہ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی اور سہیل نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گاڑی
 چل پڑی۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ؟ —“ وہ کنکھیوں سے دیکھ کر بولی۔

”گھر! —“

”اتنی جلدی بھی کیلے؟ —“ وہ نشیلے لہجے میں بولی۔ ”موسم کتنا۔۔“

”سہا پہلے۔“ تنخوڑی دیر شیراز میں بیٹھتے ہیں، ٹلٹلے رہے گا۔

”مگر! —“ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔

”یہ تو آپ نے بتا دیا ہے کہ کوئی کام نہیں ہے۔“ وہ مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے

بولی۔ ”آپ محض گھر جا رہے ہیں۔ مجھ سے جان چھڑانے کے لیے کام کا بہانہ بنا دیا۔“

”سچا آپ نے —“

”وہ آخری جملہ کہتے کہتے سنجیدہ ہو گئی تھی اور وہ شرمندہ سا ہو گیا تھا۔“

مجبوراً اُسے پریشان کر دیا تھا۔ اس لیے اسے اب اخلاقاً مہجور کی منزل پر بداشت کرنی تھی۔

”میں تو دماغ آپ سے مذاق کر رہا تھا۔“
وہ ہنس دیا۔ اور گاڑی شیران کے سامنے روک دی۔

فاخرہ بھی پہننے لگی

وہ دردِ اندھے سے گزر کر دل میں داخل ہوئے اور میزوں کی روکے بچ چلنے لگا۔
دماغِ سہیل کی نگاہِ راحیل پر بڑی پھر اس سے پھسل کر شبیلہ پر مڑ گئی۔ اس نے انھیں
کوٹنے والی میز پر بیٹھ دیکھ لیا تھا۔ اس کا رنگ خج ہو گیا۔ اندول تیزی سے دھڑکنے
لگا۔ بے کلی اور اضطراب نے اُسے گھیر لیا۔ اعصاب سسنا نے لگے جسم میں کپکپی سی پیدا
ہو گئی۔

وہ توقع بھی نہ کر سکتا تھا کہ شبیلہ یوں بے حجابانہ اس کے بڑے بھائی کے ساتھ
ہوئی میں آکر بیٹھ جائے گی۔ پھر کیا ایک اُسے مدد کا شدید احساس ہوا اور دل سے
ٹھیس سی اٹھنے لگیں۔ اس کا چہرہ اندر کی بجائے چارگی اور بے کسی میں ڈوب گیا۔ وہ ایسا
انداز میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس کے پاؤں بے مروتی ہو گئے۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ قدم
نہیں اٹھا سکتا۔ اس نے جن راہوں پر شبیلہ کے ساتھ چلے کا سوچا تھا کیا ان راہوں پر
راحیل اس کا ہمسفر بن گیا ہے؟

یہ خیال اس کے لیے سوہانِ روح بننے لگا تھا اور اُسے دل سینے میں ڈوبتا ہوا محسوس
ہونے لگا وہ سینے میں شرابور ہو گیا۔ راحیل نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا۔ سہیل کو فاخرہ کے
ساتھ دیکھ کر اس کے چہرے پر سکڑا ہوا کچھ ناخوشی کے چراغ روشن ہو گئے تھے۔ سہیل اور فاخرہ۔ ناخوش
اور سہیل۔ اچھی جوڑی ہے۔ خدا نظر بے سے بچائے۔ اس کی قوتِ تخیل کی پرواز کسی اور
سمت تھی۔ وہ فاخرہ اور سہیل کی محبت کو محسوس کر کے انھیں اکٹھے ہوئی میں دیکھ کر مسرور

ہو گیا تھا اہل دل سے چاہنے لگا تھا کہ وہ لڑکی شہر کی زندگی بن جائیسی، خاطر مگر چہرہ پر
سو اے شرم و حیا کے اور کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ وہ راحیل کو دیکھ کر شرم و حیا کا
پیکر بن گئی تھی۔ اس کے علاوہ اُسے اور کسی جذبے سے دو چار نہ ہونا پڑا تھا۔

اور
تنبیلہ

اس کا برا حال تھا۔ اس نے سہیل کی بدلتی حالت کو سمجھنا ہی لیا تھا۔ وہ اُسے ہوش
میں دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ پریشان ہو گئی تھی۔ اُس کی رنگت اور کئی مٹھی جسم میں پکیسی طاری ہو
گئی تھی۔ ہونٹ لرزنے لگے تھے۔ پسینہ چہرہ پر تیزی سے اُٹنے لگا تھا۔ دل کی دھڑکن
بہت ہی تیز ہو گئی تھی۔ اُسے دو آنکھوں سے سالۃ پڑا تھا۔ ایک لڑیہ کہ سہیل اُسے راحیل
کے ساتھ دیکھ کر غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ دوسرے وہ فاحشہ کو اس کے ساتھ دیکھ
کر گھبرا گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ لڑکی کون ہے اور سہیل سے اس کا
کیا تعلق ہے ؟

ایک ہی قسم کے چہرے دونوں طرف چل رہے تھے۔
اس نے سہیل کی طرف سے نظریں اٹھا کر پریشانی سے مسکراتے ہوئے راحیل
کی طرف دیکھا۔

”کیا آپ سہیل صاحب کے ساتھ والی لڑکی کو جانتے ہیں ؟ اس کے منہ سے
غیر ارادوی طرز پر نکلا۔

”ساحل، چوڑا اور اداس دھڑے لگا ہیں ہٹا کر اُسے دیکھا۔

”وہ میری آنٹی کی لڑکی نالہ ہے۔ اور سہیل کو بے حس و جاہتی ہے۔ وہ شیریں

لہجہ میں بولا۔

”اور سہیل ؟ اس نے یوں پوچھا جیسے اس کی زندگی کا اختیار اسی سوال کے جواب

پہلے:

”ظاہر ہے۔ ایک دوسرے کو چاہتے ہی ہوں گے۔ وہ مسکرایا: چائے پیئے اکتھے ہی ہوئی میں آئے ہیں۔“

”یہ ضروری تو نہیں۔۔۔ اس نے اپنے دل کو ڈھانسی دی: اب ہم بھی اکتھے آئے ہیں، ہم میں تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔“

شبیلہ کے اس جواب سے راجل زبرد سے چونکا۔ پھر اس کا چہرہ ایک دم —
افسردہ ہو گیا۔ ایک ہی لمحے میں اس کے نقورات کے محلات فنا ہو گئے، جو اس نے شبیلہ کے لیے سجائے تھے وہ ارادے ہی مٹ گئے، جن سے وہ شبیلہ کو آکھ کر ناچا ہوتا تھا۔ وہ خیال ہی سو گیا جسے وہ شبیلہ کے گوش گزار کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی محبت کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ اسے اپنا بنانے کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ وہ تو اس سے لمبی چوڑی باتیں کرنا۔ چاہتا تھا، خلوص و دنیا کی، محبت اور امتداد کی، لیکن شبیلہ کے ایک جھلنے جیسے اس کے۔۔۔ سارے عزائم خاک کر دیئے تھے۔ ادا سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بلندی سے کسی گہرے کھڈ میں گر پڑا ہے۔ اس کاوصلہ چمین گیا تھا۔ وہ دلولہ ہی سو گیا تھا۔ جسے برصغیر کا لاکر وہ اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ خواہشوں، ارمانوں، تمنائوں اور آرزوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ وہ ادا سیوں میں ڈوب گیا تھا۔ چند ثانیوں بعد اس نے خود کو سمجھایا۔ اور سہیل ادا خاں کی طرف دیکھا۔

”بہیں آ جاؤ سہیل۔۔۔“ اس نے جہاں تک ہو سکا اپنے لہجے کو نرم بنا کر کہا۔ ”دل میں کھڑے کیوں رہ گئے۔ اور سہیل راجل کی آواز کے سہارے اس طرح آگے بڑھا جیسے حالت خواب میں چل رہا ہو۔ با اسے ہنسا مٹ کر دیا ہو۔ فاختہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چل دی۔“

”وہ ان کے قریب جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اور ان کے درمیان سکوت کے دھنیز

پر دے پھیل گئے، راجیل نے ناخوہ کا تقارن شبیلہ سے کر لیا۔ ناخوہ نے خوشی کا اظہار کیا مگر شبیلہ کا ریتاؤ خشک تھا۔ اس نے کسی طرح کے تپاک کا اظہار نہ کیا تھا۔
 تعارف کے بعد پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ سہیل پر گہری انسو رگی سی مسلط تھی۔
 شبیلہ بھی حینا تکی کش مکش میں مبتلا تھی۔ اور سلام خیر لگاؤوں سے ناخوہ اور سہیل کو دیکھتی تھی۔ اس کے چہرے سے دبے دبے غصے اور جوش کا اظہار ہو رہا تھا۔ راجیل اور ناخوہ بالکل بے پردہ بیٹھ تھے۔ سہیل ہاں میں بیٹھ ہوئے حسین جوڑوں کی طرف نظریں کئے بیٹھا تھا۔ اُسے شبیلہ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔ وہ ناخوہ کی موجودگی کو بھی نظر انداز کئے ہوئے تھا۔ اُسے سوائے دل میں اٹھنے والا مدد جزر کے اور کسی قسم کا احساس نہ تھا۔
 شبیلہ نے اس کے ارمانوں میں الگ بھر کلاسی تھی۔ اس کے دل کے گلشن کو خزاں اٹھا کر دیا تھا۔ اس کی ارنوؤں تھناؤں اور ارمانوں کی کلیوں کو مکمل کے رکھ دیا تھا۔ بھول بیٹھنے سے پہلے ہی کلیاں خزاں کی نذر ہو گئی تھیں۔



تیزان کا ہاں چائے کی آہنی بوتلی سیوا پہ اور گرم بھونک دھماکتہ سے دھک رہا تھا۔ جیسا کہ بجلی اور نقور آہستہ خرامی سے ہاں میں داخل ہوئے۔
 دواؤں سے مکھنے والی سیٹیوں پر بیٹھ لگاتے بیٹھ بیٹھ اپنا نک بجی نے شبیلہ کو دیکھا۔
 شبیلہ کی نظریں بھی اٹھیں بجی کی نگاہوں میں خوشی اور شبیلہ کی آنکھوں میں پشیمانی پھیل گئی۔
 ”آپ! —————“ ”بجی کے منہ سے بے اختیار نکلا! —————“ ”آپ! —————“

”بیباں! —————“

ایک پھکی سی مسکراہٹ شبیلہ کے ہونٹوں پر پھیلی اور معلوم ہو گئی۔ جس میں نہایت کاغذ خراب تھا۔

نقور نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے شبیلہ کو حیرت سے دیکھا نجی کی کواڑ سے
اسے ادھر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔
”شبیلہ بہن! ————— وہ میزبانہ لہلا، شبیلہ نے اُسے شرمیلی شرمیلی نظروں سے
دیکھا۔

”حیرت کا، ظہار کیوں کر رہے ہو؟ ————— وہ ندامت کو اپنے اونچے
در لطیف لہجے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی: ————— اب
آگئے ہو ————— تو اسی میز پر آ جاؤ! —————
نقور اور نجی بھی اسی محفل میں شریک ہو گئے۔
محفل جو اداس تھی، غمگین تھی، اور جس میں آدمیوں کے امانے کے ساتھ تھا
افسردگی پھیلتی جا رہی تھی۔

”یہ کیسی محفل تھی جس میں شامل ہر شخص مغموم اور دل گرفتہ سا نظر آتا تھا جیسے
یہاں زبردستی لایا گیا ہو جیسے سزا کے طور پر بٹھایا گیا ہو۔ سب ایک دوسرے کو چور
نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سب اپنے اپنے دل میں پشیمانی اور پریشانی کی لہریں۔
اتھکتی ہوئی محسوس کر رہے تھے۔

ہر ایک شخص دل گرفتہ، مغموم سا تھا۔
لیکن جذبے ہر ایک کے الگ الگ تھے۔

سہیل کے چہرے سے غصہ اور غم ہو رہا تھا، غصہ جو اسے شبیلہ پر تھا، جس نے اس
کی نکالوں کے پیغام کو پذیرائی دینے کی جگہ اس کے بھائی کی محفل میں بیٹھنا پسند کیا۔
تھا۔ عم ————— جو اسے اس بات پر تھا کہ شبیلہ کے رویے اور کردار نے اسی کے اعتماد
کو تھیس پہنچائی تھی، اس کے خلوص اور وفا کو مجروح کیا تھا۔

اس کے برعکس راحیل کا چہرہ سہاٹ تھا۔ وہ محض اپنے دل میں یہ پریشانی

گئیں۔ سہیل کے ہونٹوں پر اندر وہ اور شبیلہ کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل کر
معدوم ہو گئی۔ کوئی کچھ نہ سمجھ سکا۔ کوئی کچھ نہ جان سکا۔ شبیلہ نے گھر میں کہہ دیا تھا
کہ جیسی اس کی سہیلی نے تحفہ میں دی ہے۔ وہ گھر والوں سے بات بات پر چھوٹ
بہنے لگی تھی۔ دل کے چور نے اسے کس قدر چھوٹا بنا دیا تھا۔ اس خیال سے اس کا
دل ڈوبنے لگا تھا۔

”کیا ذکر لے بیٹھی ہو! —“ شبیلہ سر ہلچے میں بولی۔ ”یہ وقت ایسی
باتوں کے لیے نہیں ہے۔“

”جی خفیہ سی ہو گئی اور سہیل نے اسے کہہ ناک لگا ہوں سے دیکھا۔ وہی
کے دل پر شدید چوٹ پڑی تھی۔ وہ اُسے ہر لمحہ غم بخش رہی تھی۔ رنج دیئے جا رہی
تھی۔ اور خود بھی تو رنج و غم کی تیلی بنی ہوئی تھی۔
”شبیلہ بہن! —“ ”تو نے کہا۔“ ”آپ بڑی اداس

اداس سی ہیں۔“
”کبھی کبھی انسان کو اداس بھی ہو جانا چاہیے۔“ وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ”اداس
ہو کر ہی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔“

سہیل نے اسے پھر دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔ لیکن ہونٹوں پر ایک زہریلا مسکراہٹ
فردر پھیل گئی۔ جسے محسوس کر کے شبیلہ نے ایک سرد آہ سہری —
بیرہ جائے لے آیا۔

شبیلہ کے اشارے پر بھی نے چائے بنائی اور اس کا ہاتھ تاخیر نے بنایا پھر
کپ سب کے آگے پہنچ گئے۔ چائے آہستہ آہستہ پی جانے لگی۔ سہیل کا کپ اسی طرح
پیارا۔ تاخیر نے اسے خیالوں میں کھوئے ہوئے قاتل نظروں سے دیکھا۔ اور ہونٹوں
کو ایک دلکش مسکراہٹ سے سجا کر بولی۔

”چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے!“ اس آواز میں بڑا ناز تھا۔

”پیچھے رہنا۔“

”ہوں!“ وہ چٹکا اور چائے کے کپ کی طرف دیکھنے لگا۔

”یوٹا۔“ راحیل نے بتایا کہ ”کپ کی طرف کیا دیکھ رہے ہیں“

اس نے ایک نظر اپنے بڑے بھائی کو دیکھا اور بڑے مضہل انداز میں کپ اٹھا کر بوتلوں سے لگا لیا۔

چائے ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر سکوت رہا۔ سہیل نے سب کی طرف بھیجی نظروں سے دیکھا۔

”میں جانا چاہتا ہوں۔“ اس نے اٹھ کر لاواہ انداز میں کہا۔

”بیٹھو!“ راحیل بولا۔ ”سب ہی چلتے ہیں۔“

”مجھے ضروری کام ہے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”فاخرہ بھی اس کے ساتھ

ساتھ اٹھ کر کھڑی ہو گئی مٹی شبیلہ نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ سہیل نے مدعوئی کھانسر وہ نظروں کی زد میں لے لیا تھا۔

”چلو سیر!“ راحیل بولا۔ ”سب ہی چلتے ہیں۔“

”اس نے دیر کو اشارے سے بلایا۔ وہ لگیا۔“

”یل لاؤ!“ دیر بل لانے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پلیٹ میں

رکھ کر وہ بل لے آیا۔ راحیل نے یل ادا کیا۔ اور وہ باہر آگئے نجی اور شبیلہ پیچھے چھپے تھیں۔

”آئی!۔“ نجی نے سرگوشی کی۔

”ہوں!“ شبیلہ نے اسے استغما میں نظروں سے دیکھا۔

”وہ کون تھا؟“ وہ مسکرائی۔ ”جس کے ساتھ آپ میٹی تھیں۔“

”اُس فرم کا مالک — اس نے اس کی طرف سے نظریں ہٹا کر کہا۔
 ”جس پر میں ملازم ہوں اور جس کا نام سہیل تھا وہ اس کا چھوٹا بھائی تھا۔
 ”آپنی بے — وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ”آپ کی فرم کا مالک بے بڑا
 خوبصورت! —“

”نہجی! — شبیلہ نے اسے بڑے پیار سے ڈالتا۔ تم کس غلط فہمی میں
 پڑ گئی ہو۔“

”نہجی! — خاموشی سے مسکراتے لگی۔
 گاڑی کے قریب رک کر راحیل نے ان کی طرف دیکھا۔
 ”ارے بھئی آپ —“ وہ بولتا پیچھے رہ کر کیا سازشیں کر رہی
 ہیں آئیے انا۔“

”ہاں —“ تصور نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ اب آجھی جا کیے!
 ”چلیے بیٹھے! — راحیل نے اخلاق سے کہا۔
 ”ہم ٹیکسی میں جا بیٹھیں گے۔“ وہ سرد لہجے میں بولی — ”شکریہ!“
 راحیل کے کھئی بار کے اصرار کے باوجود اس نے انکار کر دیا۔

سہیل اپنی گاڑی تک پہنچا۔ اس کے چہرے پر گہرے تلخ تاثرات پھیلے ہوئے
 تھے جنہیں دیکھ کر شبیلہ کا رنگ نئی ہو گیا تھا۔ ایک یا اس سے اس کے چہرے پر مستط
 ہو گئی تھی۔

چند لمحے اس نے اپنی گاڑی کے قریب کھڑے ہو کر شبیلہ کی طرف اداس نظروں
 سے دیکھا۔ اور اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر وہ گھبرا گئی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔
 ”تصور نے یہ سب کچھ دیکھا — لیکن چپ رہا —“ نہجی لاقطعی سی۔
 کھڑی تھی۔

ایک سہرتا جس میں سب اسیر تھے۔

اس انتہا میں فائزہ نے راحیل کے قریب ہو کر آہستہ سے پوچھا۔

”بھائی جان! یہ شبیلہ صاحبہ کون ہیں؟“

”ہمارے دفتر کی ایک کارکن! —“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

راحیل نے دیکھا فائزہ کے لبوں کی پٹکھڑیاں کچھ کھل کھل اٹھیں نہ جانے اس

تنبہ میں طنز تھا یا خوشی؟

سہیل ڈرائیو بگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فائزہ تیزی سے قریب آئی اور دروازہ

کھول کر اس کے برابر وائی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ گاڑی اشارت یعنی اور ایک جھٹکے کے

ساتھ آگے بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے تیز رفتاری اختیار کر گئی۔ جو سہیل کے دل میں اٹھنے

والے جوش کی نماز تھی۔ اس کے جالتے کے بدشبیہ نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور آگے

بڑھ کر ایک ٹکیسی روک لی۔

اس نے بھیجے کچھ انداز میں راحیل کو الوداع کہا۔ اور تصور اور غمی کے ساتھ ٹکیسی

میں بیٹھ گئی۔

دُسر کے بعد افتخار احمد اپنی خواب گاہ میں بے قراری سے ٹہل رہے تھے رات کے نو بج چکے تھے۔ ان کے جدید طرز پر سجے ہوئے کمرے میں تیز روشنی ہو رہی تھی ان کے قدموں کے انداز سے یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ کسی بہت بڑی المیہ میں گرفتار ہوں اور المیہ نہ سلجھ رہی ہو۔ ان کے چہرے پر غور و فکر کی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں جن سے تشویش ناک تاثرات جھلکے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ ایک جگہ رک کر چند ثانیوں کے لیے سوچتے اور بھرپور پڑتے۔ قیمتی قالین پر ان کے قدم بے آواز پڑتے تھے۔ جن سے ان کی سوچ کے سلسلے کو ذرا بھی ضرب نہ پہنچتی تھی۔ اور وہ سوچے ہی چلے جا رہے تھے۔ احوال نگار کے اور ان کے چہرے سے یوں لگا جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہوں۔ وہ دروازے کی طرف آئے اور دروازہ کھول دیا۔

”فضلو! —“ انہوں نے لڑکر کو بلند آواز میں پکارا! ”فضلو! —“

فضلو! —

”چند لمحوں بعد مجھے سے لڑکر کی آواز آئی۔“

”آپا خنود! ———“ وہ آہستہ آہستہ گول زینہ چڑھ کر اوپر آگیا۔ اور ان کے کمرے میں آکر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے باوقار انداز میں فضلو کو دیکھا۔
 ”راہیل اور سہیل گھر میں ہیں ———“ وہ پر رعب آواز میں اس سے بولے۔

”جی حضور! ———“ وہ مؤدیانہ لبولا ———“ اپنے اپنے کمرے میں ہیں! ———“
 ”جادو! ———“ ان کا ہوتہ ملکنت لیے ہوئے تھا۔ ”ابھیں میرے کمرے میں بھیج دو۔“

لڑکر کے جانے کے چند منٹوں بعد راہیل اور سہیل سلیپنگ ڈریس میں بطور اپنے ڈیڈی کے کمرے میں آموچوئے ہوئے۔

”فرمائیے! ڈیڈی! وہ ایک زبان ہو کر بولے۔“
 ”بیٹھو میرے بچو! ———“ وہ گہرے پیار کا اظہار کر کے بولے۔ وہ صوفوں پر بیٹھ گئے۔ افتخار احمد ان کے سامنے بیٹھ تھے۔ ان کے درمیان سکوت بھلایا ہوا تھا۔ راہیل کا چہرہ ہر شاش بنشاش تھا۔ مگر سہیل کے چہرے پر رنج و غم کے باؤل چھائے ہوئے تھے۔ گو وہ کسی مدعیدہ سے رنجیدہ واقع کا بھی زیادہ تاثر لینے کا علوی نہیں تھا۔ مگر شبیلہ کی بے بسی، بے رحمی، اس کے بھائی سے تنہائی میں اس کی ملاقات لانے سے بہت ہی دل برداشتہ کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ اس کیلئے ایک حادثے سے کم نہیں تھا۔ اور حادثوں کے اثر جلد زائل نہیں ہوتے۔

افتخار احمد نے گہری نظروں سے یکے بعد دیگرے دونوں کے چہرے پر دیکھا پھر ان کی نظریں سہیل کے چہرے پر مرقم ہو گئیں۔ اور سہیل نے سر جھکا لیا۔ اُسے ان کی نظریں استہوار محسوس ہوئیں۔

”سہیل بیٹے! وہ بڑے پیار سے مرتضیٰ آواز میں بولے۔“ اتنے امسرہ
کیوں ہو؟

وہ افتخار احمد کے اس محبت آگین استفسار پر کانپ گیا اور مٹ کر میٹ
گیا۔ اور اپنی طرف سے اپنے چہرے کو خوشگوار بنانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔
”میں امسرہ تو نہیں ہوں ڈیڈی! اس نے ہونٹوں کو زبردستی مسکراہٹ
آشاکیا۔“

”تو میری نظروں کو دھوکہ ہو رہا ہے کیا؟“ —۔ پھر انھوں نے پہلو بدل
کر راحیل کی طرف دیکھا۔ کیوں راحیل بیٹے! مہتر اچھوٹا بھائی رنجیدہ دکھائی
دیتا ہے نا؟

راحیل نے نظریں پھر کر غور سے سہیل کو دیکھا اور مسکرایا۔

”لگتا تو یہ بھی ہے ڈیڈی۔“

سہیل نے اپنے بھائی کو پھکی پھکی نظروں سے دیکھا۔ اور پھر اس کے
دیکھنے پر نظریں جھکا لیں۔

”خوش رہا کرو میرے بچو! وہ پیار سے بولے۔ تمہیں خوش دیکھ کر ہی مجھے
راحت نصیب ہو سکتی ہے۔“

پھر وہ خاموش ہو گئے اور سوچنے کے انداز میں باری باری بیٹھے بیٹھے
سہیل اور راحیل کو دیکھتے رہے۔ جب خاموشی ذرا طویل ہو گئی تو انہوں نے کھل کر
انداز میں صوفے پر پہلو بٹکلا۔

”میرے بچو! —۔ وہ ذرا کے اندر پھر بولے،“ میں نے تمہیں اس لیے

بلا یا ہے۔ کہ میں نے آج دلوں ٹیکسٹائل میں فروخت کر دی ہیں۔“

اس غیر معمولی دلوں زور سے چونکے۔ اور مستفسرانہ انداز سے اپنے والد کی طرف

دیکھ لگے۔

”میں چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔ وہ گامات کہہ کے کہنے لگے۔
 ”میں چاہتا ہوں۔ جو چھوٹی چھوٹی ٹہلوں کے بجائے ایک بہت وسیع مل
 کیوں نہ بنائی جائے۔ اداس کے لیے میں نے جگہ کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔“
 یہ سن کر دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اداان کے چہروں سے
 سکون ظاہر ہونے لگا۔

”تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے میرے بچو!۔۔۔۔۔۔ وہ محبت بھری
 آواز میں بولے۔

”ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے ڈیڈی!۔۔۔۔۔۔ وہ ملا ٹھہلچہ میں بولے
 ”جو کچھ آپ کریں گے پھلے کے لیے ہی کریں گے؛
 ”پھر انہوں نے سہل کی طرف دیکھا
 ”تمہاری کیا رائے ہے سہل بیٹے؟۔۔۔۔۔۔

”میری رائے۔۔۔۔۔۔“ وہ سفیدگی سے بولا۔ ”جو آپ کی رائے

ہے۔۔۔۔۔۔

”ڈیڈی آپ کا دوبارہ کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کا جو بھی قدم اٹھے گا وہ
 صحیح اٹھے گا۔“ راحیل اپنے ڈیڈی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ہماری منہ سے بھی آپ
 کے زیر سایہ ہی چل رہی ہے۔“

”اور چلتی بھی رہے گی۔۔۔۔۔۔ وہ غور سے دیر رک کر بولے ”میں تک

بڑی مل تیار نہیں ہو جاتی میں فرم کا تمام کاروبار اور روپیہ پیسہ اپنے تحویل میں
 لے لوں گا۔ تاکہ کاروبار میں اور اچھے پیانہ پر اور اضافہ کیا جاسکے۔

”یہ تو بہت ہی خوشی کی بات ہے ڈیڈی۔ راحیل مسکرا کر بولا۔ اور ان

کے چہرے پر ایک شفقانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

پھر راحیل اور سہیل اجازت لے کر اپنے اپنے کمرے میں آ گئے۔ جب وہ اپنے اپنے بیڈ پر لیٹے تو ان کے ذہن سے کاروباری معاملات خارج ہو چکے تھے۔ اور شبیلہ کی رعنائیوں سے سحر پور شبیہہ بار بار ذہن کے پردے پر منعکس ہوتی تھی۔ اس دل شریب عکس سے راحیل کو سرور حاصل ہو رہا تھا۔ اور سہیل کو انتہائی دکھ اور بے کلی دے چینی کا احساس۔ وہ رنج و غم میں ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ شبیلہ نے اس کے بھائی کے ساتھ ہوٹل میں جا کر اس کی تمام امتیادوں اور آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اس کی حسرتوں کو پامال کر دیا تھا۔ اس کی خواہشوں، ملامتوں کو حبلہ کر رکھ کر دیا تھا۔ اور وہ اس رکھ میں محبت کی چنگاریاں ڈھونڈ رہا تھا۔ جو اسے مل نہ رہیں تھیں۔ رکھ ہی رکھ اس کے سامنے پھیلی پڑی تھی۔

رات گزرتی رہی

اس کے دل کی طرح

حسرتوں میں ڈوبی ہوئی۔

بے چین اور بے کلی سی۔

بھی کبھی سی۔ آخر صبح کا ڈب جھانکنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی وہ نیند کی

کرنیاں دادیوں میں پہنچ گیا۔ نیند میں بھی اس کے چہرے پر رنج و غم کی دھند پھیلی ہی رہی اور گہری ہوتی گئی جیسے نیند میں بھی لاشعور اُسے اذیتی پہنچا رہا ہو۔

شبیلہ

سہیل کے کمرے میں داخل ہوا۔ کھارے گہری نفلوں سے دیکھا
سہیل کو دیکھ کر اُسے یوں لگیے وہ بیمار ہو، جیسے عادت ہی رات میں اُسے کوئی مرض
لاحق ہو گیا ہو۔ اس کی اڑی اڑی رنگت اور گہرے رنج میں ڈوبا ہوا چہرہ دیکھ کر اس
کے دل پر چوٹ پڑی اور ہوک سی اٹھی۔ اس کا دل درد و غم سے بھر گیا، ایک شوخ
و شریر لڑکچان کی اتنی اتر حالت ہو گئی تھی۔ وہ اتنا تلکین ہو گیا تھا، جب وہ غمرہ
سے محبت کو لے رہا ہے تو پھر اُسے کون سے دکھ تھے جن کی چیمین سے اس کی حالت اتنی
پڑمردہ ہو گئی تھی۔ وہ بچہ سا گیا تھا، کھلائے ہوئے چھول کی طرح ہو گیا تھا۔

اس کی اپنی حالت بھی تو مختلف نہ تھی۔ اس کے دل کو بھی تو روگ لگ گیا
تھا۔ وہ بھی تو اس مرض سے نہ بچ سکی تھی جس میں سہیل مبتلا تھا۔ سہیل نے تو کچھ دیر
ننید لے بھی لی تھی۔ وہ تو تمام رات ایک خمار آلودانگہرائی بھی نہ لے سکی تھی۔ بند پکیوں
میں فیبر کا ایک ہلکا سا ہلکورہ بھی نہ آیا تھا۔ احساسِ ذرا بھی غنودگی مائل نہ ہوا تھا۔
بے چینی، اضطراب، اضمحلال، جھکن اور کمندگی کے علاوہ احساسِ کچھ اور ظاہر ہی نہ کر سکا

وہ دل بھر کر لپٹ لپٹ گئے دالی کرسی پر کٹی، برنی شلغ کی طرح گرا۔
 شبیلہ! — وہ گہرے رنج سے بڑبڑلا۔ شبیلہ! شبیلہ! یہ تم نے کیا کر دیا۔ یکسا
 فیلہ ہے۔ جو وقت سے رہا ہے۔ بے شمار منزلوں کے پیچ آئے دالی یہ کسی منزل ہے
 جو دکھ ہی دکھ سمیٹ کر گھولی میں ڈال رہی ہے۔ ادھ جس نے میری محبت کا دامن
 کانٹوں سے بھر دیا ہے؟

وہ بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔
 شبیلہ نے اپنی سیٹ تک پہنچتے پہنچتے آنسو پونچھ لیے تھے۔ اس نے پرس اٹھایا
 اور چل پڑی۔ محلے اُسے عجیب سی نظروں سے گھورا۔ مگر اسے کسی کی پرواہ نہیں تھی
 جس وقت وہ راجیل کے دفتر کے آگے سے نکل رہی تھی تو وہ کسی کام سے باہر نکل رہا تھا
 اس نے غمگین آنکھوں سے شبیلہ کو باہر کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ اس کے سامنے آگیا
 ”آپ جا رہی ہیں؟“ اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔ کیا آپ نے استغفار واپس نہ
 لینے کا فیصلہ کر لیا ہے؟

”جہاں؟“ وہ گہرے غم سے بولی۔ ”میرا فیصلہ اہل ہے؟“
 راجیل اس کی بے اعتنائی سے دلخیز اور سرد مہری سے مجبور ہوا۔ وہ اس
 وقت ہی چوڑکا۔ جب وہ فرم کے مین گیٹ سے باہر نکل کر سڑک پر جا چکی تھی۔ اسی
 نے ایک گہرا سانس لیا۔ ادھ واپس دفتر میں داخل ہو گیا۔ اس کے لبشاش پہرے پر
 گہرے غم کے تاثرات قبضہ کر چکے تھے۔

شبیلہ مضمحل انداز میں دروازے سے گزر کر صحن میں آئی اور پھر سیدھی چلنے
 کمرے میں چلی گئی۔ ادھ پلنگ پر گر کر سسکیاں بھرنے لگی۔ وہ تکیہ پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔
 اس کے آنسو جس سے تکیہ بھیلنے لگا تھا۔ اس کا گداز جسم ہولے ہولے انداز میں مرقش تھا۔
 حالات ہی ایسے رخ پر پہنچ گئے تھے جہاں نے اُسے سسکیاں لے کر روئے۔ پر مجبور کر دیا تھا

وہ اسنو تنھے کہ اُمڈے ہی چلے آرہے تھے۔ بسکیاں تھیں کہ شہر قری ہی چلی جا رہی تھیں
 باہر چلنے کی طرف جاتی، موٹی راجہ بیگم نے اسے نکلے تھکے سے انداز میں اپنے
 کمرے میں گھٹتے۔ کیوں کیا تھا انھیں، ات دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ وہ اتنی پریشان کیوں ہے۔
 اسکی پیچھے ہی کمرے میں آئی تھیں اور اسے اس حالت میں پڑے ہوئے دیکھ کر ٹپک گئیں۔ پھر دیکھ گئیں۔
 رورہی ہوئی تھی! — ”وہ ماما بھرے بلجے میں پولیس —“ کیا ہوا؟

وہ ان کی ماما اور بہن رورہی سے اور زیادہ آنسو بہاتے لگی۔ اس کی ہچکیاں
 بند ہو گئیں۔ نہ اس نے سر اٹھایا اور نہ جواب دیا۔

راجہ بیگم بڑے شفقت بھرے انداز میں اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ اور اس کے
 بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیرنے لگیں۔

”اپنی امی کو کچھ نہیں بتاؤ گی بیٹی! —“ ان کے لہجے میں ماما کی لرزش تھی
 آخر ہوا کیا ہے جو رورہی ہو؟

دروازہ کھلا دیکھ کر ارشد احمد بھی بیدار ہوئے اس کمرے میں چلے آئے تھے۔ وہ ڈاکٹر
 کے پاس سے ہو کر واپس آئے تھے۔ وہ بھی یہ حالت دیکھ کر مضطرب دے چین ہو گئے
 تھے۔ ان کے چہرے سے اُسی حجامتے لگی تھی۔ انہوں نے اپنی بیگم کی بات سن لی
 تھی۔

”بتا دو نا بیٹی! —“ وہ پیار سے پوچھے۔ وہ کیا غم ہے جس نے تمہیں
 روکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کونسا ایسا صدمہ پہنچا ہے جس نے تمہارا یہ حال کر دیا ہے؟
 فالڈی آواز سن کر زور سے چونکی اور تکیے سے آنسوؤں میں بھیکھا ہوا چہرہ اٹھایا
 اس نے آنکھیں سرخ جو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے گلاب کی کھیاں نشنم میں نہا گئی ہوں
 ”ابا جان! — میری سہیلی! —“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”کیا ہوا تمہاری سہیلی کو —“ وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی۔

اس نے والد کو امداد نہاک نکال لی سے دیکھا۔ امداد کے حکم کی تعمیل میں اپنی
 اسی کے ساتھ چلتی ہوئی باجی خانے میں آگئی خیالوں میں ڈوب ڈوب کر پریشان۔
 انداز میں اس نے کھانا تیار کیا، اس کی لکڑیوں کے ساتھ دھند سی پھیل رہی تھی۔
 دھند — خیالات اور لغو بات کی دھند جس میں سہیل کا اداس چہرہ اُبھرتا
 رہا۔ مٹتا رہا۔

”زاویہ پھیلتے رہے۔“

اُبھرتے رہے۔

شبیلہ نے گھر سے باہر آنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ وہ سوچوں میں ڈوبی پہول
ایک ہی جگہ بیٹھی رہتی کسی کے بلائے پر ہی چڑھتی اور اندر دہ چہرے کے ساتھ ہونٹوں پر
پھکی پھکی مسکراہٹ لیے مخاطب کی طرف پریشانی اور حیرت سے دیکھنے لگتی۔ اس کے
دوبارہ بولنے پر ہی وہ اس کی بات کو سمجھتی اس کی حالت روز بروز گنتی ہی جا رہی
تھی۔ اس کے دل کے ایلو الوں میں پریشانیوں نے دبیر کر لیا تھا۔ اس کی کڑوؤں کے
گاکستان میں خزاں رسیدہ ہوا میں سسکیاں بھر رہی تھیں۔ اور تہاؤں کی پھلواری جل کر
راکھ ہو گئی تھی۔ اس دن رات گزر رہے تھے۔

فقو کس جیت کر واپس جا چکا تھا۔ فیصلہ اس کے حق میں ہوا تھا جس روز فیصلہ
بجاء تھا۔ اس نے بڑی حسرت سے انہیں معافی کھلائی تھی شبیلہ کی اندر دہ حالت دیکھ
کس نے ہمدردی کا اظہار کیا تھا کچھ تھا۔

شبیلہ بہن! آپ کو جانے دو چار روز سے کیا ہو گیا ہے۔ آپ بہت ہی پریشان
رہنے لگی ہیں۔ اندر دہ گیاں اور اداسیاں ہر وقت چہرے سے جھانک رہی ہیں۔ آپ کو

خوش رہنا چاہیے! بہت ہی خوش؟

مگر خوشیاں تو جیسے اس سے ہمیشہ کیلے لڑکھ کئی تھیں بہیل کے تصور نے اس کی خوشیاں جیسے ہمیشہ کیلے لوٹ لی تھیں۔ جیسے وہ اب کبھی نہ مسکاسکے گی۔ کبھی اس کے گلستاں میں بہار نہ آئے گی۔ کبھی اس کی آرزوئیں خوشی کا پیغام نہ محسوس کر سکیں گی۔ کبھی اس کی تمناؤں کے پھول نہ کھل سکیں گے۔ اس پر مالیوسی اور قنولیت سی چھائی چلی جا رہی تھی۔

تصور بچی سے ہمیشہ ساتھ ساتھ رہنے کے عہد و پیمان کر کے چلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ بیار کے اوٹ بندہ باندھ کر چلا گیا تھا۔ اسے اپنی دھاکا لہقین دلا کر چلا گیا تھا۔ اور بچی اس کے دیسے ہوئے رنگین تصورات کے سہارے زندگی گزارتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے انگ انگ سے مستی اور مسرتوں کا اظہار ہوتا تھا۔ مگر جب اس کی نگاہ اپنی آپنی کی طرف جاتی تھی تو اس کے دل سے ہلکے سی اٹھتی تھی۔ اور مسرتیں اس کے چہرے سے مفقود سی ہو جاتی تھیں۔ اور وہ احساس ادا سی دکھائی دینے لگتی تھی۔ لیکن پھر تصور کا حسین خیال اسے مسکراتے پر مجبور کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشیوں کا حسین عکس ابھرتا تھا۔ پھیل جاتا تھا۔ وہ از خود رنگی کے عالم میں سب کچھ بھول بھال اور سب کام چھوڑ چھاڑ اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ اور اچھی کیس سے تصور کا نوٹوں کا کرپڑے چاہا نہ انداز میں اسے دیکھنے لگتی تھی۔ اور بڑی دیر تک بیٹھی اسے دیکھتی رہتی تھی۔

ارشاد احمد کل طور پر صحت باب ہو کر ننگ جا رہے تھے۔ ان کے تندرست ہونا جانے سے گھر کی تمام سونی موٹی مسرتیں بیدار ہو گئی تھیں۔ اور سکون کا بسیرا ہو گیا تھا۔ شبیلہ کے ادا سی چہرے کے علاوہ اس چھوٹے سے گھر میں اور کسی طرح کی پریشانی دکھائی نہ دیتی تھی۔ ڈاکٹر کابل چلا یا جا چکا تھا۔ بچی اب بھی کبھی کبھی ڈاکٹر کے بیوی بچوں سے ملنے کیلے مایا کرتی تھی۔ اور وہ اسے دیکھ کر باغ باغ ہو جایا کرتے تھے۔ بچے اسے اپنی باجی

جانتے تھے۔ اور اس سے بہت گھل مل گئے تھے۔ اس سے میٹھی میٹھی، نخی مٹی اور پیلاہی پاری باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ بھی انھیں بچوں کے سے انداز میں بنا کر خوب ہنسیا کرتی تھی۔ اور خود بھی قہقہہ لگا یا کرتی تھی۔ دوسرے قہقہے روزِ لقور کے خلوص بھرے خطوط آتے رہتے تھے۔ اور اسے بڑی محبت اور پیار سے جواب دیئے جلتے تھے۔ اور ارشادِ فامر ماسے خدا اپنے ہاتھ سے جواب لکھتے تھے۔ زندگی بڑے اچھے لمحات میں بسر ہو رہی تھی۔ ایک شام وہ چائے سے فارغ ہو کر اور ارشادِ فامر کی باتوں میں مصروف تھے، محض ارشادِ احمد کے کمرے میں جھی ہوئی تھی۔ بچی بڑے خوشگوار مود میں تھی مگر شبیلہ۔ کہہ چہرے پر حسبِ معمول اندر دگیاں منڈلا رہی تھیں بچی نے اس کے چہرے کو بخود دیکھا۔ اور اس کا خوشگوار تاثرات ظاہر کرنا بچہ چہرہ تادیک سا ہو گیا۔

آپنی حبیب سے آپ نے ملازمت ترک کی ہے ایک لمحہ بھی خوشی کا نہیں دیکھا۔ بچی نے منہ بغیر ارادی طور پر نکل گیا۔ شبیلہ زور سے چونکی۔ اس نے اپنے اندوہناک خیالوں سے نکل کر بچی کو پریشانی سے گھورا۔ بچی کو بھی اپنی بے خودی کا شدت سے احساس ہوا۔ اور اس کا چہرہ ندامت سے سرخ ہو گیا۔ وہ اتنی بے خود اور بے پردہ ہو گئی تھی کہ وہ راز اس کے منہ سے نکل گیا جسے چھپانے کا اس نے آپنی سے وعدہ کیا تھا۔ رالہ بیگم اور ارشاد احمد بچی کی بات کو سن کر اس طرح اچھلے تھے۔ جیسے کسی سانپ نے دُوس لیا ہو۔

ملازمت! — ارشاد احمد لولے کیسی ملازمت بچی! ان کا اچھہ گھیر ہو گیا! کیا تمہاری آپنی نے ملازمت کی تھی؟

بچی اپنے والد کے استفسار پر بہت ہی زیادہ گھبرائی۔ اور اس کا چہرہ لرد ہو گیا۔ جسم لرزنے لگا۔ اس کے منہ سے بات نہ نکل سکی۔ اور شبیلہ وہ تو کب کی نظریں جھپکا چکی تھی۔ اس کے ہونٹ کا تپ رہے تھے۔ اور چہرہ اندر وہ ہو گیا تھا۔ دل زور زور

سے دوسرے لڑکے کا تھا۔

میری بات کا جواب دے کر اچھی! — اعلیٰ نے تلخ لہجے میں بلی کو ڈانٹا۔
 بچہ اس ڈانٹ سے بڑھ کر کھل گیا اور اپنے والد کو سہمی سہمی نگاہوں سے دیکھا۔ مگر ارشد کا
 لئے اس نگاہوں کی بالکل پرواہ نہ کی۔ ادا ان کے چہرے پر جوش، اشتیاق غصہ اور جھجکا
 کے آثار پینا ہو گئے۔

جواب دے! — وہ کہے۔

وہ ارشد احمد کی گن سے تھر تھر کانپنے لگی اور سہمے سہمے سے انداز میں شبیلہ کی
 ملازمت کا قصہ بیان کر دیا۔ پھر کبھی کبھی سی نظروں سے شبیلہ کی طرف دیکھنے لگی۔ جو پریشان
 خاطر بیٹھی تھی۔

ہوں! — ارشد احمد کا چہرہ تلخیوں میں ڈوب گیا۔ اور ایک زہریلی
 مسکراہٹ، ہنٹوں کے گوشوں پر کانپنے لگی۔ ہم سے قدم قدم پر جھوٹ بولے گئے۔
 سہیلی کی پیاری کا بہانہ بنایا گیا۔ سہیلی سے قرض لینے کا جھوٹا قصہ بیان کیا گیا۔ آخر
 تہیں یہ ڈرامہ کھیلنے کی جس رات کیسے ہوئی۔ وہ علامت بھرے انداز میں غصے سے
 اُسے گھورنے لگے۔

راویہ بیگم ہراساں ہراساں سی شبیلہ کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ مگر شبیلہ غائب
 بیٹھی تھی۔

نافرمان لڑکی! — ان کا لہجہ تیکھا، طنزیہ اور تلخ تھا۔ میری باتیں

کا جواب بھی تمہارے پاس نہیں رہا:

یہ ایک اس لئے چہرہ اٹھا کر اپنے والد کی طرف دیکھا۔ اس کی پلکیں کانپیں۔
 ہونٹ لڑے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو سہی گرے۔
 آنسو بہا کر لیے بہت وقت پہنچا ہے۔ — اُن کے لہجے میں غصہ

اور جوش تھا۔ پہلے یہ بتاؤ تم نے میری مرضی کے خلاف قدم کیوں اٹھایا۔ ملازمت کیوں کی؟

شبیلہ کی آنکھوں سے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔ اس نے سیل انٹک بولنے کی بہت کوشش کی مگر رگ نہ سکا۔ وہ روئے چلی گئی۔ رابعہ عظیم اس کی اس حالت سے بے چین سی ہو گئیں۔ بگو وہ ارشاد احمد کے غیبتے چہرے کی طرف دیکھ کر خاموشی سے اپنی کرسی پر ہی دمکی بیٹھی رہیں۔ اور شبیلہ کو متاثری نظروں سے دیکھتی رہیں۔ شبیلہ کے روتے سے ان کا دلچسپ رنگ رہا تھا۔

ارشاد احمد نے گرج کر پھر استفسار کیا۔ آخر کار شبیلہ کے ہونٹ لرزے اور اس نے اپنی ملازمت کا روتے روتے تمام قصہ بیان کر دیا۔ لیکن اس نے وہ واقعات چھپائے جن سے سہیل اور راحیل کی محبت بھری تمناؤں کا اظہار ہوتا تھا۔ ملازمت چھوڑنے کا اس نے یہ جواز بتایا کہ اس کے محلے کی دو کر سچین لڑکیوں سے لڑائی ہو گئی تھی۔ اس لیے اس نے ملازمت چھوڑ دی۔ آہستہ آہستہ اس کے آنسو ختم گئے تھے۔ اور وہ اپنے دل کا غبار نکال چکی تھی۔ اپنی ملازمت کی کہانی بیان کر دینے سے جیسے اسے سکون کا۔ احساس ہو گیا تھا۔ جیسے اس کے سینے سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔

اس نے سب کے چہرے پر اپنی پُر سکون نظریں دوڑائیں۔ اور اس نظر کی مٹاپی کے ساتھ ہی۔ اس کے دل سے دہشت زدہ اور غمگین تاثرات مٹتے ہوئے گئے۔ ذہنی غلبہ سبھی کم ہو گیا تھا۔ اور دل میں ابھرنے والے ذہنی دوجوانی جذبات بھی سمٹ گئے۔ مٹ گئے۔ اب اسے کبھی طرح کا ڈر محسوس نہ ہو رہا تھا۔

”تمہیں معلوم نہ تھا ارشاد احمد تا سب سے بھرے لہجے میں بولے: میں لڑکیوں کی ملازمت کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔“

اس نے اپنی احساس نکالیں اٹھائیں۔ اور اپنے والد کو ایک نظر دیکھا۔ جن کے

چہرے سے تلاطم خیر مائعات مٹ چکے تھے۔ اور ان کی جگہ تاسف، افسردگی اور تذبذب جھانک رہا تھا۔ پھر اس نے اوپر سے نگاہیں ہٹالیں۔

”مجھ سے گھر کی بدعالی نہ دیکھی گئی اباجان! — اس کی آواز انتہائی ..
 غلیظ ہو گئی۔“ میں برداشت نہ کر سکی کہ آپ بیماری کی حالت میں پڑے ہوں۔
 آپ کا علاج بھی اچھی طرح نہ ہو سکے اور آپ کو کافی غذا بھی نہ مل سکے۔
 ”بیٹی! — ان کا چہرہ گہرے درمیں ڈوب گیا۔ مجھ سے پوچھ لو لیا۔

ہوتا —

”اگر پوچھتی! — وہ ذرا رک کر بولی۔“ تو آپ یقیناً انکار کر دیتے۔ اور
 آپ کے انکار سے گھر کی حالت مزید ابتر ہو جاتی۔ جسے سہنے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔
 میں نے آپ سے پوچھے بغیر ہی ملازمت کر لی۔ اس کے لیے میں سزاوار ہوں۔ مگر یہ جانا
 لیجیے! میرے پیش نظر نیک جذبات تھے۔ میں یہ نہ دیکھ سکی میرے پیارے اباجان
 مجبور و بے بس دکھائی دیں۔ مجھ سے فقیر ہو گئی ہے اور جو جی چاہے سزا دے لیجیے۔
 یہ کہہ کر وہ اداس اداس نظروں سے فرش کی طرف دیکھنے لگی۔ اور وہ جھکے جھکے چہروں
 کا گہری نظروں سے بخور جائزہ لینے لگے۔ پھر ان کے چہرے پر غم کے ساپے
 رہنے لگے۔

”تو ایسا نہیں کرتا چاہیے تھا! —“ وہ منہم لہجے میں بولے۔ ”میرے

دل کو سخت منہم پہنچا ہے۔“

”اباجان! آج کا زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ زندگی نئی راہیں تلاش
 کر رہی ہے۔ لوگ جدت پسند ہو گئے ہیں۔ اسے اپنے والد کی نرمی سے کافی حوصلہ
 مل گیا تھا۔ ان کے لہجے کے غیلے پن اور جوش نے مغربیہ میں بدل کر اسے گھٹار
 کی قوت بخش دی تھی۔ وہ بولے جا رہی تھی۔“ اگر میں نے اپنے حالات کو سنوارنے

جائیں گے۔ بہت چپچپے۔ اتلی چپچپے کہ آج کا انسان ہم سے تمام رشتے منقطع کر دے گا۔ اس ہلٹ کر حقارت سے دیکھے گا۔ اس کی نگاہوں میں ہم جیسے انسانوں کے لیے نفرت کے سوا کچھ نہ ہوگا؟
وہ خاموش ہو گئی۔

پھر بھی بیٹے! وہ آگے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ کہ راجہ بیگم نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

”اللہ! ——— وہ بیزاری سے بولیں: اب اس بحث کو چھوڑ بھی دیجئے۔ جو ہو گیا سو گیا۔ اب تو ہماری بیٹی کہیں نہیں جاتی ———“ دلیل محفل تھی۔ اس لیے وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ انہوں نے مزید کچھ کہا مناسب نہ سمجھا۔ مگر ان کے چہرے پر بدستور غم کے سالیے رکھ گئے تھے۔ انھیں اندر دہ دیکھ کر شبیلہ تڑپ گئی۔

”ابا جان! ——— اس کی آواز بھرا سی گئی: پھر بھی اگر میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔ تو مجھے معاف کر دیجیے۔“

انہوں نے نظریں اٹھا کر اسے پیار سے دیکھا۔ یکایک ان کے چہرے سے رخ و غم کی پرچھائیاں ناپی ہو گئیں۔ اور ان کی جگہ خوشی اور شادابی نے لے لی۔ اور ان کی آنکھوں میں مسکراہٹ کی چمک پیدا ہو گئی۔

”بیٹا! ——— معافی کیسی! ——— وہ خوش گوار لہجے میں بولے: جو ہو گیا اس پر خاک ڈالو اور خوش رہنے کی کوشش کرو۔ میں دیکھتا ہوں تم بہت ہی غموں میں رہنے لگی ہو۔“

ان کے خوشگوار لہجے سے حالات معمول پر آ گئے: مگر شبیلہ کی اندر دیاں کم نہ ہو سکیں۔ اُسے دیر انیاں گھرے رہیں۔ اس کے خیالوں سے سہیل کی خبر ہو

شبیہ نہ ٹکل سکی۔

فرم کی طرف سے اُسے چٹھی موصول ہوئی تھی۔ اس نے جواب میں اپنے
استغفار کا حالہ دیتے ہوئے لکھ دیا تھا۔ کہ اس سے آئندہ کسی قسم کی خط و کتابت
نہ کی جائے اس دن اس کے دل پر شدید عینیں لگی تھی۔ تنہائی میں بیٹھ کر اس
نے کتنی ہی دیر آنسو بہائے تھے سہیل کی خوشیوں اور شرمیلوں کو یاد کیا تھا۔ اس
کی قربت کے دل نواز لہجوں نے اُسے بے قرار کر دیا تھا۔ اس کی باتوں نے اُسے
تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

جائے سہیل کہاں ہے؟

جائے اس کا حال کیا ہے۔ جائے اس کے شب و روز کیسے کیسے جان لیا
لحمت میں گزر رہے ہوں گے۔ شبیلہ کا دل کہتا تھا۔ کہ وہ اُسے بھول تو نہیں سکتا۔
وہ یہ جانتی تھی کہ وہ اس کے ذہن پر اچھی طرح چھا گئی ہے جس طرح سہیل اس کے
خیالوں میں بس گیا ہے۔ دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی۔ اگر شعلے نہ بھڑک
سکتے تھے تو محض اس کی وجہ سے اگر وہ ذرا بھی ہوا دیتی تو شعلے بھی کے بھر مل گئے
ہوتے۔ مگر وہ ہوا دینے کی جماعت نہ کر سکی تھی۔ اور نہ وہ ایسی جہادت کرنا چاہتی
تھی!

جس اور تپش کے دن گزر گئے تھے۔

سردی آگئی تھی۔ دن مختصر ہو گئے تھے۔ اس نے گھر سے باہر نکلنا بالکل
حجمہ ڈ دیا تھا۔ وہ کسی ضروری کام سے بھی باہر نہ جاتی تھی۔ کوئی نہ کوئی کتاب
لیے بیٹھ رہتی یا وقت گزاری کے لیے ٹکیوں کے غلات کاٹھنے لگتی۔ میز پریش
اور کش بنانے لگتی۔ اس مصروفیت میں بھی وہ سہیل کے تصور سے چھٹکارا حاصل
نہ کر سکی تھی۔

ایک روز تصور کا ٹیلگرام موصول ہوا۔ اس کی امی ٹیکیلہ بیگم سخت بیمار ہیں ان کی تیمارداری کے لیے شبیلہ کو بہن کو بلایا تھا۔ وہ رات کے کھانے کے بعد ارشاد شاہ احمد کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اُسے ارشاد احمد نے روک لیا تھا۔ بجی پڑھنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ سمجھو ڈی خاموشی کے بعد وہ شبیلہ کی طرف دیکھنے لگی۔

”شبیلہ بیٹی! — انہوں نے اُسے پیار سے پکارا۔
وہ خیالوں سے چونکی۔

”جی ابا جان! اس نے محبت سے کہا۔
”صبح راول پنڈی چلی جانا! — ان کے بچے میں رازدارانہ اجنبی سرگوشی تھی اور گہری نظروں سے دیکھنا کہ ٹیکیلہ بیگم کے گھرنے کا ماحول نجی کے لیے سازگار رہے گا یا نہیں۔“ پھر وہ اپنا مطلب واضح کرتے ہوئے بولے۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ نجی اور تصور کا رشتہ طے کر دیا جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں! —“

”بہت مناسب تجویز ہے ابا جان! — وہ ہلکی سی مسرت کے ساتھ بولی۔“ میرا خیال ہے کہ دونوں اس رشتہ کو پسند بھی کریں گے۔ نجی اور تصور کو کوئی اعتراض بھی نہ ہوگا۔“ نجی کسی کام سے کمرے میں آنا چاہتی تھی کہ اس نے اپنی اچھے کی بات سُن لی۔ اور وہ تیز تیز دھڑکنوں کے ساتھ دروازے پر ہی سے واپس پلٹ گئی۔ اور اپنے کمرے میں جا کر اپنی تیز تیز سانپوں کو سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر درست کرنے لگی۔ اور آئینے میں اپنی شرمیلی قمریلی شبیہ کو دیکھ کر کچھ شرمائی گئی۔

دل کی دھڑکنوں سے آواز اٹھ رہی تھی، تصور — تصور —
جیسے اس کی روح بھی رازدارانہ کمرے میں محسوس کر رہی تھی —

دوسرے کمرے میں رالبدہ تعلیم کہہ رہی تھیں۔
 بڑی بیٹی کا بھی تو خیال کیجیے وہ مسکرائیں : پہلے تو شبیدہ کی بات اُسے لگی۔
 ”ایسا ہی ہو گا اب۔“ وہ کہنے لگی۔ ”خدا یہ مسئلہ بھی حل کر دے

نہا۔“
 اس گفتگو سے شبیدہ کے چہرے پر گہری شرم و حیا مسکرا ہو گئی تھی۔ اس کی نظریں
 جھکی جا رہی تھیں اور جسم سمٹ رہا تھا۔ اس سے ابا دباں بیٹھا مشکل ہو گیا تھا۔ اور
 وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

تنہائی میں اس نے غور کیا۔
 نجی اور نقور۔۔۔ کتنی اچھی جڑی ہے۔ خدا اسے سلامت رکھے جیسے اسی
 کے دل سے آواز اٹھی اور پھر وقتاً نہ جانے کیوں، نہ جانے کیسے اس کے خیالات
 کا رخ ایک دم سہیل کی طرف پلٹ گیا۔

کئی دن بعد اس یاد نے اُسے بے قرار کیا تھا۔ ایک بوک سی اس کے دل
 سے اٹھی۔ اس نے کوشش کی کہ وہ اس آواز اس جذبہ کو دبا دے۔ لیکن اس لمحہ وہ
 اس سعی میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک درد تھا جس نے اسے لیٹ میں لے لیا تھا۔
 نڈھال سی بوک اس نے تکیہ پر سر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

نہا آنکھیں بھی اسے سہیل کی ابھرتی مٹی تصویروں سے نجات نہ دلا سکیں۔
 اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات ذہن کی سطح پر اُجاگر ہوتے رہے اور وہ اُن میں
 کھوتی چلی گئی۔

ایک آہ اس کے دل سے اٹھی۔
 آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

سہیل! — " راحیل اسی کے کمرے میں داخل ہو کر بولا۔
 "جی بھائی جان! —" وہ سیلنگ سوٹ پہنے اپنے بیڈ پر گھنٹوں تک
 پیش کا لحاف لیے میٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ آواز پر کتاب سے نگاہیں اُچٹا کر
 اپنی طرف آنے والے راحیل کا جائزہ لینے لگی تھیں۔ راحیل اس کے بیڈ کے قریب
 آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"تم کل راولپنڈی چلے جانا —"
 وہاں کیا کام ہے بھائی جان! — " اس نے کچھ بچھے سے متین
 لہجے میں کہا —
 "تمہیں اکرام صاحب سے ملاقات کرنی ہے۔" راحیل تھوڑا سا آگے
 جھک کر بولا۔

"پارٹنرشپ کے سلسلے میں؟ —"
 "بالکل —" وہ کہنے لگا۔ "ابن کا آج خط موصول ہوا ہے۔ وہ اس بات

پر رخصتا مندرجہ گئے ہیں۔ کہ راولپنڈی کی ایک شاخ کھول دی جائے اور وہاں کا نظم و نسق خود سنبھال لیں۔ انہوں نے جگہ کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔ صرت راولپنڈی کی شاخ میں ہماری ان کی پارٹنرشپ ہوگی۔ تم راولپنڈی میں جا کر ایک ہفتہ قیام کرو اور وہاں کے حالات کا جائزہ لو۔ اگر ماحول کاروباری لحاظ سے اچھا ہو تو پارٹنرشپ کر کے کاغذات مکمل کر لیں گے۔ پھر وہ مسکرایا اور پیار سے اپنے بھائی کو دیکھا۔ تمہیں صبح جانے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔

”بالکل نہیں بھائی جان!۔۔۔ اس کے افسردہ اور سنجیدہ لہجے میں فرمانبردار کا کائنات تھا۔“ آپ کے حکم کی تعمیل میرا فرض ہے۔“

”ادہ! یہ بات ہے۔۔۔ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔“ حکم نہیں بھئی

ارشاد ہے۔۔۔

اپنے بھائی کے اس خلوص سے اس کے ہونٹوں پر ایک پھکی سی مسکراہٹ اُجاگر ہوئی۔

”بھائی جان!۔۔۔ وہ نرمی سے بولا۔“ آپ کے سینے میں خلوص سے سہرا۔“

ہوادل ہے۔“

”اچھا! راجہ بناؤ نہیں۔۔۔ راجہ نے ہنس کر کہا۔ پھر وہ ایک دم غیبہ

ہو گیا۔“ ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔ تم کا غم نے مجھے سمجھنے سے روک دیا۔ کیا بات ہے آخر؟“

”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بھائی جان!۔۔۔ وہ بولا۔“ مجھ سے آپ کو کوئی

شکایت ہے۔۔۔ یا دفتر کی ڈیوٹی میں کوئی کمی ہوئی ہے۔۔۔

”ادہ نہیں!۔۔۔ وہ جذبہ بکر بولا۔“ نہ کوئی شکایت ہے نہ تم نے دفتر میں ڈیوٹی میں کمی کی ہے تم کھوٹے کھوٹے سے رہتے ہو۔ میں نے اس لئے پوچھا تھا۔“

”ہوں! ——— اس نے نظریں جھکا کر کہا۔
 ”بس تم خوش رہا کرو! ———“ وہ مسکرا کر بولا۔ زندگی نام ہی خوشی کا

—————
 ”مگر یوں لگتا ہے بھائی جان“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”جیسے آپ بھی
 اس نام سے شکستہ ہیں۔“

”مطلب! راحیل نے اسے متحرقانہ دیکھ کر پوچھا۔
 ”میں دیکھتا ہوں ——— آپ بھی تو غمگین غمگین سے رہتے ہیں ———
 وہ راحیل کو گہری نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ”جیسے کوئی غم سینے میں ہر وقت کسک پیدا
 کرتا رہتا ہو۔“

دلوں کی نظریں چند لمحوں کے لیے ملیں۔ انہ وہ افسردہ سی مسکراہٹ
 کا تبادلہ ہوا۔ ”بھہ چہرہ پر وقتا بہت بھیل گئی۔ بخٹوری در کی خاموشی کے بعد سہیل
 نے راحیل کی طرف دیکھا۔

”بھائی جان! ———“

”ہوں! ———“
 ”ناؤ لینڈی میں جا کر کس ہوٹل میں قیام کروں! ———“
 ”کسی میں بھی کر لینا! ———“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”یہ تمہاری مرضی“

پرنصر ہے ———

وہ باہر آگیا ادا خانے کمرے کی طرف چلا گیا۔
 جب سے شبیلہ ان کی فرم چھوڑ کر گئی تھی اس وقت سے دلوں بھائی اداں
 ادا پریشان رہنے لگے تھے۔ انہیں اس کے جانے کا بڑا قلق تھا۔ چند دن راحیل
 تو بہت ہی مغموم رہا۔ مگر جلد ہی اس نے اپنے منصب کو پہچان لیا۔ اور دلی پر

صبر کی سہل رکھ کر کاروباری مصروفیت میں گم ہو گیا۔ اس کی توجہ نہ دینے سے لاچار
 بگڑنے لگا تھا اس نے بگڑتے کاروبار کو ہر نہ بگڑنے دیا تھا اور اسے سنبھالنے
 کی کوشش میں پوری طرح مصروف ہو گیا تھا۔ بنگاس کی پوری توجہ کے بعد بھی کاروبار
 اصل حالت پر نہ آیا تھا جب سے اس کے والد نے فرم کاروبار اور حساب کتاب
 اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ وہ زیادہ سال امپورٹ نہ کر سکا تھا۔ روپے کی قلت ہونے
 لگی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا تھا۔ اس نے اس بارے میں اپنے
 والد سے استفسار کیا تھا۔ انہوں نے دوسرے ہی موضوع چھیڑ دیئے تھے۔ اور اُسے
 کاروبار کی بد حالی سے متعلق گفتگو کی طرف آنے ہی نہ دیا تھا۔ پہلے تو وہ شبیلہ کی
 وجہ سے بے چین رہا کرتا تھا۔ اب کاروباری اکھنوں کی وجہ سے مضطرب رہنے لگا
 تھا۔ اسی لیے اس نے راولپنڈی میں موثر ٹریڈرز کی شناخٹ کھولنے کے لیے اکرام
 سے حامی بھر لی تھی۔

اور سہیل — اپنے بھائی کی فطرت کے برعکس کبھی کاروباری اکھنوں میں
 پڑنے یا ان کے بارے میں سوچنے کے لیے وقت نہ نکال سکا تھا۔ وہ آزاد اندیش
 کاروباری ذہن کا مالک تھا۔ اسے روپیہ سے کوئی رغبت نہ تھی۔ ذرم سے اس
 کا تعلق بس اتنا تھا کہ وہ دن کے چند گھنٹے وہاں گزارتا، اپنے کمرے میں —
 جا کر خاموشی سے بیٹھا اور لیا اوقات شبیلہ سے وابستہ یادوں کو تازہ کر کے واپس
 چلا آتا۔ اس کی ذات اور دلچسپی کا محض صرف شبیلہ کی ذات تھی۔

اسے سوائے شبیلہ کے بے رخی اور بے اعتنائی کے اور کوئی غم نہیں تھا۔ ہر جہت
 شبیلہ کی پرچھائیاں اس کے ذہن میں منکس ہوتی رہتی تھیں۔ وہ سوچوں میں ڈوب
 کر شبیلہ کی یاد سے پیدا ہونے والا غمگین سامر در حال کرتا رہتا۔ اور اپنے خون کو چلاتا
 رہتا تھا۔ جب اسے شبیلہ کا تصور بہت زیادہ بے چین کرتا تو وہ کوئی کتاب لے کر

بیٹھ جاتا۔ مگر کتاب کے صفحات بھی اسے شبیلہ کا حسین پیکر دکھانے پر مغمم ہوئے۔ اسے خود غم کی تصویر بنی نظر آتی ایک اندر وہ آہ اس کے لبوں سے نکلتی اور ادائیت ہانک تا ثنات اس کے ہرے پر منڈلانے لگتے۔ شبیلہ کو بھلانا اس کے سین کی بات نہ تھی۔ وہ اسے زندگی کے کسی موڑ پر بھولنے کی خود میں سکت نہ پاتا تھا۔ اس نے اسے ایسے غم عطا کر دیے تھے جو روح کے جسم سے جدا ہونے کے بعد ہی مٹ سکتے تھے۔ اور ابھی روح جسم سے جدا نہ ہوئی تھی۔

سہیل نے صبح ناشتہ کے بعد اپنے بھائی سے اجازت لی اور اپنی کار میں بیٹھ کر سڑک لپیٹ دی آگیا۔

وہ راد لپیٹ دی اگر ایک شاندار ہوٹل میں ٹھہرا۔ اس نے میرے سے اپنا ٹیجی کیس کرے میں رکھوا کر تھوڑے دھوپا۔ اور بہترین سوٹ پہن کر نیچے آگیا اس کی گاڑی ہوٹل کے کپازنڈ میں کھڑی تھی۔ وہ اکرام صاحب سے ملنے کی غرض سے نیچے اتار تھا۔ اس نے گاڑی کی طرف دیکھا تھا۔ پھر گاڑی میں بیٹھ کر چالے گا ارادہ ملو سی کر دیا کیونکہ اکرام صاحب وہاں سے حقوٹے فاصلے پر ہی رہتے تھے۔ صدر میں ان کی شاندار کھٹی تھی۔ اور جس ہوٹل میں اس نے رہائش اختیار کی تھی۔ وہ بھی صدر میں ہی تھا۔ ہوٹل کے چھوٹے سے لان سے گزرتے ہوئے آگیا۔ اور اہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اکرام صاحب کی کھٹی کی طرف چلنے لگا۔

چند منٹوں میں ہی وہ ان کی کونسل پہنچ گیا۔ وہ اپنے گھر پر ہی مل گئے تھے۔ انہوں نے بڑے تپاک سے اس کا غیر مقدم کیا تھا۔ اور وہ ان سے ایک گھنٹہ کا ردوباری اور بڑے متعلقہ بات چیت اس کے کل دو بارہ ملنے کا وعدہ کرنے کے بعد کونسل سے باہر نکلا۔ اور واپس ہوٹل چلے لگا۔ ابھی اس نے حقوٹا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ سڑک پر ٹنڈی اچانک اس کی نگاہ سامنے سے آتی ہوئی شبیلہ پر پڑی۔ اس نے بھیٹے

گہری نظروں سے دیکھا چلے اس کے چہرے پر حیرت اور ہر ایک دم مست کی طرح
 دوڑ گئیں مگر سہیل نے کسی طرح کی گرجو ششی کا اظہار نہ کیا۔ بلکہ وہ تو اس اچانک طلاق سے
 پر گہرا سا گھبراہٹ لپک کر اس کے قریب آئی۔

”ارے! — آپ! —“ وہ دلفریب انداز میں مسکرائی۔ ”اس علاقے
 میں —“

”کیا میں اس علاقے میں نہیں آسکتا —“ وہ سنجیدگی سے بولا۔
 ”آئیوں نہیں سکتے“ وہ مسترت سے سنہں کر بولی۔ ”مجھے آپ کو یہاں دیکھ
 کہ تنی خوشی ہوئی، کریاں نہیں کر سکتی۔ اگر سچ پوچھو تو اس خوشی سے آج میں مری
 جاؤں تو ایسی موت بہترین موت ہوگی۔“

”مرنے کی باتیں نہ کیجیے مس فقیر! —“ وہ گہری آواز میں بولا۔ ”موت کا
 وقت تو مبینہ ہے وہ تو آکر ہی رہے گی۔“ وہ خاموش خاموش نظروں سے دیکھنے لگا۔
 اور پھر کوئی بوجھ نہیں مارتا ہے! —“ اس نے پھر ہلکا سا طنز کیا۔ ”سب کہنے کی۔“
 باتیں ہیں —

”اچھا یہ بتائیے آپ کہاں سے آ رہے ہیں —“ اس نے بحث میں نہ
 پڑنے کی غرض سے کہا۔

”یہاں سے کھوڑے فاصلے پر اکلام صاحب رہتے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”ان سے۔“
 کاروباری سلسلے میں ملنے گیا تھا۔“

”آئیے! پھر میرے ساتھ! —“ وہ عشوہ طراز انداز میں آنکھیں مٹکا
 کر بولی۔

”کہاں! اس نے آہستہ سے کہا۔

”گھر! —“ وہ مسکرائی۔ ”وہ سٹے میری کوٹھی ہے۔“ میں ایک سہیلی سے

لے گئی تھی۔ وہ تو نہ ملی اور دالہی میں آپ مل گئے۔ اور میں اپنی اس خوش نصیبی پر جتنا
ناز کروں کم ہے :

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ کھڑا رہا۔
”کیا سوچ رہے ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ناز داسے بل کھا کر بولی : ”چلیے۔
”جی ہاں۔“ مجھے آپ کا وہ وعدہ ابھی تک یاد ہے کہ آئندہ اگر کبھی ملاقات ہوئی تو آپ
کے پاس ٹھہروں گا :

سہیل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اندر وہ چہرے پر یکایک سرخی بڑی دلکش دکھائی
دی۔ اور وہ تو اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر جیسے مٹا ہی گئی۔ اس کی آنکھوں میں
جیسے خسار سا جھلکنے لگا۔

”مگر میں تو بوٹل میں قیام کر چکا ہوں۔“ وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔
”ہوں تمہیں نے سہیل نے کسے انداز میں سہیل کی طرف دیکھا۔“ آپ نے
بوٹل میں قیام کیوں کیا ؟

”ابھی سہیل کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ تمہیں کو جیسے کوئی بھولی بات یاد
آگئی مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے استفہامیہ انداز میں بولی۔

”اس بار بھی کوئی ہمسفر آپ کے ساتھ ہے ؟“
”ابھی سہیل اسے جیسے کسی نے آگ میں کھینچ لیا ہو۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس
لمحے شبید بے طرح یاد آگئی۔ وہ اندر وہ لہجے میں یو لہا۔

”ایسی قسمت کہاں ؟“
”ہوں ! — بڑی چوٹ کھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں آپ۔“ تمثیلہ نے
طنز ملا ایک اور وار کیا۔

”چہنما — نہیں ایسی کوئی بات نہیں —“ اس کی اندر وہ

”تاکم رچی ساچھا۔ اب چلوں گا۔ کل پھر کسی وقت ملاقات ہوگی۔“
 سہیل صاحبانہ سخت اپنائیت سمجھنے لہجے میں بولی۔
 ”یہ نہیں ہو سکتا، بالکل نہیں ہو سکتا، آپ یہاں آئیں اور ہوٹل میں قیام کریں؟“
 آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔ یعنی میرے ہاں قیام۔

”میرے پاس آپ کا ایڈریس نہیں تھا۔ ورنہ مزور ہی آپ کے پاس ٹھہرتا۔
 اتنے عرصے کی بات ہے۔“ ایک افسردہ مسکراہٹ سہیل کے ہونٹوں پر کھینچنے لگی۔
 ”کہیں گم ہو گیا؟“

تمثیلہ نے فکوکھ انگیز پیکار سمجری نظروں سے اُسے دیکھا۔ ”چلو ایڈریس گم ہو گیا
 مگر آپ تو مجھے مل گئے۔ اب ہوٹل میں ٹھہرنے کی ٹمگ نہ چلے گی۔ آپ کو میرے پاس
 ہی ٹھہرنا ہوگا۔“

”بھئی!۔۔۔۔۔“ وہ بولا۔ ”ایک ہفتہ مجھے یہاں رہنا ہے۔ ہوٹل میں
 رہائش ٹھیک رہے گی۔“

”ہوٹل۔۔۔۔۔“ بولیں۔ ”وہ پیار سمجھنے انداز میں لہجہ کو سخت بنا کر بولی۔
 ”بس ہوٹل میں نہیں ٹھہریں گے آپ! اب چلیے۔ زیادہ باتیں نہ بنائیے۔“
 تمثیلہ نے کٹھنی سے کھینچتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ خوب صورت کوٹھنوں کا سلسلہ
 دور تک سچایا ہوا تھا۔ سرمایہ دار طبقہ ہی زیادہ تر اس علاقے میں رہائش پذیر تھا۔
 اور قریب قریب سب ہی آزاد خیال لوگ تھے۔ نزدیک سے گزرتے والوں میں سے
 کسی نے بھی تمثیلہ کو سہیل کا بازو پکڑ کر چلتے ہوئے حیرت سے نہ دیکھا۔ کسی نے قریب
 کا اظہار نہ کیا۔ اور وہ اس کے ساتھ ساتھ تھوڑی دور چلی پھر اپنی شاندار کوٹھنی کے
 گیٹ میں داخل ہو گئی جن سے گزرتے ہوئے عمارت میں داخل ہوئے اور ایک گلیہری سے
 گزرتے ہوئے اُسے اور لاؤنچ کے کچے ڈرائیونگ روم میں آ گئے۔

میں آگئے۔

”چلیے ممتی سے ملاؤں ٹپ کو! وہ ڈرائیگ روم میں رک کر بولی۔
”بیاری پڑی ہیں؟“

”او ہوا! وہ چونکا اور جھردانہ لہجے میں بولا۔ ”کیا بیاری ہے؟“
”نونیہ ہو گیا تھا۔ اس کا لہجہ ایک ٹگن ہو گیا تھا۔ بخارا بھی ٹک نہیں اُٹھا،
نقابت بھی تھوڑے روز برہمتی چلی جا رہی ہے۔“

”بہت انوس ہوا۔ ان کی بیاری کا سن کر، ”وہ تاسف سے بولا۔
”چلیے، میں اُن سے ضرور ملوں گا۔“

”چلیے! — وہ قدم سٹمٹے کے دروازے کی طرف بڑھا کر بولی وہ
دیسے دیرین جدید طرز پر آراستہ ڈرائیگ روم کے سامنے والے دروازے کی طرف
بڑھنے لگے۔ بہترین قالین پر ان کے چلنے سے قدموں کی ڈرامی آواز پیدا نہ ہوتی تھی
تمثیل بہن! — ایک محبت بھری آواز نے تمثیل اور سہیل کو پلٹ کر
دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

”دیکھو کون آیا ہے —“ وہی آواز دوبارہ گونجی اور انہوں نے پلٹ
کر دیکھا۔ گہرا تعجب اور پریشانی اُن کے چہروں پر پھیل گئی۔
تھوڑے قریب، شبیلہ کھڑی تھی۔

تھوڑے مسکرا رہا تھا۔ اور شبیلہ کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی۔
سہیل کو تمثیل کے ساتھ دیکھ کر اس کا رنگ فنی ہو گیا تھا۔ اور جسم لڑنے لگا تھا
وقت نے ایک اور انگرٹالی تھی۔

ایک اور انقلاب اس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

اس بات نے تو اسے اور بھی پریشان اور خراب کر دیا تھا۔ کہ تصور تفتیلہ کا
 بھائی ہے۔ دونوں طرف تلخی، پریشانی اور حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ نزدیک ہی نوکر
 شبیلہ کا اچھی کیسی سنبھالے کھڑا تھا۔ اور تصور دونوں کو متحیرانہ پریشانی سے دیکھ رہا تھا۔
 ”آپ کو ایسے دیکھ رہی ہیں۔۔۔۔۔“ وہ تندیبا بھری مسکراہٹ سے
 بولا۔ ”جیسے ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہوں۔“ تصور تفتیلہ کے ساتھ سہیل کو دیکھ
 کر خود بھی حیران ہو گیا تھا۔

آخر کار وہ سنبھلے اور حیرت، رنجیدہ تاثرات میں ڈھل گئی۔
 ”سجائی جان۔۔۔“ تفتیلہ اپنے سجائی کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”جب میں مٹی
 بیٹ کے لیے گئی تھی تب اس سہیل میرے اچھے دوست بن گئے تھے۔ اور شبیلہ ان
 کے ساتھ ہی مجھے کہہ مری میں ملی تھی۔“

”میں انہیں جانتا ہوں۔۔۔“ تصور اخلاق آمیز لہجے میں بولا۔ ”لاہور میں ملاقات
 ہو چکی ہے ان سے؛ پھر وہ شبیلہ کی طرف دیکھ کر بولا۔“ شبیلہ بہن کی دیر سے ان کے

ساتھ نکارت ہوا تھا۔

وہ باتیں کر رہا تھا اور شبیلہ سخت ذہنی الجھن و غلط فہمیاں میں مبتلا تھی۔ اس کے دل میں طوفان خیر جذبات پھل پکڑا کر رہے تھے۔ سالنوں کی ناہمواری سے وہ جرسی تو سہیل نے اسے کمرے میں لے کر دی تھی۔ اُبھر اوردی رہی تھی۔ سہیل نے اس کے گداز جسم پر اس جرسی کو دیکھ لیا تھا۔ اسے اس بے تسکین سی ملی تھی۔ اور اس نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔ شبیلہ سوچ رہی تھی جانے کب سے سہیل یہاں ہے جلنے مثیلہ اور وہ کتنے دن سے یکجا ہیں۔ اس خیال سے اس کے دل پر ایک گہری چوٹ پڑی تھی۔ اور وہ سسما کر رہ گئی تھی۔

حالات کے اس رخ نے اسے حیران کر دیا تھا۔

تمثیلہ! — تصور کی پہن ہے۔ اس کے خواب میں بھی کبھی یہ خیال نہ آسکتا تھا۔

سہیل، شاید اسی عرصہ میں تمثیلہ سے قریب آچکا ہے۔ کیا وہ اس سے کوئی ذہنی انتقام لے رہے ہیں؟ کیا وہ اسے معمول چکا ہے؟

لیکن! — لیکن — اس نے سوچا، جب وہ خود ہی سہیل کے راسے سے ہٹ گئی ہے۔ جب اس نے خود ہی اس کی محبت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ تو اب اسے سہیل اور تمثیلہ کی یکجائی کیوں کھٹک رہی ہے۔ اسے کیا پریشانی ہے۔ اب کوئی ناخوشی اسے متاثر کر رہا ہے — اضطراب کی ایک لہر اسے ہبا کر دوڑے گئی اور وہ اپنی ہی سوچ میں گم سم تھی۔

”سہیل صاحب! تصور سکھا کر لولا۔“ آپ ابھی تشریف لائے ہیں کیا؟ ”کیونکہ جب آدھا گھنٹہ پیشتر میں شبیلہ پہن کو اسٹیشن لینے گیا تھا تو تمثیلہ بھی یہاں نہیں تھی۔“
”یہ اپنی سہیلی سے ملنے گئی تھی۔“ تمثیلہ سہیل کے جواب دینے سے پہلے ہی بول

بول پڑی۔

”آپ کا خیال درست ہے۔“ سہیل تمثیلہ کی بات ختم ہوتے ہی بولا۔
 ”میں ابھی ابھی آیا ہوں، اس علاقے میں ایک دوست سے ملنے آیا تھا، کہ تمہیلہ
 سے ملاقات ہو گئی۔ یہ مجھے یہاں کھینچ لائیں۔ دلچسپ میں لاہور سے بھی راولپنڈی آج
 ہی آیا ہوں۔“ آخری جملہ اس نے تمثیلہ کو بغور دیکھ کر کہا۔ اس سے تمثیلہ نے مطمئن
 طریقہ پر آہ بھری تھی۔ جلد ہی اس کے خیال کی تردید ہو گئی تھی کہ وہ تمثیلہ سے جانے
 کب سے مل رہے ہیں۔

تمثیلہ کے چہرے پر اطمینان جھلک نکلا۔

تمثیلہ کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر سہیل کو یوں لگا جیسے اس کے سینے سے
 کوئی بہت بڑا بار اتر گیا ہو۔ اور اسے سکون کا احساس ہوا۔ مگر وہ تمثیلہ کو اچانک
 دیکھ کر دل میں ابھرنے والی پرانی یادوں کو کسی طرح نہ مٹا سکا تھا۔ گو چہرے کو اس نے
 مطمئن بنانے کی کوشش کی تھی۔ تاہم دل میں تلاطم پیا تھا۔ جذبات کا طوفان اٹھ
 رہا تھا۔ تمثیلہ کا فی عرصہ غائب رہنے کے بعد پھر اس کی راتوں میں آگئی تھی۔ تقدیر
 بار بار اسے تمثیلہ کے سامنے کیوں لا رہی تھی۔ آخر تغایر کیا چاہتی تھی، وقت بار بار
 ان کا امتحان کیوں لے رہا تھا؟

”آپ تو خیالوں میں کھو گئے، تخیلہ طنزیہ انداز میں مسکرا کر بولی، اپنی عزیزہ کو
 کہ کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا آپ نے؟“
 وہ بوکھلا سا گیا۔

ابھیر تمثیلہ کو حقیقت پر دیکھا۔ پھر اس نے تمثیلہ پر نگاہیں جما کر ایک لمبا
 سانس لیا۔

”مجھے ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ وہ خوشی کا اظہار کر رہا تھا مگر

لہو سفید تھا۔

”لہو متین ہے۔ وہ چوٹ کرتے ہوئے لونی۔ کیا یہی انداز ہوتے ہیں خوشی کے؟“

اس کے طنزیہ جلوں سے شبیلہ کے چہرے نے کئی رنگ بدلے تھے۔ کئی بار اس نے کچکی محسوس کی تھی۔ کئی بار اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ کئی بار اس کے دل پر ٹھیس لگی تھی۔ درد ابھرا تھا۔ اور وہ بری طرح تڑپا تھی اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی مرضی سے منہ موڑا تھا۔ اس نے خود ہی اس سے ملنا ترک کیا تھا۔ غم کی لڑکری چھوٹنے کا مقصد یہاں ہی تھا۔ کہ اس سے ہمیشہ کے لیے علیحدگی ہو جائے۔ مگر نصیب نے پھر اسے سہیل کے راستوں پر لاکھڑا کیا تھا۔ اس اچانک ملاقات نے اسے اور زیادہ رنج دے دیئے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ سہیل سے ملاقات بھی رنج کا باعث بنتا ہے اور جہاں بھی غموں کے سوا کچھ نہیں دیتا۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کیوں بار بار سہیل کے راستوں میں آتی ہے بغیر متوقع طور پر اسے سہیل کی راہوں میں آنا ہی پڑتا ہے۔ کیا یہ روح کا بندھن ہے۔ کیا روحیں ایک دوسرے کو چارقی ہیں۔ بھاتی ہیں۔ ایک دل کی آواز دوسرے دل کی آواز محسوس کرتی ہے اور دونوں آواز میں مل کر محبت کا گیت بن جاتی ہیں جس کا طبعاً سرو اور شیریں بازو گشت دل کے ایوانوں میں گونجتی ہیں۔ ہنست اور سرد غنٹی۔ چلی جاتی ہیں۔

سہیل خاموش کھڑا تھا۔
شبیلہ بھی چپ چاپ تھی۔

اور

تمثیل انھیں غور سے دیکھتی ہوئی۔ معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔
”بھئی! — وہ نمٹے بار آواز میں لونی۔ قرابت داری کا مجید تو کھل گیا“

اب کچھ بول بھی کیا کوئی بات ہی نہیں رہ گئی؟

’باتوں کے لیے بہت وقت پڑا ہے‘ تصور میرا سی سے بولا۔ پہلے انہیں
مٹی سے ملنا چاہیے: اس نے تشیلہ کی طرف اشارہ کیا۔

”مزور — مزور — تم قیلہ منہی۔ اور سہیل اور تشیلہ کے چہرے پر
خفت کا رنگ بکھر گیا۔

’آئیے تشیلہ بہن! —‘ تصور آگے قدم بڑھا کر بولا: ’مٹی کے کمرے
میں چلیں‘

وہ بڑے معمول انداز میں قدم اٹھاتی ہوئی تصور کتے سمجھ بچھ چلنے لگی۔ دروازے
پر پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا سہیل بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لگاؤں کا یہ ٹکڑا
بڑا سنسنی خیز تھا۔ دونوں کے جسم برقی رومے مرتقش ہو گئے مگر دوسرے لمحے یہ رومہ
توڑ چکی تھی۔ اس کا سلسلہ لوٹ گیا تھا۔ وہ باہر چلی گئی تھی۔ اور ڈرائیگ روم میں تشیلہ
اور سہیل اکیلے رہ گئے تھے۔

تصور اور تشیلہ آہستہ آہستہ چلے، لوئے خشکید بیگم کے کمرے میں داخل ہوئے وہ تیکے
سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھی تھیں۔ ڈاکٹر نظروڑی دیہ پہلے ہی انہیں انگشت دکھا کر گیا تھا پہلے
کی نسبت اب ان کی حالت قدرے بہتر تھی۔ قدموں کی آہٹ پر انہوں نے بھیجی بھیجی
سی لگا بیٹھا کر دیکھا اور تشیلہ کو دیکھ کر جو بچی رہ گئیں۔ ان کے سیاہ چہرے پر حیرت
کی لکیریں بکھر گئیں تھیں۔

’تشیلہ! وہ بے ساختہ بولیں۔

’جی!‘ تشیلہ ان کے قریب آکر اپنا بیت سے بولیں بیاری آنٹی جان کیسی طبیعت
ہے اب آپ کی؟ —

’مٹی! —‘ تصور بھی قریب آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ’یہ نجی کی بڑی بہن ہیں۔‘

حیرت کی جگہ شفقت نے لے لی۔ جس میں ہلکی سی شرمندگی کا بھی عکس تھا۔

”شبیلہ! — وہ شفقتانہ انداز میں بولی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اپنی ہی بیٹی ہو۔ جیسی راجہ بیگم دہلی میں راجہ بیگم میری عزیز ترین سہیلی ہیں۔ پھر ان کا لہجہ غمگین ہو گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ معاف کر دینا بیٹی۔ کوہ مری میں مراد وہ تمہارے ساتھ رہی سارا رہا تھا۔ دراصل مجھ پر نہ تھا اور نہ تم لے ہی تدارک کرایا تھا۔“

”آپ تو بڑی محبت سے پیش آتی تھیں۔“ وہ انکساری سے کام لے کر بولی، ”آئی جان! آپ معافی مانگ کر کیوں شرمندہ کرتی ہیں۔“ آپ میری ماں ہیں۔“

”تمہاری سعادتمندی سے میرا دل خوش ہو گیا ہے بیٹی! —“ پھر وہ تھوڑی دیر تک کر بولی۔ ”تمہارے گھر میں تو سب طرح خیریت ہے نا؟ ان کے لہجے میں تقاضا کا عنصر تھا۔

”جی آئی جان! اس نے شیریں لہجے میں کہا۔“ ابا جان بیمار ہو گئے تھے۔ اب رو بھرتا ہیں۔“

”خدا انہیں تندرست رکھے بیٹی۔“ وہ تمہارے انکل کے بڑے گہرے دھڑکنے والے

میں بیٹا۔

”ابا جان نے بتایا تھا آئی جان! —“ وہ غلوں بھرے لہجے میں بولی۔

”تمہارے چہرے سے سفر کی تھکن جھلک رہی ہے۔“ وہ متا بھری آواز میں بولی۔

”ممنہ ہاتھ دھو کر چائے پی لو۔ پھر آ جانا۔“ پھر انہوں نے تصویر کی طرف دیکھا۔

”تصویر بیٹا! شبیلہ کو باہر دم دکھا دو۔“ پھر انہوں نے شبیلہ کی طرف پیار سے۔“

دیکھ کر کہا: ”بخئی تو ٹھیک ہے نا، بلکہ جاتی ہے۔ تم دونوں کیا اس وقت دیکھا تھا، جب تم جھوٹی چھوٹی تھیں۔“

”بخئی ٹھیک ہے انٹی جان اور کالاج جاتی ہے۔“

بخئی کے ذکر سے قصور کہہ کر پرگلا نی رنگ پھیل گیا تھا اور وہ خدا اٹھ کر چلنے لگا تھا۔ شبیلہ بھی اس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھانے لگی تھی۔ کمرے بھر پھیلے میں لاکر قصور نے سامنے اشارہ کیا۔

”وہ سامنے باہر روم ہے۔“ وہ مسکرایا: ”میرے خیال میں آپ نے دیکھ لیا ہے۔“

”بالکل دیکھ لیا ہے؟ وہ بھی مسکرائی اور آگے چل دی۔ وہ پٹا اور تشکیلہ بیگ کے کمرے میں آگیا۔

شبیلہ

ڈرائنگ روم کے آگے سے گزری۔ دفعتاً اس کے کانوں میں سہیل اور شبیلہ کے باتیں کرنے کی آواز آئی، اس نے آگے بڑھ جانا چاہا۔ مگر تجسس کے فطری جذبے نے اس کے قدم روک لیے۔ اور وہ دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔ دروازہ اچھٹی طرح بند نہ تھا۔ فدا سنی دواز تھی۔ اور وہ ہمہ تن سماعت بنی ہوئی تھی۔

”شبیلہ سے آپ کی رشتہ داری کا سجدہ تو کھل گیا ہے۔ سہیل؟ تمثیلہ معنی خیز انداز میں بولی۔

”کیا مطلب؟“ سہیل جیسے کچھ نہ سمجھا: ”یہ آپ نے کیسے جانا کہ شبیلہ میری عزیزہ نہیں ہے۔“

”آپ اب بھی اسے عزیزہ مانتے ہیں؟ وہ مسکرائی: ”تو بتائیے اس سے آپ کی کیا قربت والی ہے؟“

”وہ میرے اکل کی بیٹی ہے“ وہ بات بنا کر بولا۔
 ”کیا نام ہے شبیلہ کے والد کا؟“ وہ اُسے غور سے دیکھ کر مسکرائی۔ وہ اُسے غور سے
 متوجع سوال سے ایک دم گھبرا گیا۔
 اگرچہ نسیم کے کاغذات میں شبیلہ کے والد کا نام درج تھا۔ مگر اُسے کبھی ایسا
 اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔ کہ وہ اس کی ملازمت کے کاغذات دیکھتا۔ اس کا رنگ لے لیا
 دم بدل گیا اور تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس نے زور سے
 قہقہہ لگایا۔

”تعب ہے۔“ زیر لب ہنس کر بولی۔ ”آپ کو اپنے اکل کا نام یاد نہیں۔“
 وہ خاموش کھڑا تھا۔ اور چہرے پر ندامت کے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔
 دروازے پر کھڑی ہوئی شبیلہ کی ذہانت کا قائل ہونا پڑا۔ اس نے سوال ہی اس
 قسم کا کیا تھا۔ کہ سہیل کا اُمجد جانا ایک لازمی امر تھا۔ اور وہ اہجبا اہجبا پریشان کھڑا
 تھا۔ اُسے کوئی جواب نہ سوجھ رہا تھا۔ وہ بڑی کشمکش میں گرفتار تھا۔ تمثیلہ کی اس
 بات نے شبیلہ کو بھی گھبرا دیا تھا۔

”یوں کہیے؟“ وہ سنجیدگی سے بولی ”مسٹر سہیل! کہ آپ شبیلہ کو پیار و محبت
 کی کہانیاں سناتے تو میری لے گئے تھے میں تو اسی روز سمجھ گئی تھی۔ جیسا کہ مجھے نظر دل
 کے تیر ہی کی ہبکی مسکراہٹیں۔ شرمیلی شرمیلی ادائیں۔ ان سب کے امتزاج نے آپ
 کی محبت کا راز فاش کر دیا تھا۔ مگر مجھے کوئی ایسا موقع نہ ملا تھا۔ کہ میں آپ کی محبت
 کا افسانہ سن سکتی۔ میرا شک اپنی حکمت نامہ ربا مادر اس کے بعد آج مکمل یقین میں بدلا
 ہے۔“ پھر اس نے ایک بخند دی آہ بھر کر کہا مجھے انوس ہے کہ آپ نے مجھے۔۔
 دھوکہ دیا رکھا۔“

”میں نے کبھی بھی کو دھوکہ دیا نہیں رکھا۔ سہیل جو شبیلہ لیے میں بولا۔ نہ مجھے کسی کو

دھوکے میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ تمام شرمندگی اس کے دل سے رٹ گئی تھی۔ ہوا اس کی جگہ ایک جوش لے لے گئی تھی۔

”اگر آپ کا شک یقین میں بدل گیا ہے۔ تو اس یقین کو اور مستحکم کر بیچ میں شبیلہ سے محبت کرتا ہوں، اور تازہ زندگی گنتا رہوں گا۔ اس کی محبت میرے دل سے نکلے کسی جھے میں بھی ختم نہ ہوگی اور نہ کوئی دوسری لڑکی ہی اس کے سوا میرے دل میں جگہ لے سکے گی۔ شبیلہ مجھ سے خواہ کتنی دور ہے مگر میں اسے اپنے دل کے قریب ہی محسوس کرتا ہوں۔“

”اے — میں — — وہ لیا ایک چچی —“ میں نہیں اپنے دل کے قریب پاتی ہوں جیسے تمہیلہ کو اپنے دل پر اختیار نہیں رہا تھا۔ وہ ایک اہم بات یوں نہیں کہہ گئی تھی۔ شبیلہ سے پہلے کی محبت کے اظہار نے اسے غصے اور جوش سے بھر دیا تھا۔

”میں تمہیلہ! میری خالہ کی لڑکی ناخرہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ ذرا رک کر لولہ! اور آپ نے بھی اپنی محبت کا اظہار کر دیا ہے۔ دنیا کی کوئی بھی لڑکی مجھ سے محبت کرے اور میں اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتا۔ شبیلہ کی محبت کے سوا اور کسی کی محبت میرے دل میں جگہ نہیں پاسکتی۔ آپ غلط امیدیں اپنے دل سے نکال دیجیے۔ آپ کے لیے یہی بہتر ہوگا، سایہ کے پیچھے بھاگنے والے اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ انہیں منزل کبھی نہیں ملتی — کبھی نہیں —۔“

وہ جوش بھرے لہجے میں لولہ جارہا تھا۔

”میں تمہیلہ! آپ مجھ سے وابستہ خیال کو دل کی گہرائیوں سے نکال دیجیے۔ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں کہ ہر روز ایک نئی محبت کی داغ بیل ڈالوں، ہر آن لپک نیا سوانح رچاؤں، محبت ایک ایسے احساس کا نام ہے جو خود بخود جنم لیتا ہے۔ دیر بعد ان چڑھتا ہے۔ اس میں کوئی زور یا کسی زبردستی کو دخل نہیں ہوتا، بس آپ لگو

عزت کرتا ہوں۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ یہی محبت، سماں کی قوت آپ مجھ سے درگمیں؛
تمثیل پھر یہی ہوئی خیر فی کی طرح گری۔

”نہیں — نہیں — سہل نہیں! — میں اپنی محبت کی قربان پر داشت
تہیں کر سکتی:

چند لمبے سکوت رہا۔ پھر تمثیل کی آواز آئی۔

”یہی محبت کو ٹھکرانے سے پہلے شاید آپ کو اپنے وہ الفاظ یاد نہیں کہ شبیلہ آپ
سے دور رہتی تھی۔“ پھر اس نے فزیر انداز میں کہا: ”اور دور رہنے والے سکون کا نہیں بلکہ
بے چینی کا پیغام دیتے ہیں۔“

”یہ شبیلہ کی طرف سے ملی ہوئی بے چینیوں کو تو اپنا سرمایہ حیات سمجھتا ہوں۔ پھر اچھے
فحش سے دلچیز کر بولانا بھجے احداث دیکھے۔ اب میں بولوں جاؤں گا؟“
”وہ تڑپ کر اس کے راستے میں آگئی۔

”محبت کو ٹھکرانے کے بعد وہ اندر وہ انداز میں التجا سے بولی: ”چائے تو
ٹھکانا کرنا جاؤ۔“

”اس تلکف کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ متانت سے بولا۔

”تلکف! — اس کے ہونٹوں پر حسرت آمیز مسکراہٹ تھی۔ تلکف تو میں
نے خفیت کے اظہار میں بھی نہیں کیا۔ جس کی سزا مجھے ٹھکرانی۔ پھر چائے میں کیا تلکف؟“
”میں تو بسے تلکف ہی سمجھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پھر کنگے بیٹھے دکھا۔

”میں چائے پینے بغیر آپ کو ہرگز نہیں چلنے دوں گی۔“ تمثیل غمزدہ آواز میں
کہتی: ”اور پھر مجھے سے ملے گا وعدہ کہ کے بھی ان سے نہیں ملیں گے۔ اگر آپ ان سے بھی ملنا
نہیں چاہتے تو پھر میری اچھا راستہ نہیں روکوں گی۔

”چلیے آج بے غلوس لیجو اختیار کر کے بول لے ان سے تو مزدوروں کا:

اس کے خاموش ہوتے ہی شبیلہ سامنے کے دروازے کی طرف چل پڑی۔ اور وہ اس کے ساتھ ساتھ قدم اٹھانے لگا۔

دورانے پر کھڑی ہوئی شبیلہ کڑیوں لگا جیسے کسی نے اس کے ہانگ میں۔
کیف و نشا طکی مسرت بھر دی ہو۔ سہیل اسے کتنا چاہتا تھا۔ اسے آج احساس ہوا۔
اس کی آنکھوں سے غبار جھپکنے لگا۔ اور دل کیف و نشا ط سے محروم ہو گیا۔ چہرے پر خوشیوں کی روشنی جھلک اٹھی۔ اس نے سہیل کو آزمایا تھا۔ یہ مادہ آزمائش تھی جس کی وہ منتظر تھی۔ سہیل کی محبت کس قدر عظیم تھی۔ روح کا بندھن اُن میٹ تھا۔ بندھن جس میں وہ۔
جکڑے جا چکے تھے۔ اور اب یہ بندھن کبھی نہ ٹوٹ سکے گا۔ اسے یقین ہو گیا تھا سہیل اسے کھلونا نہیں سمجھے گا۔ اس کے دل میں بھی سہیل کی محبت کا دریا موجزن ہو گیا تھا۔
اس نے دل کی استقامت گہرا یاد اسے اس کی پابست کو قبول کر لیا تھا۔ اس کی اس محبت کو اپنا لیا جو سوائے اس کے اور کسی کی نہ تھی۔ اور نہ کبھی ہو سکتی تھی۔ شبیلہ اہل تھی اور ہمیشہ اہل کہہ سکتا تھا اس نے اپنے دل سے عہد کر لیا۔ اور وہ فرحت و انبساط میں بلکے ہوئے کھاتی کسی بادہ خوار کی طرح غل غلنے میں چلی گئی۔ اس کی ہر ادا سے خوشیوں کے چستے چھوٹ۔
سب سے بڑے۔ انگ انگ بھول کی طرح کھلا جا رہا تھا۔

پھر سب ڈراما بیگ روم میں آگئے سہیل شبیلہ بیگم کی مزاج پر سی کر آیا تھا۔
شبیلہ بیگم نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر انہیں شبیلہ کا خیال آگیا تھا۔
جس کے قدا بعد انہوں نے شبیلہ کو غیب نظر دل سے دیکھا تھا۔
چند رسمی باتوں کے بعد شام کی چائے ختم ہو گئی۔ اور سہیل جانے کیلئے اٹھا۔ سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”آپ کس بومس میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“ شبیلہ پر غلو مہلچہ میں بولی۔ ”میرا شاید کسی وقت آؤں۔“

۔ صدہا میں۔ عمران بوٹل۔ کرہ غیر باغیس۔ اس نے کہا اور شیلہ پر ایک
 نظر ڈال کہا ہر کی طرف چل دیا۔ تمثیلہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چل دی۔ اور قصہ شیلہ کو
 اس کے کرے تک چھوڑنے کیلئے اس کے ساتھ ہو لیا۔
 شیلہ نے جاتے ہوئے سہیل پر ایک نظر ڈالی۔
 عمران بوٹل۔ کرہ غیر باغیس۔ وہ زیر لب اس کے کچھ بولے
 الفاظ دہرا رہی تھی۔

تشکیل ہو چکے تھے۔ سب سے انداز میں ہونٹوں میں عریان کے چہن سے گزرا کر امداد غمارت میں داخل ہوئی۔ اور کارکنی طرف برہمی وہ کلاوٹر کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ کلاوٹر پر سے کھڑا ہوا ایک شخص کہہ لیا: "اس کی طرف متوجہ ہوا۔"

فرمایا: "وہ منہم انداز میں مجھم اخلاق بن کر بولا۔"

"سہیل صاحب سے ملتا ہے کہ نمبر ۱ میں ہیں۔" اس نے شیریں اور

سمبر سے ہونے لگے میں کہا۔

"سمبر نے؟" وہ خون کی طرف لپکا۔ "ابھی پتہ کرتا ہوں۔" اس نے ذرا لپک

کروڑن کے کریڈٹل سے ریسورسٹھالیا۔

"سہیل صاحب! وہ لپکا۔"

"جندلے بعد وہ پلٹا۔"

"وہ کمرے میں موجود ہیں۔" اور اس کی طرف استغناء سے نظروں سے دیکھنے

”ابن سے کہیے: ”۔۔۔۔۔“ وہ بولی: ”تمہارا ملنا چاہتی ہے؟“
 زوجہ جان نے پھر سہل سے قن پر رابطہ کیا۔ چند لمحوں بعد اس نے سفید گئی سے
 اس کی طرف دیکھا۔

”آپ سے ملنا نہیں چاہتے۔“۔۔۔۔۔ اس کا بوجہ متین تھا۔
 وہ زیر لب مسکائی۔

”تمہارا نہ سہی؟“ وہ دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”کہیے: تمہارا ملنا چاہتی ہے؟“
 پھر سے سوچ لیجئے۔۔۔۔۔ وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ کر بولا: ”کہیں پھر
 سے نام غلط نہ ہو جائے۔“

وہ اس کی نظروں سے گھبرا گئی اور فضا ہی متین اور شرمیلے انداز میں گردن۔
 جھکا لی، زوجہ جان مسکرایا۔

”تمہارا نہیں۔۔۔۔۔“ وہ ماؤتھ پیس میں بولا شہیلہ ملنا چاہتی ہیں جناب آپ
 سے۔۔۔۔۔

”آپ کو فوراً ملایا ہے۔“ وہ آپ کے منتظر ہیں: ”زوجہ جان کیڈل رکھتے ہوئے
 پولار پچھل اس نے ایک ویٹر کی طرف اشارہ کیا۔

”صنیں!۔۔۔۔۔“ وہ بیر سے مخاطب ہوا۔ ”مرہ نمبر رائیس بلک۔
 حیدر آؤ۔۔۔۔۔!“

ویٹر چل پڑا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ ایک استغاثی سی دہشت اس
 کے دل میں ابھر رہی تھی۔ گماں دہشت میں بھی اسے لطف و سرور کا احساس ہو رہا تھا۔
 اور اس کی روح دل سے اٹھنے والی کیف آگس سرگوشیاں سن کر شادمان ہو رہی تھی:
 گہرے محاب سے ۳۱ کے قدم صبح داغ ہے تھے۔ اور وہ چلتے ہوئے (ٹوکرہ) سی
 رہی تھی۔

اس کے ہونٹوں پر ایک شرمیلی سی دلنواز مسکراہٹ کھل رہی تھی۔
 ”اب آپ کو میری موجودگی سے بھی حیرت ہونے لگی ہے۔“
 ”آٹھ گھنٹے پہلے والے اگر اچانک سامنے آجائیں، تو قویٰ ہونا ہی چاہیے۔“
 ”آنکھیں کس نے پھیری تھیں؟“
 ”آپ نے۔“

”دہم تھا آپ کا۔“
 ”جیسا! —“ اس کے لہجے میں جذبات کی گہری لرزش تھی۔ ”یہ کیا کہہ رہی
 ہوتی؟“

”ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں۔ وہ پیار سے نظریں جھکا کر بولی، حالات نے مجھ دھڑھونے
 پر مجبور کر دیا تھا، مصلحت کے تقاضے مجھے دھڑلے گئے تھے۔“
 ”یہ ایک اس کی جہلی شونجی ابھری، اور خود پر قابو پا کر بالکل سنجیدہ ہو گیا۔“
 ”مگر اب وقت کافی دھڑھانچکا ہے، وہ مصنوعی اداسی سے بولا، ”گھر والوں نے
 مجھے خانہ کے پتلے باندھنے کا وعدہ کر لیا ہے۔“
 ”جہلی کا خیال تھا کہ وہ اس جھلے پر ایک دم افسردہ ہو جائے گی، مگر اس کا یہ خیال
 حقیقت کا روپ نہ دھار سکا۔“

”وہ مسکرائے جا رہی تھی، اس پر پہلی کو سخت حیرت ہوئی، مگر اس نے اپنے
 استودھتانات کو برسرِ ارادہ رکھا۔“
 ”اب میں سوچتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”خانہ کی باری ہے گھر والوں نے ٹھیک
 ہی فیصلہ کیا ہے۔“

”میرے خیال میں بھی ٹھیک فیصلہ کیا ہے، وہ چٹل لہجے میں بولی۔ اس کی ہیرت
 یہ تھی جا رہی تھی، اور اس میں پریشانی کے عناصر بھی شامل ہونے جا رہے تھے، وہ نتیجہ

کہ وہ اس کی بات سے ناراض کیوں نہیں ہوتی۔ پیشانیوں نہیں جاتی۔ سچے پاکیزہ نہیں
 ہو جاتی وہ تو پہلے سے بھی زیادہ شوخ اور سرور ہو گئی تھی۔
 وہ فیصلے سے لپٹیں ذرا اٹھوس نہیں ہوا؟ ————— وہ انتہائی حیرت سے
 بولا۔

”ذرا بھی نہیں! ————— سچ جانے بالکل نہیں۔“
 سہیل کی پریشانی اور حیرت اب انھن میں جدیدی ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ
 نہیں آ رہا تھا۔ کہ شبیلہ جیسی تنک مزاج اور جذباتی لڑکی ذرا بھی خفا نہیں ہوتی۔ پریشان
 کن سوچ کی ایک بھی لکیر اس کی خوبصورت پیشانی پر ہو پیدا نہیں ہوتی۔ وہ حیران ہوا۔
 تھا۔ تندیب، ترد اور کنگھن اس کے چہرے پر پھیلتی ہی جا رہی تھی۔
 ہونٹوں پر دبی دبی نشاط انگیز مسکراہٹ لیے لمبے قائل آنکھوں سے دیکھ رہی تھی
 اس کے انداز میں التفات تھا۔ وہ اس کے التفات سے ندامت سی محسوس کرنے لگا۔
 اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس نے بے ساختہ تہققہ۔۔
 لگایا۔ ”وہ ہنسی ہی چلی گئی سہیل کو یوں لگا جیسے کہنے ہی ملو تو کیت اس کے سماعت کے
 پردے سے سرور انگیز انداز میں ٹکراتے لگا ہوں۔ وہ ہنسی ہوئی شبیلہ کو مبہوت بنا دیکھتا ہی
 رہا۔ وہ ہنسی ہوئی اسے بہت ہی رغبت کھائی دے رہی تھی۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ
 اسی طرح کھکھا کر ہنسی رہے۔ اور وہ لمبے دیکھتا رہے۔ صدیاں گزر جائیں، زمانے بدلتے
 جائیں۔“

پھر وہ اسے اپنی طرف سے بخودی کے عالم میں دیکھتی ہوئی سنیل لگئی۔ اس کے معصوم
 تہققہ بلی بلی مسکراہٹ میں بدل گئے۔ اس کے ساتھ ہی سہیل کی وارنگلی کا عالم بھی قدرے
 کم ہو گیا۔

”اب اس ادکاری کو جانے دیجئے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بچہ نہ سمجھتے ہوئے متحیرانہ بولا۔ ”کیسی اداکاری؟“
 خواہ مخواہ سنجیدہ بننے کی۔ ”وہ دلفریز ہنسی ہونٹوں پر لا کر اپنی کل ڈانٹیں
 دوم میں بڑے سوالی تھیلے سے تمام گھنگھڑیں من مچا ہوں۔“ مجھے معلوم ہو گیا ہے تھیلہ اور
 فاحشرہ سے کتنی محبت ہے آپ کو۔“

”اےہ — تھیلا! —“ اس کے پیچ میں پیار بھری لڑخی تھی۔ تو تم نے
 مجھے آزمایا، وقت نے میرے حق میں فیصلہ دے رکھا دیا۔ بے شمار تلخ منزلوں کے بعد مجھے
 اپنی منزل مل ہی گئی۔ میں تمہاری آزمائش میں پورا اتر ہی گیا۔ شکر ہے قدرت نے
 میرے دل کی آواز کو سن لیا۔“

اس نے سرشاری کے عالم میں اس کے گداز مانتا اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔
 اور تھیلا کو یوں لٹکایا جیسے ایک برقی رو اس کے جسم میں سرایت کر گئی ہو۔ وہ ناشائستگی
 کیف و سرور اپنے دل میں اترتا محسوس کرنے لگی۔ اس کے ہنگامہ میں خوشیاں
 غنم کی لہریں کر سچھنے لگیں۔ سرسراہٹ لگیں۔ اور ایک مستی بھرے انداز میں سہیل
 کی آنکھوں میں جھلکنے لگی۔

”میرا دل خیلانا۔“ وہ بے خودی کے عالم میں بولی۔ ”آخری منزل نہیں ہے؟“
 ”تھیلا! —“ وہ پیار سے مسرود ہو کر بولا، ”تم ہی تو میری آخری منزل ہو مجھے
 تمہاری محبت مل گئی سب کچھ مل گیا۔“

اس نے پیار سے تھیلہ کے ہاتھ دبائے اور وہ برقعہ ہوتی مسرتوں سے مسرود ہو کر
 مشکلائی۔ لجاؤ اور سمیٹ سی گئی۔ اس کے چہرے پر فرحتوں کی شفق چمک رہی تھی۔
 ”آخری منزل کا فیصلہ تو ہمارے والدین کریں گے۔“ اس کے پیچ میں ہلکی
 سی تشویش ابھری۔

”اےہ! —“ وہ بہت ہی پیار سے بولا، ”تم اس کی فکر نہ کرو میرے ڈیڈی

میری پسند کو کسی نہیں ٹھکرائیں گے۔ اور وہ اس کا اظہار بھی کر چکے ہیں۔ میری اپنی پسند پر یقین کوئی اعتراض نہ ہوگا۔
 کس پسند کے بارے میں کہہ دو گے۔۔۔ اس نے نظریں جھپکا کر غصہ ہلاکوار میں کہا۔

”ناخنہ کے بارے میں۔ وہ شریفی سے بولی۔
 اس نے ذرا نظریں اٹھائیں اور اسے پیار سے گھورا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ شبیلہ۔
 جہننے لگی

”دل سے کہہ رہے ہو۔۔۔ وہ تشریفی اداؤں کا مظاہرہ کر کے بولی۔
 دل تو تہہ ہارے پاس ہے۔“ وہ برجستہ بولی۔
 ”جیب دل میرے پاس ہے۔“ اس نے اداسے آنکھیں میٹکائیں۔ تو ناخنہ کو کیا دو گے۔“

”روح۔۔۔ وہ یلا کیسا سفید ہو گیا۔۔۔ کہتے ہیں روح کے بندھن بہت مضبوط ہوتے ہیں۔

۔ وہ کانپ گئی۔ اس کے انداز سے شبیلہ کا دل ہول کھاتے لگا۔
 ”اگر روح کے بندھن اتنے ہی مضبوط تھے۔۔۔ وہ تلخ لہجے میں بولی۔ تو مجھے کیوں بے چین کرتے رہے جو۔۔۔ اس نے اس کے تلخ لہجے کو محسوس کیا اور دل ہی دل میں ہنسا۔

”کوئی خود ہی بے چین ہو جائے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“ اس کا لہجہ خشک تھا۔
 شبیلہ نے ہنسی کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر تلخیوں کے انہار لگ گئے۔
 بے ساختہ اس کا دل سمیر آیا۔ اور اتنی لمبی لمبی پلکوں کے حصار توڑ کر رخساروں پر جہننے لگے۔

سہیل بے ساختہ تگے بٹھا اور برٹے ہی پیار بھرے انداز میں شہیلہ کو اپنے ہاتھوں میں کھینچ لیا۔

”شہیلیا! — اس کے لہجے میں ان گنت پیار چل رہے تھے۔ ”میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میری غلط کو جانتی بھی محوتم۔ — تم! تمہیں تو میری منزل ہو — آخری منزل۔ تمہارے بغیر یقین جالو یہ سنار میرے لیے ایک کھنڈ سے زیادہ کچھ نہیں وہ مسکماں بھرتی ہوئی بے اختیار اس سے پٹ لگئی۔

میں بہت حساس ہوں سہیل! وہ پچکیاں لیتے ہوئے بولی: ”مجھ سے دل جلائے والی شوخی نہ کیا کرنا۔ ”وہ نہ میں مر جاؤں گی۔ ”مر جاؤں کی سہیل۔

”مرنے کی باتیں نہ کرو: ”وہ اس کے بالوں میں لمبے پتھر کر بولا: ”زندگی نے ہمیں خوشیاں بخش دی ہیں: ”پھر اس نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ ”لاؤ یہ آنسو پونچھ دوں: ”جو میری محبت میں پہلی بار بیٹھے ہیں: ”وہ اپنا رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ ”پہلی بار۔ سہیل کاش تم یہ جان سکو یہ آنسو کتنی بار بیٹھے ہیں۔ یہ آنکھیں کتنی محنت — اشک بار رہی ہیں: ”

”اوہ — اچھا — اب مسکرا دو: ”وہ اس کے آنسو پونچھ کر بولا: ”

وہ جب چاب کھڑی رہی

”اب مسکراؤ گی بھی نہیں۔ ”وہ برا سامنے بنا کر مصیبت سے بولا۔ اور وہ اس کے

اس انداز پر بے ساختہ ہنس پڑی۔

”ہاں! ”وہ خوش کن لہجے میں بولا۔ ”یہ ہیں محبت کے انداز

وہ اس کی اس بات پر شرا لگئی۔ اور سمجھنے سمجھنے سے انداز میں اسے محبت سے

بریز لگا ہوں سے دیکھا۔

”بنانا خوب جانتے ہی آپ! ”وہ ہونٹوں کے زائیلے بدل کر اداس لہجے میں بولا۔

”ہاں لوگ کہتے ہیں : ”وہ غرے لولا۔“ میں اس فن میں ماہر ہوں :
 ”اور محبت کرنے میں بالکل اناڑی ہو۔“ اس نے چٹنی سی چک کر کھا کر کہا۔
 ”تم تو تجربہ کار ہونا۔“ اس نے برکت کہا۔ اور وہ شرم سے کٹ کر رہ گئی۔ وہ لیلیک
 متین ہو گیا۔

”اچھا یہ بتاؤ۔“ وہ لولا۔ ”اگر میرے ڈیڑھی رمضان نہ ہو گئے تو تمہارے والدین کو
 لڑکائی اعتراض نہ ہوگا۔“

”میرے خیال میں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”انہیں بھی کوئی اعتراض
 نہ ہوگا۔“

”واہ ری قیمت!“ — — — اس نے ایک شوخ نعرہ مارا۔ ”تب تو پھر محبت
 کی خوشیوں سے لبریز آخری منزل قریب ہی سمجھو۔ بہت قریب۔“

شبیلہ نے شرما کر نکالیں جھکالیں۔ اور سہیل نے پیار سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔
 ”ہاں یاد آ رہا۔“ وہ اس طرح اچھلا جیسے کوئی سچولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔ ہاں۔
 یہ تو بتاؤ تم نے ہوٹل کے ملازم سے یہ کیوں کہا تھا کہ تمہیلہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔
 ”کیا شوخ لوگوں سے۔“ وہ لگا دٹسے بولی۔ ”شوخی کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔“
 ”خوب ادا کی ہیں شوخی کی۔“ — — — وہ اس کا بازو کچھ دکر اپنی طرف کھینچتے ہوئے
 بولا۔

”سجیدگی کے پردے ہٹا کر ایک دم چٹنی ہو گئی ہو۔“ — — — محبت بھی کیا سے کیا
 بنا دیتی ہے انسان کو۔“

سودھ پہاڑوں کے چیمچ غروب ہو رہا تھا۔ اور رات کی تاریکی پھیلنے لگی تھی۔
 ”اب میں چلتی ہوں۔“ وہ بولی۔ گھونٹے کا یہاں نہ کر کے نکلی تھی۔ لیکن کافی دیر

ہو گئی۔

کل صبح میں یہیں انتظار کروں گا۔ وہ مسکایا۔ ایوب پارک چلیں گے۔ ادا کی ناہ
 ضرور آؤں گی۔ وہ مستحکم لیجے میں بولی۔ ”اب تو آنا ہی پڑے
 گا۔ یہ تو روح کے بند من ہیں نا۔“
 ”روح کے بند من۔“ وہیں کے لہجہ میں نعمات کا رچاؤ سمٹا۔

دس بج چکے تھے۔

شبیلہ ابھی نہیں پہنچی تھی۔

سہیل مرتے انتظار بنا ہوا بے چینی سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی بے چینی اور اضطراب میں ہر آن اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ بار بار کلائی اُونچی کر کے گھڑی دیکھتا۔ اندر پھر دروازے کی طرف نظر لگا دیتا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

”آپ سے مس تشیلہ بات کریں گی ٹیلیفون آپ پر میرے بتایا۔

”نہیں — نہیں، انہیں کہہ دیں پھر کسی وقت فون کریں۔“

لیکن ناگاری اس کے چہرے پر مسلط ہو گئی۔

سانے دس بجے کر کے باہر تڑیوں کی آہٹ ہوئی۔ چند لمحوں بعد شبیلہ اندر داخل ہو گئی۔

”بڑا انتظار کرایا —“

کی اجازت لے کر آئی ہوں :

ہوں ۔ ” — ” وہ سنجیدگی سے بولا ۔ ” ان سنے ہاں ملازم ہو گئی ہو کیا ؟ ”
 ملازمت کیسی ؟ — ” دو بیارے بولی ٹشکیلہ بیگم اباجان کے مرحوم دوست کی
 بیگم ہیں ۔ اس لیے انہوں نے مجھے ان کی نیا داری کے لیے بھیج دیا ہے ۔ ” پھر وہ خود بخود
 شرمائی دئیے بھی ابا اور امی کا خیال ہے ۔ کہ تقور سے بچی کی شادی کر دی جائے ۔ وہ ایک
 دوسرے کو چاہتے بھی ہیں ۔ آپ کا کیا خیال ہے ۔

” میرا وہ چنگ کر مسکریا ۔ اگر وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو شادی کسے نہیں کیا
 قیامت ہے ۔ ” پھر اس نے شید کو غور سے دیکھا اور خسرات آمیز لہجے میں بولا ۔ ” بچی چھوٹی
 ہے نا ۔ ”

” مجھے سے چھوٹی ۔ ”

” پھر تو تنہا ہی شادی پہلے ہوتی چلیجئے ۔ ” وہ شوخ لہجے میں بولا ۔ شید کا ۔
 حسین پکیر ایک دم گہرے حجاب سے محبت کیا ۔ اور اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا ۔
 ” منہ دھور کیجئے ۔ ” وہ زم لہجے میں نظر جھکا کر بولی ۔
 ” ارے — ” آدہ مسکرا کر بولا ۔ ” شیروں کے منہ سے کسی نے دھکا

ہیں ۔ ”

” دیکھئے ۔ ” اس نے بھی چپیل لہجہ اختیار کیا ۔ ” مسٹر شیر ! اب وقت
 مٹانے نہ کیجئے ۔ ”

” یہ کوئی آفس نہیں ہے ۔ ” اس نے آنکھوں میں شوخ کی چمک لا کر کہا ۔ ” کہ تمہارا
 وقت ضائع ہو گا ۔ اور بھائی جان کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا ۔ تم وہ ذکر کی کیا
 کی چھوڑ چکی ہو ۔ ”

وہ ایک دم گہرا سی گئی ۔ اس کے تقورات کی روراہیل کی طرف منتقل ہو گئی اور

ماتیل کی پر خلوص صحبت پر وہ ذہن پر منکس ہوئے لگی۔ وہ کتنا پر خلوص اور سہل حال انسان ہے۔ اس نے بڑے وقت میں اس کی مدد کی تھی۔ وہ اس کی ہمدردی اور اخلاق کو کبھی سراہا ہوش ذکر نہ کرتی تھی۔

وہ اُسے سوچوں میں پڑنے دیکھ کر نفرت سے ہنسا۔

”بھائی جان! — اس کا لہجہ شریر تھا۔“ یاد آ رہے ہیں کیا —

”ہاں! — اس نے مفصل لہجے میں کہا۔“ وہی یاد آ رہے ہیں۔“

اس جملے پر اس کی تمام شوخی اور طراری ختم ہو گئی۔

”ہوں! — اس کا لہجہ خشک ہو گیا: اس لیے کہ وہ تمہیں تنہا کیوں میں ٹوٹ

لے جاتے تھے میرے خیال میں تو وہ تم سے پیار کرتے ہیں اور تم

وہ خاموش ہو گیا۔ بات بول رہی نہ کر سکا۔

”یہ بھی کہہ دینے کہ میں بھی ان سے پیار کرتی ہوں۔“ اس کا لہجہ بہت ہی مثبت

ہو گیا۔ پیار اور احسان شناسی میں بڑا فرق ہوتا ہے تنگی مزاج سہیل صاحب! راسیل صاحب کی ہمدردی اور خلوص کو خاموش نہیں کر سکتی۔ وہ محکم اخلاق ہیں نیکی کا فستقہ

میں غظیم انسان ہیں۔ میں ان کی عزت کرتی ہوں۔ نقد کرتی ہوں۔ عقیدت کی حد تک،

انہوں نے اپنی ہر باتوں سے میرے بے حالات کو پلٹنے کی کوشش کی تھی:

”اور میرا کوئی خیال نہیں ہے۔“ وہ اس کے انداز تکلم سے مسرور ہو کر بولا: ”جو تمہاری

زندگی میں خوشیوں کا بیجام لے کر بھیگی ہوئی رات میں داخل ہوا تھا۔ اس احسان کی تم نے

کوئی حاد نہیں دی۔ میری کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی —

”یہ حوصلہ افزائی نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کے لہجے میں ناز تھا۔ میں نے اپنی زندگی

ہی تمہیں مے دی ہے:

”زندگی کے بدلے زندگی کا سودا کیلے ہے۔“ وہ اسے شوخ نگاہوں سے دیکھ کر

بولاریہ تو سودا ہے حوصلہ افزائی کیسی:

ہوں میں غلط کہہ گئی ہوں، ”وہ سچا سی گئی۔ اور جھٹکا کر بولی۔ چلو اور حوصلہ شکنی

سمجھ لو۔“

”وہ اسے عمیق نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ اسے مسکراتے دیکھ کر اور جھٹکا

گئی۔

”اب وقت ہی ضائع کئے جاؤ گے۔“ وہ بولی۔ ”یا چلو۔ گئے بھی؟“

پیار بھری باتوں کو تم وقت ضائع کرنا کہتی ہو۔“

”اللہ!۔۔۔“ وہ جریز ہو کر بولی۔ ”اب دیا وہ باتیں نہ بناؤ۔“

اس نے خروغ انداز میں تشبیہ کی نقل اتاری۔

”اللہ!۔۔۔“ وہ دیا زیادہ باتیں نہ بناؤ۔“ ساری محذروں کو میں یہی ایک جملہ آتا ہے

وہ شرم سے کٹ کر رہ گئی۔ دینی دینی مسکراہٹ اس کی یافتہ کی ہونٹوں پر چلنے

لگی۔

”بہت تنگ کرتے ہو۔ بہت ستاتے ہو۔“ اس نے منہ بنایا۔ اب چلو بھی نا۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔“ وہ چند قدم چا پھر رک گیا۔ ”چائے نہ پی میں۔“

”اس نے پیار سے سہیل کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اسے آگے کی طرف کھینچا۔“

”نہ۔۔۔۔۔“ وہ اداے چل کھا کر بولی۔ ”یہاں نہیں!“

”شباب!۔۔۔“ اس نے پیار بھری سرگوشی کی۔

”جی!۔۔۔۔۔“ اس نے بھی سرگوشی میں بے ساختہ تنہا جیسے وہ نشیلی فضاؤں

میں اڑنے لگی ہو۔ اور اس کا پیکر محبم سرور بن گیا ہو۔ نشہ ہی نشہ اس کے دگر وچھل گیا

تھا۔ اور وہ اس کے لپیٹ بس آتی تھا رہی نہی اسے یوں لگتا تھا۔ جیسے اس کے شور

کو ایک کیف بار سے طمس نے خرابیدہ کر دیا ہو۔ وہ مدہوش ہوئی جارہی تھی۔ آنکھوں

میں سارے صبی کیفیت چھار ہی تھی۔

”شبیبا۔۔۔۔۔ جیسے دود کہیں سے آواز آئی ہو۔۔۔۔۔“ اب مجھے جدائی کے
دارغ نہ دینا۔ اب کسی آزمائش سے دوچار نہ کرنا :

وہ کچھ نہ بولی اور اُسے ترجمی نظروں سے دیکھتی رہی۔ وہ بھی اسے دیکھ رہا تھا وہ
شرابی، سبائی بہت خوب و دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے جھیل میں بہتا کنول۔ جیسے گلاب کی
شاخ پر جھولتی ہوئی سرخ کلی۔ جیسے تساعف کی روشنی میں عطر ریز ہواؤں کی ہمارے جیسے
بادلوں کے آغوش میں چھپتا نکلتا چاند کا ٹکڑا اس کے سیپ جیسے حسن کی دلکشی میں کھو بیٹھا
تھا۔

”خالیوں کی دنیا سے باہر نکل کر دیکھو۔“ اس نے اس کا بازو پکڑ کر پیار سے ہلایا۔
ہم ابھی تک کہاں کھڑے ہیں۔

”چاند کی دنیا میں۔۔۔۔۔“ وہ تعوراتی لہجے میں بڑبڑایا۔ جیسے خود سے۔
بھکلام ہو۔

”چاند کی دنیا میں نہیں ہو مل کے کرے میں : وہ مسکرا کر بولی۔ اور اس کے بازو
کو زور سے ہلایا۔

”ادہ!۔۔۔۔۔“ وہ اُسے گہری چاہت سے دیکھ کر بولا۔۔۔۔۔“ کتنا حسین
نصرت تھا!۔۔۔۔۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور اس کے خوب دھڑکے پر میٹھی نظریں دوڑنے
لگا۔ شبلیہ نے تادم آگے بڑھایا۔ اور اس کے بازو کو جھٹکا دیا۔ وہ اس کے ساتھ
ساتھ بولی۔

دونوں پیپ چاپ لاؤنچ سے گزر کر باہر آگئے۔ لمبے پورے میں کھڑی موٹی اس نے
ایسی نگاہی کا دروازہ کھولا۔

”بیٹھے بنا۔۔۔“ وہ پیار بھری آواز میں بولا۔ شبیلہ نے اسے مسرت بھری حیرت سے دیکھا۔

”گاڑی بھی لے کر آئیں خواب؟۔۔۔“ وہ نزاکت سے بولی۔
 ”مجھے پتہ تھا۔ اس کی شوخی پھر ٹوڑ کسائی۔“ انہیں سیر کرانی پڑے گی۔ اسی لیے گاڑی لے کر آیا ہوں۔“
 ”جھوٹے کہیں کے!“ وہ لگاؤ سے بولی۔

”دونوں کھکھلا کر ہنس پڑے۔ شبیلہ۔ ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی۔ نشست پر بیچہ لگتی وہ بھی سیٹی بجاتا ہوا اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس نے بڑے چنچل انداز میں گاڑی، اسٹارٹ کی اور تیزی سے بھگا کر ہوٹل کے گیٹ سے باہر نکلا۔
 گاڑی تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ سرسبز شجر طویل عرصے جاتی تھی۔ وہ خاموش بیٹھے تھے۔

”اوہ!۔۔۔ کوئی بات کرو؟۔۔۔“ وہ ذرا سارخ پھیر کر دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا بات کروں؟ وہ یونہی بولی۔
 ”تو پھر میری باتوں کا جواب دو۔“ وہ مسکایا۔
 ”کچھ باتیں!۔۔۔“ وہ ناز سے بولی۔
 ”گھر میں بچی کے علاوہ کتنے بہن بھائی ہیں۔ وہ اس کی فیملی سے متعارف ہونے کی غرض سے بولا۔

”کوئی نہیں!۔۔۔“ وہ خدا داد اس ہو کر بولی۔ گھر کے چار افراد ہیں۔
 میں، بچی، امی دادا با جان!۔۔۔ ابا جان بنک میں ملازم ہیں۔ سیکوری کے دولہے ہیں۔
 گھر پر پڑے رہتے تھے اب رو بہ صحت ہیں اور باقاعدگی سے بنک جاسکے ہیں۔“

"ہوں! —" پھر وہ مطمئن انداز میں بولا: "بھئی! ہماری ضلیٰ تو حامی
 ہنگامہ خیز ہے۔" ڈیڈی، میں، بھائی جان، ارم جونی، اے کی طالبہ ہے چھوٹی بہن
 ہے، ایک، اور بہن ہے! شاہدہ! بڑی شریہ ہے۔ مجھ جیسی۔ اور مجھ سے بہت محبت
 کرتی ہے — اُمّی کا انتقال کئی برس پہلے ہو چکا ہے؟
 امی کے ذکر سے وہ کچھ اداس ہو گیا۔
 اسے دیکھ کر وہ بھی غمزدہ ہو گئی۔ اسی خاموشی میں وہ ایوب پارک پہنچ گئے

سہیل

آہستہ سے پارک میں کار ٹھہرا دی۔ دونوں گاڑی سے نیچے اتر آئے شہیلہ
 مسکراتی ہوئی ایوب پارک کو پر شوق نظروں سے دیکھنے لگی، ہلکی مہکتی ہوا چلی دی
 تھی جتنی کا دن ہونے کی وجہ سے ایوب پارک میں کافی روشنی تھی۔ کھیلنے ہوئے بچوں
 کے فکری قبضے ایک سامعہ لوازگو بج پیدا کرتے ہوئے فضا کی وسعتوں میں ممدوم ہو
 رہے تھے۔ ایک سحر سا پھیلا ہوا تھا، دھوپ کی خوشگوار تہذات انجانی راحتوں جیسا
 سکھان بخش رہی تھی۔ امنگوں بھری دلوں میں کیف سا اندر رہا تھا، ماحول بڑا ہی
 دلچسپ بڑا ہی پیارا تھا، حسین چوڑے پارک بن ادھر ادھر کھیرے زنائی کے حسن
 سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

کہیں تہقہ لگ رہے تھے، کہیں آنکھوں کے دکش، اشارے ہو رہے تھے اور
 کہیں محبت بھری سرگوشیاں ہو رہی تھیں، غزلت اپنی پوری رعنائیوں سے ایوب

پارک میں جلوہ گر تھی۔ ہر چیز مسرت بھری انگڑائی لیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔
 "کتنا شاندار موسم ہے۔۔۔" وہ خواب گوں آوازیں بولی۔

"وہ کیسا بار آوریں بولالہ۔" یہ زندگی واقعی حسین ہے۔
 "واقعی!۔۔۔" وہ بھی مسرور کن لہجے میں بولی۔ "آج تو مجھے بھی یہ زندگی بہت
 خوب قسمت لگ رہی ہے۔"

"زندگی کا حسن پیار میں معطر ہے۔ اس سے پہلے بھی زندگی ننھیوں کے سوا
 کچھ بھی نہ تھی۔"

"یہ فلسفہ بھی خوب ہے۔۔۔" وہ پیار سے بولی۔ "زندگی کی رعنائی کا تعلق
 دلوں کے جذبات سے ہے۔ جب دلوں میں راحتی ہوں تو زندگی کا دلکش احساس
 ہونا ایک قدرتی امر ہے۔"

دو دنوں نے سرشارانہ انداز میں ایک دوسرے کا ہاتھ ستھام کر پہاڑوں کی
 طرف نکلا ہیں جادیں اور بلبلے ملیے سانس لے کر روانہ پر در سر در محسوس کرنے لگے
 میں آج کتنا خوش ہوں۔۔۔" وہ اس کی طرف گھوم کر نشیلی آوازیں
 بولار۔ "میری خوشی کا آج ٹھکانا نہیں ہے۔ یہ دلکش فضا، یہ پہاڑ، یہ شجر و حجر یہ
 کیا رلیوں میں بہتے ہوئے چول اور خوشگوار انداز میں یہ دکھتا ہوا آفتاب سب کچھ
 کتنا سرور بخش ہے۔"

جب دلوں میں خوشیاں ناچ رہی ہوں۔۔۔" وہ بھی نشہ آور لہجے میں بولی
 تو ہر چیز رقص کرتی ہوئی دکھائی دیتی اور سرگوشی کے انداز میں جھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔
 "نہم بھی مارے خوشی کے جھومنے لگیں۔ وہ صحت انداز میں مسکرایا اور اس کا ہاتھ
 کچھ کرکے کی طرف چل دیا۔

"بہت سے چلے جا رہے تھے، خواب کے عالم میں، نشیٹے انداز میں۔ مگر

جذبوں کے سہارے ان کے قدم ہلکے ہلکے کراکتہ رہے تھے۔ اور لقریٰ قبیلوں کی گونج انہیں ہر آن ظلم انگیز نشہ و دلیت کراہی تھی۔ انہیں زندگی ایک لٹے اور سرور کے سوا کچھ اور محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

وہ چلتے چلتے ایک جگہ رُکے اور ہری ہری گھاس کے نیچے پڑے ہوئے ایک بیج پر بیٹھ گئے۔ ان کے بازو بیج پر بیٹھے ہی ایک دوسرے کی رفاقت کو چھوڑ چکے تھے۔ مگر دلوں میں پیدا ہونے والی رفاقت کم نہ ہوئی تھی، بلکہ وہ تو ہر ساعت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اور انہیں قریب سے قریب تر لا رہی تھی۔ ایک بن جانے کے لیے۔ دو طالب ایک جان ہونے کے لیے۔

”مقدس پیار کی لگن کتنی شدید ہوتی ہے۔“ وہ مسرورانہ لہلہا۔ ”دوبارہ کرنے والے ایک دوسرے کی طرقت مقناطیسی کشش لیے کیسے چلے آتے ہیں۔“

جیسے ہم کھینچے چلے آئے ہیں۔۔۔۔۔ شبیلہ نے مسرت انداز میں تاکید کی۔
 ”کہاں آکر ہماری اُسلگوں، خاموشیوں اور ارمالوں نے خوشیوں کا لبادہ۔ اور ٹھلے۔ اس کے پیر میں کیفیت تھا کہ یقین تھا کہ دفتر کی گھٹی گھٹی فضا میں پھرنے والے یوں ان کو ہماری فضا کی رنگینی میں ایک دوسرے سے لی سگیں گے۔ ایک دوسرے کے ہو کر نئی منزلوں کے راہی بن جائیں گے اور عیشہ کے لیے ایک ہونے کا عہد کریں گے۔“

نئی منزلوں کے راہی۔۔۔۔۔ وہ محبت بھری سسکی لے کر بولی۔ کتنا پیارا جملہ بے خوشیوں میں تھر تھرتھارے ہوئے حسین پیکر کی طرح نشہ انگیز۔

یہ راہی۔۔۔۔۔ یہ فضا بنی۔۔۔۔۔ یہ پہاڑ۔۔۔۔۔ یہ ٹیڑھے میڑھے راستے
 یہ سبزہ زار، یہ اونچے اونچے ہوا میں جھومتے ہوئے درخت اور رنگ برنگے پھتے ہوئے پھول ہماری محبت کے گولہ ہیں۔ ہمارے پاکیزہ جذبات کے امن ہیں۔۔۔

ہمارے یہ جذبات ان چیزوں کے جسموں میں اتر جائیں گے اور جب کبھی ہم یہاں سے گزریں گے قریہ پکار پکار کر کہیں گے۔ یہ ہیں وہ پیار کے مقدس۔
جذبات رکھنے والے لوگ جھڑوں نے ہماری مسکراہٹ کے جلو میں محبت بھلنے کا تہد کیا تھا۔

”سچی محبت ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔“ — وہ جذبات سے لرزتی ہوئی
آوازیں بولا۔

”اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔“ — وہ اس کی تائید میں گہرے دھوکے سے
بولی۔

”ہمارے فنا ہو جانے کے بعد سچی محبت زندہ رہے گی۔“
دفعتاً ایک آواز گونجی۔

دوڑوں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا، ایک لوجوان بیچ کھینچے سے کود کر سامنے
آگیا۔ یہ تصور تھا، اس کی آنکھیں شوحی سے چمک رہی تھیں۔ اور ہونٹوں پر ایک سنسنی
نیز و لکش سی مسکراہٹ تھی۔

”دیکھیے شبیلہ بہن! میں نے آپ کو تلاش کر لیا۔“

شبیلہ کا چہرہ زندہ ہو گیا اور سہیں نادم سا بونکر اسٹھ کھڑا ہوا۔

وہ اس غیر متوقع مداخلت سے سبھو بچکر رہ گئے تھے۔ حسین لغورات اکہ دم
فنا ہو گئے تھے، ایک بے کلی اور ایک بے معینی سی سرور انگیز دلوں میں اتر آئی تھی۔
وہ کچھ کہہ ہی نہ سکے، اور ایک دوسرے کو حجاب آلود چہ نظروں سے دیکھتے
رہے۔ پھر قدے حیرت کم ہونے پر انہوں نے جھبکی جھبکی سی شرم آلود نگاہیں اٹھا
کر تصور کو دیکھا۔

”اب زیادہ شرمائیے نہیں۔“ — وہ ان کے چہرے کے ندامت آمیز جذبات

سے لطف اندوز ہونے ہوئے بولا: "مہبت تو پھر ہے — اور ہجر زندگی ہے —
 پھر انہی زندگی ہے کون منہ موڑ سکتا ہے۔ مہبت کے بغیر انسان کی بھی تکلیف نہیں ہوتی۔
 دنیا کی ہر چیز مہبت کی ہی پروردہ ہے مجھے اپنا دوست سمجھو۔ ایک ایسا دوست بے غرض
 اور بے لوث، جو راز داں بن کر راز کی حفاظت کر سکے اور دو چاہنے والوں کو ایک دوسرے
 کے قریب اور قریب لاسکے۔"

سہیل چونکہ کر محبت سے اس کی طرف دیکھنے لگا، قصہ کے خلوص مہرے جذبات
 نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے اسے منوبیت سے دیکھا — اور اسی کی طرف
 ہاتھ بڑھایا۔

"تو پھر آج سے ہم دوست ہوئے —" اس کی آواز میں خلوص کی چاشنی
 تھی —

"بہت ہی گہرے دوست —" قصہ سہیل کا ہاتھ گر محوشی سے اپنے
 ہاتھ میں لے کر بولا۔

"آج تو قدرت بہت ہی مہربان ہے —" وہ خوشی سے بولا۔ ایک
 خلوص مہر اول رکھنے والا دوست بھی مل گیا۔ جس کی مجھے حسرت تھی۔
 "میری بھی یہی تنہا تھی۔" وہ اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔ کوئی بھائی نہ تھا۔ دوست
 کے روپ میں بھائی مل گیا۔

"بھائی جان! —" شبیلہ بھی اس اثناء میں اپنے پشیمان جذبات کو تالو
 میں کوچتی تھی۔ "آپ یہاں کہاں چھپے بیٹھے ہیں؟"

"چھٹی کدو میری بانی اسی پارک میں آنا ہے —" وہ مسکرا کر بولا۔

"یہاں آکر کسی نہ کسی بیخ کی پشت سے ٹیک لگا کر پڑھنے لگتا ہوں۔"
 "ہوں! —" وہ ہنسی۔ "کیا پڑھتے ہیں آپ؟"

”دردہ کتابیں؛ چلتی پھرتی داستانیں“ وہ بولا۔
 ”اے آج —“ سہیل شبیلہ کی طرف دیکھ کر مسکایا: ”ہماری داستان کا مطالعہ ہی کر بیٹے“ پھر اس نے شوخی سے کہا: ”یہاں آکر مطالعہ کرنے سے کچھ معلومات میں اضافہ بھی ہوا“

”بے بہا اضافہ“ — اس نے تہقیر لگایا۔ اگر چاہوں تو آپ لوگوں کو بلیک میل کر سکتا ہوں“

”اس پر سہیل اور شبیلہ بے ساختہ تہقیر لگا کر ہنسنے لگے۔
 ”چلیے —“ وہ بولا۔ اب میں آپ لوگوں کو گھماتا ہوں۔
 ”لنور نے انھیں پارک میں بھیجی ہوئی مصنوعی بہر میں بکشتی کی سیر کرائی۔ وہ انھیں خوب گھماتا رہا۔ جب وہ پارک کے اوپے نیچے سبزہ زاروں میں گھومتے گھومتے تھک گئے تو انھیں چائے پلانے کے لیے ہوٹل کا مہران لے آیا۔
 وہ چائے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ قہور کا ایک دوست مل گیا۔ اس نے شبیلہ اور سہیل سے رخصت ملی۔

وہ بھی اپنی کار کی طرف آئے اور ہوٹل کی جانب ہو لیے۔ مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی کار ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہو کر پورٹیکو میں آکر رک گئی۔
 ”اڑیے حرمہ! —“ وہ شوخ انداز میں بولا۔ آپ کی منزل آگئی۔ میرا بل مجھے دیجیے۔“

”وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر مسکرائے — اور وہ
 نیچے نظریں کے ہونٹوں میں دبا دیا قسم لیے دل کی دھڑکنیں سن رہی تھی۔ اس کا ہاتھ اس کی نظروں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ یکایک اس نے سر اٹھایا۔
 ”ڈرائیور! — ہماری یہ منزل نہیں“ وہ مناسبت اور حکمانہ لہجے میں بولی۔

”ہم اپنے بنگلہ پر جانا چاہتے ہیں۔“

”چاہے پیسے کے بعد۔۔۔“ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے کہا
”ڈراما گور اس حکم کی تعمیل کرے گا۔“

”ہیران ڈراما گور!۔۔۔“ وہ بولی: ”ہم بار بار چاہے پیسے کے عادی نہیں ہیں اور نہ اب زیادہ دیر یہاں ہی ٹھہر سکتے ہیں۔“ اپنی گاڑی منبھا لیے
”ہم چلے۔“

”چاہے نہ جیسے گا۔ کھانا کھالیمے گا۔“

”دیر ہو گئی ہے۔۔۔“ وہ بچوں جیسی معصومیت سے بولی۔ پھر کبھی سہی۔
”کچھ سمجھا ہو۔۔۔“ وہ بغیر ہوک بولا۔ ستھوڑی دیر تو مہتیں میرے کمرے
میں ٹھہرنا ہی پڑے گا۔

”اس نے اپنے ہونٹوں پر ایک ہلکی ہلکی مسکراہٹ پھیلانی اور نیچے اتر کچل۔ وہ بھی
اسے ساتھ ہی نیچے اتر آیا۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اندر جانے لگے۔“

ہاندرہ بارہ تھے اور دو حسین آنکھیں تندیب کے عالم میں انھیں گھور رہی
تھیں، ان میں فتر، غضب، کشمکش اور ذہنی خلفشار کے تاثرات تھے جن میں درد کی
ہلکی سی جھلک بھی تھی۔ یہ آنکھیں تنیلہ کی آنکھیں تھیں جو تیسری بار اپنی کار میں بیٹھ کر
اس سے ملنے ہوئی آئی تھی۔ اور سہیل کو تنیلہ کے ساتھ دیکھ کر۔ اسے اہم ہی لگ گئی
تھی۔ آنکھوں میں غصہ سے چنگاریاں سی سگنے لگیں تھیں۔ وہ اپنی کار سہیل کی کار کے
چوچہ ٹھہرا چکی تھی۔ اور دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جہاں سہیل اور تنیلہ اندر جا کر
غائب ہو گئے تھے۔

اس کے دل میں نفرت اور کدورت سر ابلار رہے تھے۔ آنکھیں مستکلم تھیں
چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ذہن کے پردے پر سوچوں کے ہیولے تیزی سے منکس ہو رہے

دہشت، بالکل مٹ گئی تھی اور اس کی جگہ نفرت جوش اور حقارت نے لی تھی۔ تمثیل
اسے بہت ہی نیچ دکھائی دے رہی تھی اور اسے کہنے لوگوں سے سخت نفرت تھی۔ اب
اسے اپنی بنائی کاڈ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ جھپک اور خوف مٹ گیا تھا جو اسے تمثیل کے
آنے سے ہوا تھا۔ اس بلوں سے اس کے دل میں تنفر کھلا دیا اور بھرنے لگا تھا۔

نظروں سے نظریں نکرائیں، شیطانی بھر کے۔ اور بھیلیاں کو ندیں۔
”تم میری تیار داری کے لیے آئی ہو۔“ وہ حقارت سے بولی۔ ”یا خاموشی کی دکان
بچاؤ۔“

”تم سے زیادہ!۔۔۔“ اس کے لیے میں جوش بھری حقارت تھی۔ کون۔
ناحشہ ہوگی۔ معلوم ہو گیا تم عورت نہیں ہو بلکہ عورت کا مذاق ہو۔۔۔“ تمثیل
نے پہلی بار لب کشائی کی تھی۔

”تمثیل!۔۔۔“ وہ غصہ سے چیخی۔ تمہاری یہ جرات ایک معمولی لڑکی مجھ سے
ٹکر لینے چلی ہے۔۔۔“ میری پاکیزہ بیگم اگر تمہیں اس کا مزہ نہ چکھایا تو میرا بھی
نام تمثیل نہیں!۔۔۔“

مضطرب لہر کی طرح جوش سے بکھڑکی ہوئی تمثیل کمرہ سے باہر نکل گئی۔
تمثیل کے کمرے سے جانے کے چند منٹ بعد وہ بھی کچھ بچہ انداز میں دروازے
کی طرف برہمنے لگی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔
”میں چلی جاؤں گی۔۔۔“ وہ نرم لہجے میں بولی۔ ”تم کیا کرو گے جا کر میرے
ساتھ۔۔۔“

”تمہیں پہنچاؤں گا۔“ وہ پیار سے بولا۔ ”کہیں وہ کہیں تمہیں رک پہنچائے گی۔
کوشش نہ کرو۔“

”وہ کیا بگاڑ سکتی ہے میرا۔“ اس کے لیے میں اعتماد یقین اور بھروسہ تھا۔ تم میرے

ساتھ ملتا ایسی کتنی ہی سرسری لڑکیاں دام مل کر بھی میرا کچھ نہیں لگا سکتیں۔
 میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس کے لیے میں گہرا پیار تھا۔

اور ہمیشہ ساتھ رہوں گا۔

سہیل کے یقین بھرے لیے سے اس کے چہرے پر اطمینان بھری لہریاں بھر گئیں
 اور مطمئن انداز میں اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔

میں اب یہاں نہ ٹھہروں گی وہ سیرھیوں سے نیچے اتر کر لمبی۔ ابھی واپس
 لاہور چلی جاؤں گی۔ "وہ قدم اٹھاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ رہے
 تھے۔

شبیلہ منسل انداز میں چلتی ہوئی ڈرائنگ روم کے پاس سے گزری۔ تصور
 یہ تھا کہ اس کا منتظر تھا وہ اپنی می کو بھی سہل دے کر ڈرائنگ روم میں لے آیا تھا۔
 انچہ انہوں نے کمزوری کی بنا پر اسے انکار کیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ آج سب
 وہ گریچ کریں۔

تصور نظر میں پھرے اور تھکی تھکی سی چال سے گزرتی ہوئی شبیلہ کو تعجب اور پریشانی
 سے دیکھا۔

”شبیلہ بہن! —“ اس نے بڑے خلوص سے پکارا۔ خلوص بھری آواز سے
 اس کے قدم رک گئے۔ اور اس نے نظریں گھسا کر ادھر دیکھا۔ اور وہیں کھڑی رہی۔ اس کے
 چہرے پر جذبات نے بھر کی اداسیاں بھری ہوئی تھیں۔

”وہاں کھڑی ہو۔۔۔۔۔۔“ وہ نرم لہجے میں بولا۔ اندر آؤ نا ایچ نہیں کو گی؟
 ہم بہت جا رہی انتظار کر رہے تھے۔ شبیلہ سمجھا آتی ہی ہو گی۔“

شبیلہ کا نام سن کر اس کے قدم وہیں رک گئے۔ اسے اس کے نام سے شدید نفرت

شب بیدار کیا۔ اچھے اچھے کپڑے میں تیر خوبست ہو گیا ہو۔ اس نے تمثیل کو نفرت سے دیکھا۔

شبیلہ تو سہیل کی ہی ہوا مانے گی مگر تم کسی کی نہ ہو سکو گی۔ کیونکہ تم نے لائے ہی ایسے غلط اپنائے ہیں کہ صبح منزل کا نشان ہی نہیں مل سکتا۔ شور مچا دو اور سخت ہو گیا۔
 • بھائی جان! آپ کو مجھ سے عرصہ شکایت رہی ہے۔ کہیں کبھی مجھ پر رگڑ لگاتے ہیں۔
 کہیں آپ کی بہن نہیں دھمتی ہوں، وہ فافیش کیا کرنے لگی ہوں۔ زندگی ہی اجیرن ہو گئی ہے۔
 لوگ مادرین جوتے جا رہے ہیں اور ہمارا گھر پانی ڈگر کا بھیج کر انہیں چھوڑ سکا۔ اگر می بھی
 اس گھر میں میری ہم خیال نہ ہوتی تو مجھے اتنی آنا دی بھی نصیب نہ ہوتی۔ اس نے شکیلہ بیگم
 کی طرف سمدھوی طلب لگا ہوں سے دیکھا گلن کہہ رہے پر سردی لہر دیکھ کر اس کا دل کا پ
 گیا۔ چہرے پر تاریکیاں پھیل گئیں۔ دوسرے لمحے تاریکیوں میں باغیانہ تاثرات پیدا ہوئے اور
 ان تاریکیوں کو جوش کی چمک نے نکل لیا۔

”آپ کو بھی مجھ سے کوئی شکایت ہو گئی ہے مئی! —“ وہ اپنے بچے کو تاسف سے
 پر کر کے بولی۔ ”آپ خاموش ہیں میری کسی بات کی آپ نے تائید نہیں کی۔ آپ ہی نے
 تو مجھے ان راتوں پر چلایا ہے۔ بوتلوں اور کلبوں کی فضا سے آشنا کیا ہے۔ رقص کئے
 نئے ناویے آپ ہی سے تو میں نے سیکھے ہیں۔“

وہ خاموشی سے شکیلہ بیگم کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بھی چہرہ چاہپ بیٹھی تھی دیکھ رہی
 تھیں۔ بول لگتا تھا۔ جیسے ان کے چہرے پر بیزار کن تاثرات پھیلنے لگے ہوں۔

”بے شک! —“ وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ”میں مغربی تہذیب کے گناہوں سے
 ماحول میں رچ بس گئی تھی۔ اور نہیں بھی پوری آواز ہی دے دی تھی نہیں کلاچوں اور بوتلوں
 میں سانس لے کر جاتی تھی۔ مرد دوستوں سے ملاقات پر نہیں پورا لچھا اختیار تھا۔ مسٹر
 سوچی ہوں میرے جو کچھ کیا تھا غلط کیا تھا۔ تنہا ہی اس بڑے راہ رو کی مٹی میں دھندلے ہوئے

ہوں۔ اس وقت تارسی ہوں کہ میرے اتنے غلط قدم کہیں اٹھائے۔ میں یہ ریگانی فضا سامنے نہیں آسکتی۔ جہاں معاشرہ مغربی تہذیب کی فضا کو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ مشرق اور مغرب کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ مجھے کیا سلوم تھا کہ تم آزادی کا غلط مطلب لگا لو گی۔ تمہاری غیرت اور شرم و حیا بالکل مٹ جائے گی۔ تم اتنی بے حیا اور بے غیرت ہو گئی ہو کہ اپنے بٹے بھائی سے بھی بدکلامی پر انزائی ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔ جب یہیں شیلہ کو پسند کرتا ہے تو تم سے کہیں پسند کرتی ہو۔

تشیلہ نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں چہرہ اٹھایا۔ اس کے چہرے پر تلخیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

”مہی! — آپ مجھے چاہے کتنا ہی برا سمجھا کہیں“ وہ زہرا لودیلو میں بولی۔
 ”مگر میں شیلہ کو اس گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔“
 شیلہ ایک اضطراب انگیز لچک کھا کر اٹھی۔

”میں خود بھی تمہاری موجودگی میں اب یہاں رہنا نہیں چاہتی — اس نے گہرے تنفر سے کہا۔

”کیا ایک رہی ہے بہ قہر لڑکی۔“ تشیلہ نے تشیلہ کو پیچھے کے لیے انداز میں ڈانٹا۔ ”مہا لڑکی سے اس طرح کا سلوک کیا جاتا ہے۔“

”مہی! — وہ کبھی قسم کی پرواہ کے بغیر طنز، انداز میں تلخی سے بولی۔
 ”میں ہمارے مہا لڑکی کے ساتھ ایسا ہی سلوک تو نا چاہیے۔ تشیلہ کے یہاں سے جانے کے بعد مجھے راحت ملے گی۔

”تشیلہ کے قدم دروازے کی طرف اٹھنے لگے۔ یہ دیکھ کر تسوہ اس کی طرف لپکا۔
 ”ایسا بازو سے پکڑ لیا۔

”مجھ پر دیکھیے۔“ وہ مضطرب انداز میں خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے

بولی: "میں نادم ہو کر یہاں نہیں رہ سکتی۔
 "شکیلہ بن عیسیٰ یہاں نہیں بنے تھیلہ۔ اس کا لہجہ تلخ اور غصیلہ تھا۔ اُسے یہ سننے
 ممتی کے مشورے سے بلایا تھا۔"

"اور ممتی کے مشورے ہی سے اس کی چھوٹی بہن نجی سے شادی کرنے پر تے ہوئے ہو۔"
 اسے جیسے طنز کے سوا کچھ سمجھ ہی نہیں رہا تھا وہ دلہانی سی جونی جابری سخی محبت کی
 ناکامی نے اسے بدحواس سا کر دیا تھا۔

"ہاں! ———" شکیلہ بگم بگمیر آواز میں فیصلہ کن انداز سے بولیں: "یہ شادی
 میرا مرضی سے ہوگی اور بہت جلد ہوگی۔"

"اسی لیے بھائی جان ———" وہ تلخی سے بولی: "اپنی خوشنویں اور کامرانوں
 کے لیے مجھے ہمیشہ کے لیے اندھے راستوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دینا چاہتے ہو۔"

"تم خدا اندھروں میں بھٹکنے لگو تو اس کا کیا علاج ہے۔ سہیل کے علاوہ تم بھلا کیا
 میں تمہاری شادی کا بندوبست کر سکتا ہوں۔"

"سہیل کے سوا اب میری زندگی کا کوئی شریک نہیں بن سکتا۔" وہ جوش

سے بولی: "میں سہیل کی آخری دم تک خواہش کروں گی۔ یہ میری سند ہے۔۔۔ پائل
 تنہا ہے۔۔۔ دلہانی آئندہ ہے۔۔۔ اور دلہانی امیدوں کو کامران کرنے کے
 لیے خود بھی دلوانہ بننا پڑے۔"

مغرب کی پوری بے حیائی اور بادرگی اس کے لبوں پر برقعات تھی۔

"تم سچ چچ بولنا ہی ہو گئی ہو۔۔۔" شکیلہ بگم بگم کی طرح دیکھ کر بولیں۔

"اس خیال خام کو دل سے نکال دو اور اپنے بڑے بھائی کا کہا مان لو۔ اپنے دوستوں

میں سے کسی ایک کا اپنی زندگی کا ہمسفر بن لو۔ سہیل کوئی اعتراض نہ ہوگا۔۔۔"

میں سہیل کے سوا کسی اور کو پسند نہیں کرتی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" وہ اٹھتی

ہوئے بولی زبان میرا کوئی دوست یہاں نہیں آئے گا۔ کسی قسم کا رقص نہ ہو گا۔ میں سب
کو چھوڑ دوں گی اور سہیل کو اپنا لے سکے لیے زندگی کی بازی لگا دوں گی۔
"اند میں تپیں سہیل سے دد رکھنے کے لیے زندگی کی بازی لگا دوں گا۔" نقور نے
مٹے گھورتے ہوئے کہا۔

کون جیلے یہ بازی کون ہا لے گا۔ پھر وہ نقور کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھو
کر تنخی سے مسکائی "میں کیا آپ؟"

ان لفظوں کے ساتھ وہ پجری ہوئی لہر کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔ خشک لہجے میں
اسے سرد نظروں سے دیکھا۔

نقور مہجرت نیا کھڑا رہا۔

اور خبیثہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

ارشاد بڑے خوشگوار موڈ میں انتشار لاج کے گیٹ میں داخل ہوا۔۔۔ اور
 اہستہ غلامی کے ساتھ چین پارک کے اندر آگیا۔ دو گلیروں اور ایک لاؤنچ سے گزرنے
 کے بعد اس نے ڈرائیگ روم کا رخ کیا۔ گھر میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگوں بھی شاید بچوں
 پیچھے خوش گیتوں میں مصروف تھے۔ صرف باورچی خانے سے برتنوں کے ایک دوسرے
 سے ٹکرنے کی آواز کبھی کبھی آجاتی تھی۔ اور پھر ایک گہرا سکوت گھر کی فضا پر مسلط ہو جاتا۔
 ”سب لوگ کہاں چلے گئے؟“ جیسے وہ خود سے بولا۔ اور سب بکے دیکھ ڈالے۔
 کوئی بھی نہ ملا۔ سب سے پہلے اس نے ڈرائیگ روم میں دیکھا تھا۔ جب اسے وہاں کوئی
 نہ ملا تھا۔ تب اس نے دوسرے کمرے کا رخ کیا تھا۔۔۔ اور اب صرف ایک
 ہی کمرہ گیا تھا۔ جس کی طرف اس نے ابھی تک جانے کی جرات نہ کی تھی۔ وہ تھا
 اہم کمرہ۔ آخر کار تب اس نے اسے ادھر آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ دروازے پر پہنچ کر
 متدلیہ کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ اور کچھ دیر سوچا رہا۔ پھر اس نے دیکھ انداز میں دروازے
 پر دستک دی۔

”کون؟“ — ”کوہ میں سے آدم کی شیریں آواز آئی۔“

”ہی! — ” وہ نرم لہجہ میں بولا۔ ” ارشد ہوں۔“

”آجیے! — ” شریعہ سے بچے میں اندر سے کہا گیا۔

اس نے دھڑکے دل کے ساتھ دروازہ کھولا اور دھبے دھبے قدم رکھتا اندر چلا گیا۔ ارم اسے دیکھ کر لہجے کے انداز میں اس کے خیز قدم کے لیے صوفے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سیا کی چمک تھی۔ دل کی دھڑکنیں سرگوشیاں بن کر رونے کو گمار ہی تھیں۔ اُسے حیاتِ بخش گری کا احساس ہو رہا تھا۔ ارشد کو دیکھ کر اس کی یہی حالت ابوجا یا کرتی تھی۔

ارم سر جھکانے کا لین کو دیکھ رہی تھی۔ اور وہ اس کے چہرے پر پھیلتی ہوئی شام کے صحنہ کی گہری کڑواہٹ کو لڑا رہا تھا۔ اس کے بال سرخ ربن سے بندھے ہوئے تھے۔ ”آسانی جیسی پر آسانی ہی رنگ کارِ شمشاد چہ پڑا تھا۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ ایک خوشگوار سا احساس واضعاً محسوس ہو رہا تھا۔

گھر کے باقی لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔ ” ارشد جھینپ سانس کی غرض سے ملائم آواز میں بولا۔

”بھائی جان سہیل راولپنڈی کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ وہ آج سگی سے شریعہ لہجے میں بولی۔

”انکل، راجیل اور شاہدہ کہاں ہیں؟“

”شاہدہ بھائی جان راجیل کے ساتھ ٹافیاں لینے گئی ہے۔“ وہ مڑپتی

ناز لہجے میں بولی۔ اور ڈولی اپنے کسی دوست سے ملاقات کو اب۔“

”اچھا اب میں چلوں گا۔ میں تو سہیل بھائی کو لیے آیا تھا۔ وہ اپنے آپ پر قابو

پاتے ہوئے بولا۔

ارشاد جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ تکلف اور احتیاط کی اس دیوار کو گناہ نہیں چاہتا تھا۔ جواب تک نام نہ تھی۔ وہ ایک با اصول و نوجوان تھا۔ اور حدود پر محتاط۔ پھر وہ اقتدار کی اصطلاح سے بھی واقف تھا۔ جن کے نزدیک دولت ہی۔ وقعت و اہمیت رکھتی تھی۔ اور اس کے سامنے ہر چیز پیچھے تھی۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو ان کے معیار کے مطابق دولت مند بنائے اور پھر دل میں پچھے اور دبے ہوئے ان عزیزوں کو لوٹاں پر لائے۔ جو ارم نے خاموش نگاہوں سے بار بار اس کے دل میں۔

یہ یاد کیے تھے۔
 ٹھہریجے! — ارم انتہائی پیار سے بولی۔ "میں آپ کو چاہتی پیے بغیر نہ
 جیائے ہوں گی۔ اگر اتنی ہی جلدی جانا تھا تو آئے کیوں تھے؟"

اس کے قدم میں رک گئیے۔ وہ مڑا اور اسے غصے سے دیکھنے لگا۔ اس کے بچنے
 اُسے رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے صلوات سے روگردانی کر کے دل کے تعاضدوں کو قبول
 کر لیا۔ — ارم کے جبکہ ہونے حسین چہرے پر یاسیت سی پھیلی ہوئی تھی۔ — اس —
 احساس کے ساتھ اس کے بوٹوں پر ایک شگفتہ تبسم لہرائے لگا۔ وہ اس کے چہرے پر —
 مالیوسی ویکو کسب طوفان سے بے نیاز ہو گیا تھا۔

"آپ چند منٹ کی بات کرتی ہیں۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ "میں تو چاہتا
 ہوں یہاں تمام زندگی بیٹھا ہوں۔"

"تو پھر آپ بھاگتے کیوں رہتے ہیں۔" اس نے نظریں اٹھا کر شرمیلے
 انداز میں کہا۔

"بھاگتا تو نہیں۔ مجبوراً بھاگنا پڑتا ہے۔"

"کیا مجبوری ہے آپ کو؟"

"جیسے تم کچھ نہیں مانتیں؟"

اللہ — اسیج جانے کچھ نہیں جانتی ؟
 "تمہارے ڈیڑھی — میرے یہاں آنے سے ناخوش رہتے ہیں ۔"
 "لو آپ ان فاصلوں کے پھیلاؤ کو پسند نہیں کرتے ، وہ جرات کے اس
 کے چہرہ پر استغناء میں نظر میں دور آکر بولے
 "نہیں ۔" دل میں پھیلنے والے نشے نے اسے دل کی بات کہنے پر مجبور کر دیا ۔
 "پسند نہیں کرتا ، مگر میرے پسند کرنے سے کیا ہوتا ہے ، وہ ایک گہرا سانس
 لے کر اندر دگی سے بولا ۔
 وہ چونکی اور اسے گہری گہری نظروں سے دیکھنے لگی ، جن کے بیچ عزم جھلک رہا
 تھا —

کیوں نہیں روک سکتے — ارہوے پختہ ہوں تو طویل سے طویل فاصلے میں
 جاتے ہی منتر میں قریب آجاتی ہیں ؟
 ہوگی — لیکن ان منزلوں کا ہم سفر ساتھ نبھانے کا وعدہ کرے تب ،
 ہی تو ۔ ۔ ۔
 "جسہ فرنے انکار کیا ؟ شرم و حجاب کی ایک گہری لہر ارم کے چہرے پر سرخی
 بن کر چھا گئی ۔

"ماشاء اللہ ! ان باتوں میں آگے بڑھا ، جیسے کوئی مقناطیس کشش اسے آگے
 گھسیٹے ، یہی تھی ماس نے بے قرار ہو کر ارم کے گداز ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے
 لیا ، انداس کی آنکھوں میں جھلکار وہ پیار کی اس شدت کی تاب نہ لاسکی ، اور نظریں ۔
 جھمکا دیں ۔

ارم : ۔ ۔ ۔

ارم : — وہ پیار سے بولا ۔

”ہوں! —“ اس نے چہرہ اٹھایا اور جذبات بھرے بہم سے انداز میں کہا —

”کہیں میری غربت ایک دوسرے سے نہیں دھندل کر دے؟“ اس نے اپنے محبت بھرے لہجے میں ہلکی سی تشویش بھر کر کہا۔

”غربت تو کیا —“ وہ عزم سے بولی — ”ہیں تو موت بھی ایک دھڑک سے دھند نہیں کر سکتی؟“

”اوہ! —“ وہ مسکرایا ”تو یہ فیصلے ہیں دل کے —“

”اب تو یہی فیصلے ہیں —“ وہ سمجھا ایک لطیف مسکراہٹ اپنے لبوں پر پھیلا کر بولی۔

”اب تو سب بے چینیاں مٹ گئیں۔“

وہ لمبائی لمبائی نظریں جھکا کر کھڑکی کے کنارے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی وہ مسکراتے ہوئے۔

”اے اللہ! —“ وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی
”میں تو بھول ہی گئی۔“

کیا بھول گئیں؟

”تو کمرے چائے کو تو لہا ہی نہیں۔“

وہ ایک لمحے کے لیے رُکی اور پھر دروازے سے باہر نکل گئی۔ تو کو کو چائے کہہ کر کچھ دیر بعد وہ پھر کمرے میں آ گئی۔

”یوں لگا تھا —“ وہ اس کے چہرے پر نگاہیں مرقم کر کے بولا جیسے تم برسوں کے لیے بچھڑ گئی ہو۔“

”اور جب یہاں سے اپنے گھر میں جاؤ گے۔ وہ اس کی نگاہوں کا مقابلہ کر کے بولی۔“

”تو سیر کیا محسوس ہوگا؟“

”یوں لگے گا جیسے میں اپنا دل تنہا رہ کرے میں چھوڑ آیا ہوں۔“

”کیا دلوں کا تبادلہ بھی نہیں ہوتا؟“

”اگر یہ تبادلہ تنہائی میں کسی کو قرار دے سکتا ہے تو مجھے بھی قرار آجائے گا۔“ اس نے

ارم کو غور سے دیکھا

”تنہائی میں تو بے چہریاں اور بڑھ چاتی ہیں۔“ وہ مضطرب لہجے میں بولی۔

”تو سیر مجھ کیسے قرار آجائے گا؟“

”قدوں کے تبادلے اضطراب اور زیادہ سمیٹ لاتے ہیں؟“

”ہاں!۔۔۔“ وہ گہری آواز میں بولی۔ ”اضطراب سمیٹ لاتے ہیں۔ مگر انہیں

جو سرور اور لذت ہوتی ہے۔ وہ دلوں کے تبادلے کے بغیر کہاں حاصل ہوتی ہے؟“

”وہ دانسے پر ہلکی سی دستک ہوتی۔“

”اگر چاہے لایا تھا۔“

”آجیاد!۔۔۔“ ارم نے آواز دی۔ وہ اندر اٹھیا اور چائے کے قیمتی ظروف میز پر

رکھ کر چلا گیا۔ جیلا میز کے ایک طرف تازہ خوشنما پھولوں کا گلدستہ ملائی گلدان میں سجا ہوا

وگنٹ منظر پیش کر رہا تھا۔ وہ میز کے کنارے رکھا تھا۔

ارم نے چائے بنائی۔ ایک کپ اس کے آگے اور ایک اپنے آگے رکھ لیا۔

”نہوں نے میٹھے میٹھے ترچہ چلنے لگے۔“

”سمت کی کہانیاں دہرائی جاتے لگیں۔“

”ظہان ہی ظہانوں میں پیار بھرا منظر کھیلنے لگے۔ اور چائے ختم ہو گئی۔“

”ابھی تیرے ہی پرچہ کا انتخاب محمد کی گاڑی کی پورٹیکو میں آکر رکھی اور کس وقت ان

کے قریب وہ خود پہنچ کر نہکے۔“

افتخار احمد کھلے دروازے کے ساتھ کھڑے انہیں چائے پیتے ہوئے یہی بہی سرت سے چمکتی ہوئی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے۔ سیخ پا ہو گئے۔ وہ پہلی ہی ارشد سے کچھ خوش نہ تھے تنہائی میں اہم کے ساتھ چائے پیتے دیکھ کر ان کا غصہ بھر مٹ گیا تھا اور وہ جوش میں بھرے ہوئے اندر آ گئے۔

خالی پکیا لیاں میز پر رکھ کر انہوں نے قدموں کی آہٹ سے اُدھر دیکھا۔ ان کی زبان ہی تو نکل گئی۔ رنگ اڑ گئے۔ دل کی دھڑکنوں میں شدید خوف سے اضافہ ہو گیا۔ دونوں کے تباہ دھڑکے وہ گئے محبت کی کہانیاں سو گئیں۔ پیار کے افسانے افسانے بن گئے۔ وہ لڑتے، پکپکاتے غیر ارادی طور پر کھڑے ہو گئے تھے۔

”ڈیڈی! —“

”انکل! —“

وہ تنہائی میں سراسیمہ ہی گئے تھے۔ افتخار احمد کی آنکھوں سے غصہ کی چنگاریاں بھڑپ رہی تھیں۔ اور وہ سخت جوش بھرے اضطراب میں مبتلا تھے۔ غیظ و غضب سے ان کا جسم لرز رہا تھا۔ انہوں نے ارشد کو قہر آلود نگاہوں سے گھنٹا — تو ہتھارے حوصلے یہاں تک بڑھ گئے ہیں۔ ”ان کے لہجے میں تلخی اور حقارت، جوش اور انتہائی غصہ تھا۔“

”ہر روز یو نہیں چلے آتے ہو۔“ ان کا لہجہ بلند اور جوشیلا تھا۔ تم ایک تلاش آدمی ہو۔ اپنے مقام کو بچاؤ۔ اتنا اونچا اڑو۔ جتنی پروان کی طاقت رکھتے ہو۔ میں نے اپنی طاقت سے زیادہ اونچے اڑنے والوں کو زمین پر بے بسی کی حالت میں گرتے دیکھا ہے۔“

”ڈیڈی! — اہم نے مداخلت کرنے کی کوشش کی۔“

”تم خاموش رہو۔“ بے وقت اور متعلق نہ تھی۔ جنہیں اچھا زمانہ نہ۔

نشیب و خراز کا علم نہیں ہے۔ تم تو تالاب کی اس پھلی کی طرح ہو جو تالاب کو سمندر سمجھتی

ہے۔ اگر میں نے آئندہ تمہیں اس تلاش لڑکے کے ساتھ بات کرتے دیکھ لیا تو خوش ہو کر
 دوں گا۔ پھر انہوں نے جوش سے بل کھا کر ارشد کو غضب ناک نظروں سے دیکھا اور کہا۔
 اور تم دو ٹکے کے انسان آئندہ اگر کبھی یہاں آئے تو ذلیل کر کے لوگوں سے دیکھ کر دلوں کا باہر
 نکلوا دوں گا۔ تم نے سمجھ کیا رکھا ہے۔“

ارشد نے بے بس اور غمناک نظروں سے انہیں دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔
 ارم حسرتناک نظروں سے اسے جلتے ہوئے دیکھتی رہ گئی۔

تصویر

ہونٹوں پر ایک شکستہ مسکراہٹ ٹپکے شیبیلے کے کمرے میں داخل ہوا، مگر اسے کمرے میں اندر ہی اندر جھرا دکھائی دیا۔ اس کی مسکراہٹ تاریکی دیکھ کر مفقود ہو گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سوچ دیا۔ دوسرے لمحے ہی کمرہ برقی روشنی سے جھلکانے لگا، تکیے میں منہ دیئے روتی ہوئی شیبیلے نے دکھ بھری نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”مات کسمی کا، بوجھ کی۔۔۔۔۔“ وہ نرمی سے بولا۔۔۔۔۔ ”پھر بھی کمرہ میں اندر

تھا۔۔۔

مول میں اندر جھرا ہوا لو کو کمرے کی روشنی کیا کہے گی۔“

”تمہارے دل میں تو اندر جھرا نہیں ہو سکتا۔ تمہارا دل تو محبت کی روشنی سے منحرف ہے۔“
”مگر یہاں کے ماحول نے یہ روشنیاں اندر جھرا دی ہیں۔“ شیبیلے کا لہجہ دیکھی

تھا۔

”تم ابھی تک تمہیلے سے دوپہر کی چھڑپ کو دل سے نہیں نکال سکیں۔“ وہ اس کے ہلکے

کے قریب آکر بللا۔

”یہ مجھ پر ایسی نہیں جو اتنی جلدی دل سے نکل جائے۔ دل پر زخم لگے ہیں اور زخم
فدا ہی تو مند دل نہیں ہوتے۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا تم اتنی حساس ہو رہے ہو۔ غمزدہ آوازیں بللا۔ زندگی میں بڑے بڑے
زخم کھائے پڑتے ہیں۔ ناگوار سے ناگوار بات سہنی پڑتی ہے، حساس پر مجھ میں پڑتی نہیں
دل دھکتے ہیں۔ بڑے بڑے ادوار سے گزرنا پڑتا ہے مگر اس کا یہ مقصد نہیں کہ انسان ہمت
ہی ہار بیٹھے۔“

تشبیہ کی آنکھیں شدتِ گریب سے مقوم ہو رہی تھیں۔ غم کو اس کی حالت بڑی قابلِ
رحم دکھائی دی اور اس کے دل میں ہمدردی کے گہرے جذبات موجزن ہو گئے۔
اب تمام غم و غصہ دل سے منادو۔“

”اپنے ناحق مجھے یہاں بلایا۔ وہ رقت آمیز آوازیں بولی۔
”میں نے نہیں یہاں اس لیے بلایا تھا۔ کہ یہاں گھوم پھر جاؤ گی مجھے کیا معلوم تھا
کہ یہاں اس طرح کے ناخوشگوار واقعات رونما ہو جائیں گے۔“
”یہاں تو خوب اسیر پالے ہو گئے ہیں۔“ اس نے پھر بڑے تلخ لہجے
میں طنز کرتے ہوئے کہا۔ مجھے صبح جیلانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ دن میرا دم گھٹا
جائے گا۔“

”اتار خ نہ کرو۔“ اب تمہارے ساتھ تشبیہ کوئی زیادتی نہ کر سکے گی۔
”چھٹے ہی کیا کم ہوا ہے۔“

”اب غصہ تلوک دو۔ میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ میری بات مان لو۔“
”بھائی سمجھ کر ہی یہاں آئی تھی۔“
”تو کیا میں اب تمہارا بھائی نہیں رہا؟“

”ہیں!“

”پھر اپنے بڑے بھائی کی بات کیوں ٹھکرا رہی ہو۔! — اچھا — چلو —
ہاں ذکر کرو۔“

”مجھے جھوک نہیں — ”وہ بوجھل بوجھل آواز میں بولی۔
”اٹھو! — تم نے پنج بھی نہیں کیا تھا — کھانے سے غفلت اچھا
نہیں ہوتی۔“

”میں سچ کہتی ہوں — مجھے جھوک نہیں ہے — ”وہ متین لہجہ میں
بولی۔

”آنسوؤں سے میرا بھر گیا ہے کیا؟ وہ اُسے غور سے دیکھ کر بولا: ”نہیں
میری قسم ہے۔ چلو تھوڑا سا ہی کھالینا۔“

”اب قسم ہی ایسی دی ہے — ”وہ اٹھتے ہوئے بولی: ”چلیے! اور وہ اُسے
ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ کھانے کی میز پر ان دولوں کے علاوہ اور کوئی نہیں
تھا۔ تمثیل نے بیخ بھی نہیں کیا تھا۔ اب ڈیز پر بھی غائب تھا۔ اس کی عدم موجودگی سے
تصور کو دکھ تو ہمارا گلاس نے تمثیل کا ذکر اس لیے نہیں کیا۔ کہ کہیں شبیلہ کے آگے دل کو پھر
ٹھیس پہنچے۔ دولوں نے اپنے اپنے تصورات میں کھوکھوڑا بہت کھانا ڈھیر کر کیا اور تین
سے اٹھ گئے۔

تھوڑی دیر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انہوں نے بڑوں ہی سی باتیں کیں۔ پھر سوسے
کی غصے سے اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ شبیلہ نے اپنے کمرے میں آکر دروازہ بند کر لیا۔
ساتھ کمرہ اکھلی ہوئی تھی۔ آسمان پر جاند پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اور۔
جینن خیز چاندنی پوری کائنات پر ناز کی بدشش کر رہی تھی۔ سکھتے پہاڑ بڑا ہی دلکش
منظر پیش کر رہے تھے۔ چاندنی میں نہائے ہوئے پہاڑوں کو دیکھ کر کیف کا احساس جاگتا تھا۔“

شیدہ لادل بھابھا سا تھا۔ پھر بھی اسے پر کیفہ منظر کو دیکھ کر تندے تسکین مزہ دی تھی بھنڈی
 ہوا کمرے میں آ رہی تھی جس سے سردی کا شدید احساس ہوتا تھا۔ کھڑکی جہن میں کھلتی تھی۔
 وہ اسے بند کرنے کے لیے آگے بڑھی جہن میں سرو کے درختوں کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے
 مبہوت سی ہو گئی۔ اسے سوانیکز چاندنی میں سرو کے درخت یوں لگ رہے تھے جیسے کتنی
 ہی مبہوشیں سنجیدہ انداز میں کھڑی رنگ برنگے پھولوں کی طراوت دیکھ رہی ہوں اس کے
 ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکل گئی۔

اس نے جلدی سے کھڑکی کے پٹا بند کر دیے شتر لگانے کے لیے ہاتھ اوجھالیا
 مگر شتر کے پیچ ڈھیلے تھے۔ وہ اپنے مقام پر فٹانہ ہو رہا تھا۔ اس نے اسے لٹکانے کی بڑی
 کوشش کی مگر ناکام رہی۔ پھر وہ تنک ہار کر اپنے بنگ پر گر گئی۔ ذم ریڈ کا پکیلا بیڈ اس
 کے نرم نرم جسم کے لمس سے کھسایا اور پھر بڑی سرعت سے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ لیک ایک
 لمبے خیال آیا۔ صبح جب اس نے کھڑکی کھولی تھی تو شتر درست حالت میں تھا۔ چہرہ
 اچانک خراب کیسے ہو گیا تھا کسی نے کوئی شرارت تو نہیں کی یا کوئی خطرناک منصوبہ تو نہیں
 بنایا گیا۔ اس کے دل میں وہشتنا ابھرنے لگی۔ کہیں تشنیلہ نے تو کوئی شرارت نہیں کی تھی
 جیسی کم ظرف لڑکی سے کوئی بھی بات برائی کی بعید از قیاس نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں
 سے نیند اٹھات ہو گئی۔ وہ کوشش کے باوجود صحت کی۔ وہ بزدل نہ تھی مگر پھر بھی معلوم
 سا ڈر اور انجانے غمشتے اس کے ذہن کو اپنے پیچے میں جکڑنے لگے۔ اور اس کے خیالات
 کی رد و تشنیلہ کی طراوت مر گئی تھی۔

وہ جا بھتی تو تھوڑا گوسب کچھتا سکتی تھی۔ مگر وہ بزدلی کا لمحہ سنت کے لیے تیار نہ
 تھی۔ وہ تشنیلہ پر ظاہر کر دینا چاہتی تھی کہ وہ اپنے سینے میں دلیر دل رکھتی ہے۔ اتنی بہت
 کے باوجود بھی غمشتے اس کے ذہن سے الگ نہ ہو رہے تھے۔
 وہ مہتر پر پڑی ہے چین کر وٹیں بدل رہی تھی۔ مگر نیند اس کی آنکھوں سے۔

کو سوں دور تھی رات کے گیارہ بجے اچانک کھڑکی کے پٹے زور سے کھلے اور تین سیلہ
پوش آدمی یکے بعد دیگرے اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ آنکھوں کے علاوہ ان کے
چہرے نقاب میں چھپے ہوئے تھے۔ اور ان کے ہاتھوں میں ہسٹل چمک رہے تھے۔
وہ اس کی طرف تیزی سے نپٹے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور انہیں دیکھ کر زور سے چیخ ماری۔ دوسرے لمحے وہ اس
کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ شبیلہ کے دل کی دھڑکن خوف کی وجہ سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی
اور دل تھر تھر کانپ رہا تھا۔ تمام دلیری دھڑی رہ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری چیخ
مارتی دو نقاب پوش اسے بازوؤں سے جکڑ چکے تھے۔ اور تیسرے نے اسے گلوہ مذم
میں جھٹکا ہوا رومال سٹھایا تھا۔ اس نے ان سے بچنے کی بڑی جلد جہد کی تھی مگر بچ نہ سکی
تھی۔ رومال سونگھنے کے بعد وہ ذرا کسمائی پھر اس کا جسم دھیلیا ہو گیا۔ اور ایک نقاب
پوش اسٹیلے ہوٹل جسم کو اٹھا کر کھڑکی کی سمت چلا اور اوپر چڑھ کر باہر آ گیا۔ باقی دو
بھی اس کے پیچھے ہی کھڑکی کے ذریعہ بچن میں کودے۔

شبیلہ کی چیخ سن کر تصور سلینگ کاؤن میں لمبوس اپنے کمرے سے بھاگا ہوا آیا اور
شبیلہ کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹائے لگا۔

دروازہ کھٹکھٹانے پر حجب اسے کوئی جواب نہ مل سکتا تب وہ دروازے کو دھکی
دینے لگا۔

شبیلہ — ہا وہ پکارا۔ دروازہ کھولو شبیلہ — دروازہ کھولو۔

گھر سے کوئی جواب نہ مل سکا۔ وہ سخت پریشان ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ
کیا کرے۔ اس کی اُمی چونکہ نیند نہ آنے کی وجہ سے خواب آور گولیوں کا استعمال کرتی تھیں
اس لیے وہ غیب سے سیکڑا رہی نہ سکیں۔ انہیں شبیلہ کی چیخ اور تصور کے دروازہ کھٹکھٹانے
سے بھی نہ جاگ سکیں اور وہاں سے لوگوں کے کوارٹر بھی دور تھے۔ وہ بڑا مضطرب

اُدھ اُٹھا اُٹھا ساشش و پنچ کی حالت میں کھڑا تھا کہ اچانک اسے موٹر کے انجن کا شور مٹائی دیا۔ اور دوسرے لمبے وہ چین کی طرف بھاگ رہا تھا۔ نگاہوں کو وہاں پہنچے سے پہلے ہی موٹر سٹارٹ ہو کر گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ موٹر کی طرف بھاگا موٹر تیزی سے گیٹ سے لٹکی لیکن اس نے اتنے میں دیکھ لیا کہ اس میں تین نقاب پوش بیٹھے ہوئے تھے۔ دھمکے اور ایک پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اور وہ قریب ہی سیٹ پر پڑے ہوئے ایک۔
سفاقی جسم کو بھیجی جھکی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

سفاقی جسم کو دیکھ کر اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ تیزی سے واپس پٹا اور اس نے چین کی طرف کھلے والی کھڑکیوں کی طرف دیکھا۔ شبیلہ کے کمرے کی کھڑکی کھلی تھی جس سے چاندنی اس کے کمرے میں پہنچ رہی تھی۔ گہرے خوف سے اس کے جسم میں کپکپاہٹ سی طاری ہو گئی۔ پھر وہ دل میں ابھرنے والے اندیشوں کے تحت کھڑکی سے کود کر اس کے کمرے میں چلا گیا۔

شبیلہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے کمرے میں ابھر اُدھر نظریں دوڑائی مگر اندیشہ کی لہک لہاس کے سوا کیا میں دھڑکنے لگی۔ گہری پریشانی نے اسے پھڑپھڑایا۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ وہ بدحالی کے عالم میں دروازے کا شکر کھول کر باہر گلی میں آ گیا۔ اس کے پیچھے ہوئے قدم تھیلہ کے کمرے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ وہ اس کے کمرے کے قریب پہنچ کر رگ گیا۔ اور زور سے دروازہ دبا دیا۔ دروازہ خراکھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے بدترین اندیشوں کی تصدیق ہو گئی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی مگر تھیلہ اپنے کمرے سے غائب تھی۔ بجلی کی سہ تیزی سے ایک خیال اس کے ذہن میں لپکا۔ تو تھیلہ ہی نے شبیلہ کو غائب کر لیا ہے۔ اس نے اپنی محبت میں ناامی کا انتقام اس کمیٹین سے لیتا ہے۔ یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک عورت ہی عورت کی بربادی کا سبب بنی ہے۔ اسے تھیلہ سے نفرت ہو گئی۔ اچانک اس کی نگاہ فرش پر پڑے ہوئے ایک میلے سے کاغذ پر

پر پڑی۔ اس نے اسے اٹھا کر حاف کیا۔ اور پٹنے لگا۔ لکھا تھا۔ مری روڈ —
بارنھویں میل پر پور۔“

وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں آیا۔ اس نے عجلت میں ٹیلیفون کارسیور اٹھایا اور
عمران ہوٹل کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد عمران ہوٹل سے فون پر اس کا رابطہ قائم ہو چکا تھا۔

”ہیلو! — میں سہیل پول رما ہوں۔“

”میں — — — — —“ نقید پول رما ہوں۔ — — — — —“ نقید کی گھرائی گھرائی آواز سے
رسیور میں ستائی دی۔ ”غضب ہو گیا میرے دوست! شیلہ کو قتلہ نے اغوا کر دیا
ہے۔ تین نقاب پوش اسے گاڑی ڈالے ہوئے مری کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔ اگر سرخ
رنگ کی مزداتما ہمارے ہوٹل کے آگے سے گزرے تو فوراً اس کا تعاقب کرو۔ میں پولیس
کو لے کر ان کے تعاقب میں نکلتا ہوں۔ سمجھ گئے۔ مزید باتوں کا وقت نہیں۔“

”سمجھ گیا — — — — —“ اس نے جلدی سے کہا اور رسیور کو بیڈل پر رکھ دیا۔ پھر
اس نے بڑی عجلت کے ساتھ سامنے کی کھڑکی کھول دی تاکہ سڑک اس کی نظروں کے
سلسلے رہے۔ اس نے بڑی عجلت سے سمٹ پہنا اور نکلتی لگائے بغیر ہی دروازہ
کھول کر سیڑھیاں سمٹا لگیں۔ وہ کھڑکی میں سے سرخ رنگ کی مزداتما چاندنی میں ہوٹل
کے سامنے سے گزرتا دیکھ چکا تھا۔

پورٹیکو میں آیا اور اپنی گاڑی میں میٹھ کر تیزی سے ہوٹل کے مین گیٹ سے نکلا
اٹھائے جانے والی گاڑی کا تعاقب کرنے لگا۔ سڑک پر ایک میل بھاگنے کے بعد اس
نے اپنی گاڑی کی رفتار اسی میں فی گھنٹہ کوئی تھی۔ اس کی گاڑی ہوائی سہیلی سے
فراے سمجھتی ہوئی سمٹا رہی تھی۔

پانچ منٹ کے بعد ہی اسے آگے جانے والی مزاحی سرخ بتیاں دکھائی دیتے لگا۔

میں۔ اور کار بھی چاندنی میں آہستہ آہستہ واضح دکھائی دینے لگی تھی۔ راستے میں سڑک
گاڑی ایک جاگیز لہوں کے بے رکی اور اس میں ایک نعلانی سیاہ داخل ہو گیا۔ گاڑی پھر
تیزی سے بھاگنے لگی۔ اور اس کی اسپید پہلو کی طرح تیز ہو گئی

سڑک مزہ گاڑی نے رک کر نمشید کو لیا تھا۔ وہ اس گاڑی کے انتظار ہی میں ہوا
کھڑی تھی اس نے اپنے چند دوستوں سے مل کر شام کو پروگرام بنایا تھا۔ کہ شبیلہ کو قہقہہ
کر لیا جائے اور اسے کہہ مری میں نے مایا بکے تاکہ وہ اس سے اپنی محبت میں
بالاسی کا انتقام لے سکے۔

تمشید خوش تھی۔ اس نے اپنا دانست میں معرکہ سر کر لیا تھا۔ اور پھلپا سیٹ
پر ایک نقاب پوش لوجران کے ساتھ میٹھی شبیلہ کو قہقہہ لگا رہی تھی۔
پھر ہلکا ایک اس نے قہقہہ لگایا۔

”مجھے مے لگتے ہیں چلی تھی۔۔۔۔۔ اس نے شبیلہ کی طرف حقارت سے دیکھا۔
اب پڑی ہے بے دست دیا ہو کر۔ یہ نہیں جانتی تھی میرا انتقام کتنا خونخوار ہو گا۔“
”گاڑی لوٹے میل کی رفتار سے اڑی چلی جا رہی تھی۔ نقاب پوشوں کو ابھی تک
بچھلی گاڑی کے نقاب کا احساس نہ ہوا تھا۔ وہ بڑے مسرورانہ انداز میں بیٹھتے تھے۔
ایک نقاب پوش نے وحشت آمیز قہقہہ لگایا۔

”آج کی رات کوہ مری میں بڑے آرام سے گزرے گی۔“

”مزہ آجائے گا۔“

تمشید کے برابر بیٹھ ہو کے دوسرے آدمی نے ایک آواز قہقہہ لگایا۔۔۔۔۔ ”دو خیریں

جنت کی مخلوق۔۔۔۔۔“

تمشید کا رنگ نر ہو گیا۔ دیکھ ایک اٹھنا معلوم اندیشوں نے گھیر لیا۔ وہ سوچا

میں بڑھ گئی۔۔۔۔۔

آگے بیٹھ ہوئے دونوں نقاب پوش چہچہ لگا کر ہنسنے لگے۔

آج — آج کیوں نقاب پوش بولا — " قیمت بہت ہی مہربان ہے،
تمنیدہ کامل تیزی نے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے یہ تو سوچا ہی نہ تھا کہ اس کے
ساتھ بھی شبیدہ جیسا ہی سلوک ہو سکتا ہے وہ بھی ایک لڑکی تھی۔ ایک حسین لڑکی، وہ
وہشت سے بلی بڑتی جا رہی تھی۔ اس کا تمام ماتحانہ غرور کامران حلیات آن واحد
میں مٹ گئے تھے۔ اس کے دہی دوست جن پر اسے کال بھر دوسرے تھا اس کی عزت
لوٹنے کا مقصود بنارہے تھے، خواہ وہ کیسی تھی مگر آبرو باختہ نہیں تھی۔ گلیوں اور بڑوں
میں اترا دی سے گھومتی تھی۔ مگر اس نے کبھی کسی دوست کو ان حدود سے نہ مٹے کی۔
احادیث نہیں دی تھی جس سے اس کی عزت پر حرف آتا اور اسے آوارگی جیسے نازیبا
لفظ سے ملوث کیا جاتا۔ وہ خوفزدہ حالت میں سوچوں میں ڈوبی ہوئی اب کوئی ایسی
تجزیر سوچ رہی تھی کہ جس سے وہ ان بد معاشوں سے خود کو بچھڑا سکے۔ مگر اس کے ذہن
میں کوئی ایسی تجزیہ نہیں آرہی تھی۔ گاڑی تیزی سے سیاہ سڑک پر بھاگ رہی تھی اور
سائے چاندنی میں نہلنے ہوئے خلک، لوں پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔

دفعتاً ڈرائیور کے منہ سے نندیشوں سے بھری ہوئی ایک مذہم آواز نکلی
ہمارے پیچھے ایک تیز رفتار گاڑی آرہی ہے۔

تو نقاب شروع ہو چکا ہے۔

بالکل —

وہ سب پریشان ہو گئے۔ اس سے زیادہ رفتار وہ بڑھا نہیں سکتے تھے۔
کیونکہ گاڑی کے اٹنے کا خطرہ تھا۔ اتنی اسپید میں بھی گاڑی ہلکورے کھا رہی تھی۔ اگر قدر
اللہ بڑھادی جاتی تو یقیناً کارا لٹ جاتی۔ ان کی پریشانی میں ہرآن اضافہ ہو رہا تھا،
پچھن گیمبر اسٹ میں دیکھ کر تمنیدہ کو قدرے سکون ہوا تھا۔

وہ گھبرائے گھبرائے اندام میں بار بار پلٹ کر پھیلی سڑک پر دیکھنے لگے تھے۔ موڑوں کی وجہ سے پھیلی گاڑی ابھی تک واضح طور پر سامنے نہیں آئی تھی۔ جب موڑ کم ہو گئے اور سیدھی سڑک آگئی تب تعاقب میں آنے والی کھانسیں صاف دکھائی دینے لگی۔ تفتیلہ نے بھی تعاقب میں آتی ہوئی انتہائی تیز رفتار گاڑی دیکھنی تھی۔

ڈرائیور کے علاوہ دونوں بدمعاستوں نے اپنے پستول نکال کر کھڑکی کے ذریعہ پیچھے فائر کرنے شروع کر دیئے تھے۔ پے درپے من گڑبگ ہوتے۔ مگر تھوچھے سے آنے والی کار بغیر کسی اندیشے کے بڑھتی چلی آرہی تھی۔ ابھی تک بدمعاستوں کے کسی فائر نے اسے نقصان نہ پہنچایا تھا۔ آخر کار وہ بالکل قریب آگئی۔ بدمعاستوں نے اپنی کار کی رفتار اور بڑھادی فاصلہ ذرا بڑھ گیا۔ اور تھوڑی دور لے جا کر کار انہوں نے سڑک کے کنارے کھڑی کر دی اور تینوں اپنے اپنے پستول لے کر گاڑی سے اتر آئے۔

تعاقب میں آنے والی کار بھی تھوڑے فاصلہ پر آ کر رک گئی اور اگلی سیٹ کا۔ دروازہ کھول کر ایک لوجان باہر نکلا۔ تفتیلہ نے دیکھا، کار سے اترنے والا سہیل تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

تاقب پولیسوں نے اندھا دھند سہیل پر فائر کرنے شروع کر دیئے لیکن وہ بڑی جستی سے ہٹا اور کار کی اوٹ میں چو گیا۔

تفتیلہ جو بے ہوش تشبیہ کے ساتھ اگلی گاڑی میں تنہا بیٹھی تھی دفعتاً دروازہ کھول کر باہر نکلی اور سہیل کی گاڑی کی طرف بھاگنے لگی۔

”سہیل! — سہیل! —“ وہ چیخ رہی تھی۔

سہیل نے گاڑی کی اوٹ سے دھاچک کر اس کی طرف تہر آلود نظروں سے دیکھا۔

”میری طرف مت آنا —“ وہ نفرت سے چیخا: ”ذیل لڑکی! یہ سب تمہارا“

کیا دھڑلے۔

بد معاش نے اسے چلاتے دیکھ کر فوراً غائر کر دیا۔ تمثیل اس کے سامنے پہنچ گئی اور سہیل کی طرف اٹنے والی گئی تمثیل کی پشت میں پیوست ہو گئی۔

”سہیل بس۔“ وہ ایک دلدل درجیع کے ساتھ دیں ڈھیر ہو گئی اور سہیل غصہ سے دانت پیسنے لگا، اور فدا نیچے ہو گیا۔ وہ گاڑی کے عقب میں چھپا بد معاشوں سے بچنے کی کوئی تجویز سوچ رہا تھا۔ اور بد معاش اس کی گاڑی کی طرف اندھا دھند غائر ہو گیا کہ بے چاندنی رات میں پستولوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ گاڑی کے شیشے چمکتا چور ہو چکے تھے۔ سہیل کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ تمثیل کی موت نے اسے کچھ ہراساں بھی کر دیا تھا۔ اس کے پاس کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے وہ بد معاشوں کا مقابلہ کر سکتا۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھا۔ اور اسے خالی ہاتھ دیکھ کر بد معاش اس کی کار کی طرف بڑھتے چلا رہے تھے۔

لیک بد معاش لپک کر اس کے پیچھے آ گیا۔ مگر وہ اس سے غافل نہیں تھا۔ اس نے غائر کیا وہ نیچے ٹھیک گیا، اور گاڑی سنسناتی ہوئی اوپر سے گزر گئی اسے ذرا سا وقفہ مل گیا۔ وہ بھلی کی سی تیزی سے بد معاش کی طرف لپکا۔ اور اس کے چہرے پر ایک گھولنے رسید کر دیا۔ بد معاش تیار کر نیچے گیا۔ اور اسے دوسرا غائر کرنے کی جہلت نہ مل سکی پھر اس نے جمپسٹ کر سڑک پر گر کر ہوا پستول اٹھا لیا۔ دوسرے بد معاش بھی اس کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ اس نے ان کی طرف غائر جھنک دیئے۔ بد معاش فوراً ابھاگ کر گاڑی کی دوسری طرف ہو گئے۔ گولیوں کا تبادلہ ہونے لگا۔

دفعتاً کسی گاڑی کی ہیبڈلائٹس کی روشنی سڑک پر پھیلتی ہوئی دکھائی دی۔ جو تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی۔ بد معاش روشنی دیکھ کر فوراً اپنی کار کی طرف بڑھے۔ اور اسے اشارت کرنے لگے۔ سہیل نے ان کی گاڑی کے ٹائروں پر غائر کئے۔ جس سے گاڑی کے دو

مڑ مٹائے ہوئے۔ اندر مٹھڑی سے پھر باہر نکل آئے اور اس کی طرف ناز کرتے ہوئے
بہاروں کی طرف بھاگنے لگے۔

اس آٹناویں سڑک پر پھلتی ہوئی روشنی قریب آگئی تھی۔ سہیل نے گوم کر دیکھا وہ
پولیس کی گاڑی تھی۔ پولیس کی گاڑی اس کے قریب آکر رک گئی۔

وہ تصور کو دیکھ کر اس کی طرف لپکا۔ تصور نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

بد معاش کہاں ہیں؟ تصور نے پریشانی سے پوچھا

”وہ جا رہے ہیں۔“ سہیل نے بھاگتے ہوئے سائیل کی طرف اشارہ کیا۔

پولیس انسپکٹر نے انہیں بھاگتے ہوئے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اور پولیس انسپکٹر کے حکم پر
پرنڈلین نے کرائن کی طرف بھاگ رہی تھی۔ انہوں نے چند منٹوں میں ہی بد معاشوں کو
چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ بد معاش اس لیے آسانی سے قابو میں آگئے کہ ان
کے پستولوں میں گولیاں ختم ہو گئی تھیں۔ پولیس انہیں گھیر کر جیب کی طرف لے آئی اور
انہیں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔

بے ہوش اور بے خبر پڑی ہوئی شبیلہ کو گاڑی سے نکال کر سہیل کی گاڑی میں بھلی
سیٹ پر بٹا دیا۔ اور قتلہ کی لاش کو جیب میں رکھ کر واپس ہو گئے۔ تصور کو اپنی بہن کی
موت کا بہت صدمہ تھا۔ اور اس کا دل بھر بھر آہنا تھا۔ بے اختیار اس کی آنکھوں سے
آنسو بہنے لگے۔ سہیل نے اسے تسلی دی۔ اور اسے اپنی پاس والی سیٹ پر بٹھالیا۔ پھر وہ
پولیس اسٹیشن آگئے۔ ڈاکٹر کو بلا کر شبیلہ کو ہوش میں لایا گیا۔

چند گھنٹوں میں اس کے یانٹا نالتا بلند ہو گئے۔ اور پوسٹ مارٹم کے بعد وہ ستر
روز باہر بچہ لاش ان کے حوالے کر دی گئی۔

جہنمی لاش کو مٹی میں ہی تو کھرام چ گیا۔ لڑکھارو و قتلہ نے لگے۔ شبیلہ سیکم نے
چھٹی چھٹی آنکھوں سے جو ان بیٹی کی لاش کو دیکھا۔ انہیں گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ یکایک

ان کے سبب ہے۔

• تو ہمیں ہمارے گناہوں کی سزا مل ہی گئی۔ ان لفظوں کے ساتھ ہی ان کا
ہارٹ فیمل ہو گیا۔ اور ان کا جسم بے حلق ہو کر فرش پر گر پڑا۔ سب گھبرا گئے۔ انہیں
اٹھا کر پتنگ پر لٹا دیا گیا۔ مگر روح ان کے جسدِ خاکی سے پروا کر چکی تھی۔

طوفان آیا اور گزر گیا!

شبیلہ اور سہیل لاہور پہنچ چکے تھے۔

راولپنڈی کا حادثہ کافی دنوں بحث، صدمے اور چیمگیوں کا سبب بن کر ماضی

کی آستھان گہرائیوں میں دفن ہو گیا تھا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ دنوں سے ہفتے، ہفتوں سے مہینے، اور مہینے سال کا

رعبہ دھار گئے تھے۔

شبیلہ اور سہیل کی محبت وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی چلی جا رہی تھی۔

وہ ایک دوسرے کے بہت ہی قریب ہو گئے تھے جیسے دو رو میں ایک قالب —

محبت اپنی نقطہ اسروج پر پہنچ گئی تھی۔ ان کی ملاقاتیں ہوتی ہی رہتی تھیں۔ کبھی —

پارکوں میں کبھی دریا کے کنارے اور کبھی کچھ کادوس میں لیکن اس قربت کے باوجود انھوں نے

اشارے کنائے سے بھی گھر والوں سے اپنی پسند کے بارے میں کوئی اظہار نہیں کیا تھا۔

شبیلہ پر تو فطری حیا غالب تھی۔ اور سہیل کا رویہ عینوں کی وجہ سے اپنی پسند

کے بارے میں اپنے ڈیڈی سے کوئی ذکر نہ کیا تھا۔ ان کا کاروبار بہت ہی محذوش دودے گند رہا تھا۔ قریب قریب بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ جب سے افتخار احمد نے کاروبار کا نظام اپنے ہاتھ میں لیا تھا خرم خسارے میں جاسی تھی۔

سہیل اور راحیل پریشان رہنے لگے تھے۔ انھیں کاروبار کی بہتری کے علاوہ کچھ اور سوچنا ہی نہ تھا۔ کبھی کبھی اندیروں سے نکل کر شبیلہ کی یاد کی چنگاری راحیل کے دل میں لگ جی رہا جاتی تھی اور یہی —

نصرت نے لاہور ہی میں ایک کونٹری لے کر سکونت اختیار کر لی تھی۔ غجی سے اس کی باقاعدہ منگنی ہو چکی تھی۔ راولپنڈی کا کاروبار اس نے ملازموں کے پیرو کر دیا تھا۔ اور لاہور میں ایک اور فیکٹری لگائی تھی۔ لاہور میں بھی اس کا کاروبار خوب چمک اٹھا تھا۔

ارشاد فاضل اور اس کی امی نے افتخار احمد کے گھر بالکل آنا مانا چھوڑ دیا تھا۔ ناخوہ جب کبھی گھر سے گزرتے تو شکستہ تھی تو شبیلہ اور سہیل اسے ہونٹوں یا پارکوں میں محبت بھرے قبچھہ لگاتے ہوئے دکھائی دے جاتے تھے جس سے اس کے دل پر چوٹ پڑتی تھی اور وہ سرد آہیں بھرتی ہوئی گھبرا جاتی تھی۔ وہ شبیلہ سے محبت کرتا تھا۔ اور وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ کتنے خطرناک مقام پر کھڑی تھی۔ جہاں سے اس کا لڑکھک جانا لیتا تھا۔ ایک رات ڈنر کے بعد افتخار احمد نے اپنے دوڑوں بیٹوں کو اپنے کمرے میں بلایا۔

اتنے کے نو بج گئے تھے۔ گھر میں سکوت سا پھیلا ہوا تھا۔

جس وقت سہیل اور راحیل ان کے کمرے میں داخل ہوئے — وہ میزقاری کے عالم میں اپنے کمرے میں بیٹھ رہے تھے۔ ان کے تلامذوں کی آہٹ سے انہوں نے چونک کر اُدھر دیکھا۔

اُدھر میرے بچہ —

وہ خاموشی سے ان کے ساتھ صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے درمیان سکوت پھیلا رہا۔

ڈیڈی — راحیل کائنات سے بولا: کیا بات ہے آپ بڑے بے چین۔
 دکھائی دے رہے ہیں۔ بول گئی ہے جیسے کاروبار کی برباد کانے آپ کو مضطرب کر رکھا
 ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر کاروبار کو جو کی گئی ہے۔ آپ کو شاید کاروبار کی فکر ہے۔
 نہیں رہی ہے۔

وہ خاموش رہے۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ کبھی کبھی نظروں سے راحیل
 اور سہیل کو دیکھتے رہے۔

”میرا دماغ مفلوج ہو گیا ہے۔ وہ جیسے دل میں بڑے ہوئے اضطراب سے متحرج
 پڑے۔“ میری تمام کاروباری صلاحیتیں مر گئی ہیں۔ میں تمہارا باپ نہیں تمہارا محرم کلمہ۔
 یہ الفاظ آپس میں تھے جو عین ان کے سروں پر پڑے تھے۔ حیرت اور شدید پریشانی
 ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ سر اسیر سے ہو گئے تھے اور بیہوش ہو کر اپنے ڈیڈی
 کو دیکھنے لگے تھے۔ انہیں اپنے باپ کے دماغی توازن پر شک گزرا تھا۔

ڈیڈی کا: — ”سہیل پر دروہیوں میں بولا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

ڈیڈی کا: — ”راحیل کے لیے میں حیرت اور پریشانی تھی۔ آپ اور محرم؟“

انھوں نے پریشان نظروں سے ساتھیوں سے دیکھا اور ان کے سامنے لیا۔

ہاں میرے بچو! — ”اُن کا لہجہ کرناک تھا۔ میں تمہارا محرم ہوں۔“ تمہارا

گناہ گار ہوں۔ مجھ سے بہت بڑی تقصیر ہوئی ہے۔ میں نے تمہیں برباد کر کے رکھ دیا ہے۔
 آخر کس طرح ڈیڈی، راحیل، دیکھی بیوی میں پکارا۔

”میں تم سے جو جوری جوری ریس کھیلتا رہا ہوں۔“ وہ اضطراب آگئیں بیوی میں بولے۔

جوا کھیلتا رہا ہوں، خراب بیٹا رہا ہوں۔ لاکھوں روپیہ میں نے ان بدعادتوں کی نذر کر دیا
 ہے۔ دو لاکھوں کے دس لاکھوں روپیہ قرض ہو گیا تھا اس لیے فروخت کرنا پڑی بیویوں، گلوچی
 بیک لاکھوں روپیہ واجب الادا ہے۔ تو ایک کاغذ آگے بڑھا کر بڑی ہی بے قراری سے بولے۔

یونیکس کلائس آخر ہی موصول ہو رہے۔ ایک ملو کے اندر اندر دس لاکھ روپے دنیا میں
 اور ہمارے پاس نہ فرم سمیت چھ لاکھ کی بھی جائیداد نہیں ہے۔
 وہ خاموش ہو گئے تھے۔ اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے تم ہو گئیں تھیں اور مچھلنے کے لیے
 بے تاب تھیں۔ سہیل اور راحیل سمجھ ہوئے سے بیٹھے تھے ان کے دل میں خوف اور دہشت ابھر
 آئی تھی۔ وہ بالکل تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ سب کچھ ہی لٹ گیا تھا۔ اور لٹے بھلا۔
 کون جانتا تھا۔ ان کا باپ اب ان کا اپنا کچھ بھی نہ رہا تھا۔ اس بات کا انھیں غم نہیں تھا کہ سب
 کچھ لٹ چکا ہے۔ وہ تو ان کے باپ کی اپنی پتلی کردہ جائیداد تھی۔ لٹا دی تو کیا ہوا۔ لیکن
 بقایا جو چار لاکھ روپے انھیں ادا کرنا تھا۔ اس نے انھیں خوفزدہ کر دیا تھا۔ گھبرا دیا تھا۔
 چار لاکھ روپے کہاں سے آئے گا ان کی عزت جو رہے میں نیلام ہو جائے گی۔
 برسوں کا بنانا یا بھرم خاک میں مل جائے گا۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے
 وہ بوکھلا گئے تھے۔ ذہن پریشان تھے۔ دل مضطرب تھے اور خوف سے رنگ پیلے پڑتے جا
 رہے تھے۔ انھیں چار لاکھ روپے کی امانت کی کمی کرنے بے قرار کر دیا تھا۔ راحیل نے ٹوش
 کھول کر پڑھا پھر اس نے سہیل کو منہ دیا۔ اس نے بھی پڑھا پھر خاموشی پھیل گئی۔
 کچھ دیر بعد ایک دوسرے سے کچھ کچھ بغیر راحیل اور سہیل — اپنے اپنے کمرے
 میں اُٹے۔

ایک ملہ گزر گیا۔ مگر پوری ملک بھر کے بیوی بھی چار لاکھ روپے کا بندوبست نہ ہو سکا
 ٹوش کی میعاد گزرتے ہی ان کی فرم کا دلوالیہ اخبار کی ایک اہم سرخی بن گیا۔ انعام احمد کی
 تصویر بھی خبر کے ساتھ چھپی تھی۔ ان کی عزت نیلام ہو گئی تھی۔ بھرم اتر لٹ ہی گیا تھا۔
 اس روز ان کے گھر میں صفت اقامت ہو گئی۔ کسی نے کچھ کھانا نہ پیا۔ سوائے رشاد نے کے
 اور انھیں کچھ بھی یاد نہ تھا۔ لوگوں کے فون بار بار آ رہے تھے۔ مگر وہ کسی فون کا جواب نہ
 دے رہے تھے۔ ایک ملہ یہی انعام احمد کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ وہ برسوں کے

بہد لگتے تھے۔ اب جلد ہی ننگ ان کی تمام جائیداد پر قبضہ کر لے گا۔ یہ مد منہ اف کے لیے۔
 سوہان روح بنا رہا تھا۔ انہیں جان لیوا دھمکے رہا تھا۔ سہیں اور راحیل بھی انتہائی پریشان
 تھے۔ ارم اور شاد بہہ کوا بھی صبح صبح مالات کا علم ہوتا تھا۔ مگر وہ بھی انہیں دیکھ کر عجیب سی رہنے لگی
 تھیں۔ پریشانوں نے انہیں بھی گھیر لیا تھا۔

اگلی صبح اخبار احمد نے بھی پھٹی آنکھوں سے تازہ اخبار دیکھا۔ ان کے چہرے پر تعجب
 اور حیرت پھیلی ہوئی تھی۔ اخبار کے پہلے صفحے پر ایک شخص ارشاد احمد کی تصویر مصیبتی ہوئی تھی
 اور اس کے نیچے درج تھا۔ ارشاد احمد کو اس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے کہ انہوں نے اخبار احمد کے
 کاغذات کی بنگ خاں خورد برد کر دی ہے۔ اب ان کی جائیداد ضیاع نہ ہو سکتی تھی۔ سب
 خاں دوبارہ بننے پر ہی کہیں ہو سکتا تھا۔ اور خاں دوبارہ بنانے کے لیے کافی وقت لگا سکتا تھا
 ارشاد احمد حالات میں تھا۔ ادا پولیس نے اس کا ریمانڈ لے لیا تھا۔

انفکار احمد بے قراری سے لپک لپک کر اپنی جگہ سے اٹھے اور فرار کو نالادی۔ لو کہان کی
 آواز سن کر فوراً اُٹھ گیا۔ انہوں نے سہیل اور راحیل کو بلائے کہ بیٹے کہا وہ فرار کر کے جانے کے
 چند منٹوں میں لان کے کمرے میں آگئے۔ ان کے چہرے پر اذیت ناک آرزو تازات پھیلے ہوئے
 تھے۔ وہ بڑے ہی یلوس اور طول دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کو دیکھ کر بھری
 نظروں سے دیکھا اور ایک لمبا سانس لیا۔ پھر اخبار ان کی طرف اشارہ کیا۔

”اس تصویر کو دیکھو۔“ انہوں نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ پھر تصویر کی نیچے لکھی
 ہوئی عبارت کو دیکھ کر کہا۔ ”اُداس نیچے لکھی ہوئی خبر کو پڑھو۔“

”سہیل اور راحیل نے گہری نظروں سے تصویر کو دیکھ کر تحریر پڑھی۔ وہ شدید رنج
 سہیل نے اخبار سے نظریں اٹھا کر اپنے والد کو استفہامیہ انداز میں دیکھا۔ راحیل بھی ایسی ہی
 نظروں سے اپنے والد کو دیکھنے لگا تھا۔

”ڈیڈی!۔۔۔“ سہیل بولا۔ ”یہ کون صاحب ہیں جنہوں نے ہم پر اتنا بڑا احسان

کیا ہے۔

یہ غریب انسان ہے۔ ”مہر خجندہ احمد میں بولے مجھے میں نے برسوں پہلے حضرت سے ٹھکرا دیا تھا۔“

یہ ایک عہد خاموشی ہو گئے اور باری باری بوجھ میں احمد اہل کے چہرے پر دکھایا۔

اب جلدی سے چلے۔۔۔۔۔۔ وہ بھلتے سے بولے: ”ہیں اس فرستہ میرت۔ انسان کی ملاقات کو جانا ہے۔ وہاں جا کر تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ کہ اس نے ہمارے خاندان پر اتنا بڑا احسان کیوں کیا ہے۔ اس نے ہماری عزت بچانے کے لیے اپنی آزادی کو کٹے داؤ پر لگا دیا ہے۔“

ان کے چہرے پر مستفسرانہ تاثرات پھیلے رہے مگر انہوں نے کچھ نہ بوجھا۔ اور اپنے والد کے ساتھ گاریں میں بٹہ کر حوالات کی طرف ہو لیے۔

بڑی مشکل سے انہیں ملاقات کی اجازت ملی۔ اور وہ ایک گلی پر پارکر کے حوالات کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ سہیل اور راجل کے سامنے ایک ایسا انعام تھا جسے دیکھ کر ان کے منہ حیرت سے کھلے کھلے رہ گئے۔ شبیلہ اور نجی نے ان کے تدموں کی ہمہ دے پٹ کر انہیں دیکھا تھا۔ بلکہ سب جگہ تھے لوگ وہاں موجود تھے ان کو تعجب سے دیکھا تھا۔ قصہ اور نجی کی امی بھی شبیلہ اور نجی کے ہمراہ وہاں کھڑی تھیں۔ سلاخوں کے پیچھے سے ارشاد احمد نے انتظار احمد کو دیکھ دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر حیرت کی ہلکی سی پگہ لگی تھی۔ اور دل سے اٹنے والے بے مشرق جذبات کی کئی آنکھوں میں لیے ہوئے تھے۔ بال ہی حالت انتظار احمد کی سختی بدولتی بغیر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

میرے پیارے بھائی!۔۔۔۔۔۔ انتظار احمد نے کہا اور لپک کر انہی سلاخوں کے

قریب آ گئے۔

”بھائی جان!۔۔۔۔۔۔ ارشاد احمد کی ہچکچاتی ہوئی آواز سنائی دی وہ سر لٹے دو لوں پہلی

محبت سے ایک دوسرے کا ساتھ تمام چکے تھے۔
دو لڑکی انکھوں سے آنسو بہہ نکالتے تھے۔

میرے پیارے بھائی ————— "افتخار احمد بھائی ہونی آواز میں بولے، مجھے ملامت
کردینا میں نے بہتیں سمجھا نہیں تھا میں مجرم ہوں ————— سب کا مجرم —————
خود کو مجرم کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ نے جو کچھ کیا تھا میں اسے سہواً اگلا ہوں۔
اور اب میں نے جو کچھ کیلئے اپنے خاندان کی عزت کو بچانے کی کوشش میں کیلئے یہ میرا فرض
تھا، ارشاد احمد لے رقت آمیز آواز میں کہا۔

دو لڑکی انکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، اور ساتھ بار بار جوش و محبت سے دباے
ماتے تھے، عفو اور درگزر کا یہ منظر اتنا دلگداز تھا جس نے سب کو تڑپا دیا تھا، سب کی آنکھیں
پر غم ہو گئی تھیں۔

مخوڑی دیر کے بعد افتخار احمد نے سہیل اور راحیل کی طرف رخ کیا۔
"میرے بچو! یہ تمہارے چچا ہیں جنہیں میں نے آج سے بائیس برس پہلے جھگڑا کر گھر سے
نکال دیا تھا، اور کبھی پھر تعلقات درست کر کے کی کوشش نہ کی تھی، یہ میری کتنی بڑی سچوئل
تھی، بھائی، بھائی ہی بڑا ملے، یہ مجھے آج معلوم ہوا ہے، اب تو میرے اور ارشاد کے فتنے
کا نہیں پتہ چل گیا ہے نا!"

راحیل اور سہیل نے اثبات میں سر ہلایا۔
اور چند لمحوں بعد سب نے میرے دیکھا کہ ارشد، فاحرہ اور اس کی امی بھی تڑپے
آہستہ چلتے چلتے ان کی طرف آ رہے تھے، انہیں بھی اخبارات سے سب کچھ پتہ چل گیا تھا۔
راحیل سہیل، شبیلہ اور بچی نے ایک دوسرے کی طرف استغفار طلب نظروں سے
دیکھا۔

مخوڑی دیر کے بعد سب کا آپس میں تعلقات ہو گیا، اب سب ایک دوسرے سے مل

حرف تک نہیں آتا۔

وہ خاموش ہو گئے اور سب نے اسے تشکر بھری نظروں سے دیکھا۔ سہیل اور شکیلہ
 کنکلیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر زیر لب مسکرائے۔ پھر انہوں نے فدا ہی چہرے
 جھٹکالے۔ سب اپنے اپنے خیالوں میں الجھ ہوئے تھے۔ کسی نے بھی ان کی اس حرکت کو نہ دیکھا۔
 قرین ادا کر دیا گیا اور شام سے پہلے ہی ارشاد احمد رک کر دیئے گئے۔ انہیں روپیہ دینے
 کے بعد بھی رک کر لے میں بیٹے اشدور سوئے سے کام لینا پڑا تھا اور یہ سب کام نفور نے کیا تھا۔
 سب نے اس کے حسن سلوک کو پاکیزہ عبارات سے قبول کیا تھا۔ اور بڑے پر محسوس۔
 الفاظ سے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

آج افتخار احمد نے اپنے سب عزیزوں کو دعوت دی تھی۔

ڈنر بڑا ہی پر تکلف تھا۔ سفید دلی پوش لوکر ڈرائنگ روم میں ٹیبل کے ارد گرد کھڑے پوری منہ ہی سے خدات سرانجام دے رہے تھے۔ ڈنر کے دوران میں ہنسی، خوشی، مذاق، ہلکی پھلکی جھیمر چھاڑا، سنجیدہ باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ برسوں کے بعد خاندان کے سب لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔ سب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ شاہدہ اپنی مصحوم بالحق سے سب کو ہنسارہی تھی۔ سب ہنس رہے تھے۔ ساری کائنات ہنس رہی تھی۔ فارغ النبالی بھلا افتخار لاج پر مہربان ہو گئی تھی۔ اور اپنی مسکلاہٹ ان پر فرخ دل سے نچھاور کر رہی تھی۔ دل نشیں مسکراہٹوں اور پیاری پیاری باتوں کے پھول تھک رہے تھے۔

افتخار احمد اپنی عمیق نظروں ارشاد احمد کے چہرے پر جا دیں کچھ دیر دیکھتے رہے۔ ارشاد تم بقور کو اپنا بیٹا ہی سمجھو۔ اس خوشی کے موقع پر راحیل کو بھی اپنا بیٹا بنا لو۔ راحیل اور خبیلا کی چوڑی ہنست اچھی رہے گی؟

ارشاد احمد مسکراتے لگے۔ رابعہ بیگم بھی مسکرا رہی تھیں۔ خانہ کے ہونٹوں پر لہک

دلوازا تبسم تھا، فخرہ کی امی کے ہونٹوں پر بھی ہنسی کھیلنے لگی تھی، راحیل نے خنرم سے سرخ ہوا چہرہ جھکا لیا تھا، مگر تصور سہیل اور شبلیہ کا دل دھککے رہ گیا تھا۔ ان کے چہرے پیٹے پڑ گئے تھے، وہ ایک دم اندر رہ گئے تھے، خوف اور دہشت کی ایک لہر ان کے دل میں اتر گئی۔ انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا، امداد ارشاد احمد کی طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ ان کی موت کا فیصلہ منانے والے ہوں۔

ارشاد احمد غور سے توقف کے بعد شکر اے۔

شبلیہ! آپ کی بیٹی ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟
 آخر ان کی موت کا فیصلہ منہ ہی دیا گیا، انہیں بالیوسیوں اور دیرانیوں نے گھیر لیا۔
 تصور نے اپنے دوست سہیل کی محبت کو کامیاب بنانے کا وعدہ کر رکھا تھا، اس نے سوچا وہ یہ شادی بھی نہ ہوتی تھی گا، بڑا بھائی پھوٹے بھائی کی محبت پر ڈاکہ نہیں ٹال سکتا، یہ غلط ہے اندر صبر ہے، سراسر نا انصافی ہے، وہ انصاف کے تقاضوں کو کبھی نہ ملے دے گا وہ سوچوں میں گھرا ہوا تھا، سہیل اور شبلیہ ایک دوسرے کو خوف زدہ اند پریشان نگاہوں سے دیکھ رہے تھے،

”الاجہ ہیں!۔۔۔“ امتن ارشد الجہیم کی طرف دیکھ کر شکر اے، ”آپ نے تو کوئی جواب نہیں دیا، آپ بھی تو کچھ کہیے!“
 ”ہماری اس سے بڑی اور کیا خوش قسمتی ہوگی۔۔۔“ وہ نرم لہجہ میں بویں کہہ رہی تھی بیٹی اپنوں میں چلی جائے گی۔
 سب کے چہروں پر شرمیں جھلک رہی تھیں۔

تصور سہیل اور شبلیہ کے چہرے تاریک تھے چہروں کی طرح دلوں میں بھی اندھرا تھا فدا سی دریں ہی ان کی خوشیاں بہا د ہو کر رہ گئیں، محبت کے وہ محلات زمین بوس ہوئے۔

دکھائی دے رہے تھے۔ جو انہوں نے بڑی جدوجہد کے بعد دیکھے تھے۔ ان میں املاؤں،
تھاؤں اور خواہشوں کے پھول پھلا رہے تھے۔

نقصہ اور سہیل کے علاوہ سب نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ سہیل مبارکباد
کی آوازوں میں تیزی سے اٹھا اور ڈرائیونگ روم سے نکل گیا۔ اس کے اس طرح اٹھ کر جانے
کو سب نے حیرت سے دیکھا۔ شبیلہ کا دل بھی وہاں سے اٹھ کر جانے کو چاہ رہا تھا۔ مگر ایک
سمیک سی مائنر ہی تھی۔ وہ اٹھ کر نہ جاسکی۔ وہ دوسروں کو کسی قسم کے شک کا موقع نہ
دینا چاہتی تھی۔ چہرے پر یہ انیاں تھیں۔ اور دل بول کھا رہا تھا۔ وہ مالیوس وولگیر سی پھی
تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے بغیر بھی خواہش رکھنے کے باوجود مصلحتوں
کی بنا پر وہاں سے اٹھ نہ سکا تھا۔

راجیل نے سہیل کو اس طرح اٹھ کر جانے ہونے تعجب سے دیکھا تھا۔ اس کے اداں
چہرے اس کے دل پر چوٹ سی پڑی تھی۔ اور وہ بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چلا گیا تھا۔
سہیل اپنے کمرے میں اک کپڑے کی کھڑکی کے سائے کھڑا ہو گیا تھا۔ اور آسمان پر نہ ملتے ہوئے
تاروں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اسے اپنے ہی طرح بے بس دکھائی دے رہے تھے۔

قدموں کی آہٹ سے وہ چونکا اور گھوم کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کمرے کی روشنی میں اپنے
بھائی کو اتنے نوئے دیکھ رہا تھا۔ راجیل چند قدموں کے فاصلے پر رک گیا اور اسے گہری گہری
منتظرانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”بڑے پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ اس نے نرم لہجہ میں کہا۔ معلوم ہوتا ہے میری
شادی کی خبر تمہیں خوشی نہ دے سکی۔“ تم نے مجھے مبارکباد بھی نہیں دی :-

اس نے تھوڑی دیر اپنے بھائی کی نظروں سے نظریں ملائی اور پھر اس کے ہونٹوں
پر ایک سبکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”دوسروں کی خوشیوں کے سچو لوں سے اپنے مہمان سجانے والوں کو کون مبارکباد دے

مکتا ہے۔

اس کا پتہ تلخ تھا۔ سہیل کے اس بچے سے راحیل لڑ گیا، اس نے اسے گھوڑا۔
 میں اتنا سنگدل نہیں ہوں۔ ”وہ نیچے لیجے میں بولا۔ اپنی بات واضح کرنے کی۔
 کوشش کرو۔“

بات بالکل واضح ہے۔ اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ آگئی۔ ”آپ نے شبیلہ کی خواہشوں کو تنا کر لے کی کوشش کی ہے، اس کی تمناؤں کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔“
 میں نے سمجھ نہیں کیا؟ یہ ڈیڈی کا فیصلہ ہے۔ ”وہ خداداد کر بولا۔ اہ پھر بھلا
 شبیلہ کی تمناؤں کس طرح برباد ہو گئیں؟“
 ”راحیل سہیل کو گہری گہری نظروں سے گھور رہا تھا۔ اہ سہیل چپ چاپ کھڑا تھا۔
 پھر وہ کھمکھمایا۔

”بربادیاں بنا سکتا ہوں۔“ اس نے جبرائیل کے کہا۔
 ”تو بتاؤ۔۔۔“ وہ سرد بچے میں بولا۔ ”میں سُننے کے لیے تیار ہوں؟“
 ”شبیلہ کسی اور کو چاہتی ہے۔۔۔“ وہ تلخی سے بولا۔ ”دختر کوئی لگانے چیل کوئی
 کھائے۔ اس دنیا کا دستور سبھی لڑا ہے۔“ عجیب بے یہ دنیا۔۔۔
 ”اس بات سے راحیل کے دل میں نامعلوم سے خدشے سرسبز لگے تھے ادا اس
 کارنگ اڑ گیا تھا۔

”وہ کس کو چاہتی ہے؟“
 دو لڑائی ایک دوسرے کو سرد نظروں سے دیکھنے لگے۔
 ”تمہارے بھائی کو چاہتی ہے۔“ اس نے حوصلہ کر کے کہہ ہی دیا۔ ”مجھے چاہتی ہے؟“
 ”تمہیں چاہتی ہے۔۔۔“ راحیل کے ہونٹوں پر طنز آمیز تلخ تبسم اُبھرا۔ ادا اس
 لادل دھک دھک کر لے نکلا۔

”اے آپ ہیں کہ اسے میری بھابی بنائے جا رہے ہیں۔“ سہیل جیسے جوش غم اور غصے سے ہانگی سا بھرا ہوا تھا۔ حالانکہ اسے آپ کی بھابی بننا چاہیے تھا۔
 راجین کا مضبوط جواب دے گیا۔ سہیل کے مخاطب کے اس انداز نے اسے سب پا کر دبا۔ وہ اس کی اس جرات سے جوش میں آ گیا۔ ان غصے سے بے قابو سا ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سہیل کے رخسار پر ایک بھر پور تھپڑ مار چکا تھا۔ تھپڑ کھانے والے سہیل بھی بے قابو ہو گیا۔ اس کے حواس پھلے ہی جواب دے رہے تھے۔ وہ قہر لیا آنگی کے عالم میں پھلے ہی تھا۔ تھپڑ نے اسے اچھٹا کر دیا۔ احترام و ادب کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کا ہاتھ اٹھا اٹھا اپنے بڑے بھائی کے رخسار پر تھپڑ کا نشان بنا کر دوپٹے سے دھو گیا۔ راجین نے اپنے رخسار پر ہاتھ رکھ کر دیکھ بھری نظروں سے سہیل کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ دیکھ کے آنسو۔

تم نے عزت و احترام کے سبب بندھن توڑ دیے ہیں۔ راجین میرا بیٹا
 آواز میں بولا مگر خدا کے لیے اس بات کا کسی کو پتہ نہ چلے۔
 سہیل نے اپنے بھائی کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ دوسرے لمحے اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔ اور اس نے نور سے کہی بار سر کو جھینکا دیا جیسے اس فعل پر اس کا ضمیر اسے زبردست ملامت کر رہا ہو۔

وہ جو شیلے انداز میں روتی ہوئی آنکھوں سے اپنے بھائی کو ایک نظر دیکھ کر گھوما۔
 اور تیر تیر قدم اٹھاتا اپنے منہ کے قریب چلا گیا۔ اور دھارے سے پستول نکال لیا۔ اس کے بھائی نے چونک کر پستول سہیل کے ہاتھ میں دیکھا۔ اس کا رنگ ہلکا پڑ گیا۔
 تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو؟ خوف سے اس کی آواز لہلہا رہی تھی۔ اپنے بڑے بھائی کی جان لینا چاہتے ہو؟

سہیل نے آنسوؤں سے لبریز دیکھ بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہیں، میں اب اتنا کمباز بھی نہیں ہوں؛ اس لئے پستول کی نالی اپنے ہی ہاتھ کی طرف کر دی اور بھارتی ہوئی بوجھل آواز میں بولا، ”میں اس ہاتھ کو سزا دینا چاہتا ہوں جو آپ کی طرف مٹھا تھا۔“ میں اس ہاتھ کو اڑا دینا چاہتا ہوں جس نے قسطنطین کے پردے چلک کر دیے تھے۔“

راہیل پہلی کی کسی تیزی سے سہیل کی طرف چھپتا اور اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر دباتا راہیل سہیل کا ہاتھ جس میں پستول دبا ہوا تھا پکڑ چکا تھا۔

”یہ کیا نادانی کر رہے ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے پستول چھیننے کی کوشش کی۔ ”چھوڑ دیر بھائی جان!“ وہ رقت آمیز آوازیں بولا، ”اس ہاتھ کو سزا مل ہی جاتی چاہیے۔“

تھوڑی دیر کی عرصہ میں ہی راہیل نے اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ پستول دے کر اس نے اپنے بڑے بھائی کو روٹی ہوئی کرنٹاک انگوٹوں سے غور دیکھا۔ ”اگر ہو سکے تو میری اس گستاخی کو معاف کر دینا بھائی جان! میں سہیت چلے

ادب ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

”سہیل۔“ راہیل کے لبوں سے بے اختیار سمجھرائی ہوئی آواز نکلی۔ اور اس کی آنکھوں سے تیزی کے ساتھ آنسو رواں ہو گئے۔ پھر وہ مدھال سا ہو کر کرسی پر گر پڑا۔ سہیل کار میں کچھ دیر بیٹھ گئے۔ پھر بے ہوش ہو گئے۔ مگر اس کے دل میں سنگتی ہوئی آگ تھنڈی نہ ہو سکی۔ وہ بھرپور جارہی تھی۔ ایک گھنٹہ آواز نہ گوی میں سر گھٹا رہنے کے بعد اس نے اپنے دوست راشد کے مکان کا رخ کیا۔ اور چند لمحوں میں اس گلی کے موڑ پر پہنچ گیا جس گلی میں اس کے دوست کا مکان تھا۔ اس نے کار موڑ پر ہی کھڑی کر دی اور خود راشد کی گلی کے مکان کا رخ کیا۔

راشد نے پریشان لگا ہوں سے اسے دیکھا سہیل اسے تھا تھا کھاسا کھائی
دیا۔ اس کے چہرے پر کھلم کھانا اور اذیت ناک تاثرات بکھرے ہوئے تھے۔ جن کا۔
اس نے گہری غفلتوں سے جان نہ لیا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ مسکرایا۔ ”آج تو بالکل ہی کچھ کچھ دکھائی دے
رہے ہو۔“

”زندگی اب بار محسوس ہونے لگی ہے دوست۔“ ہر ٹوٹ پر گہرے سے گہرا غم
لٹا ہے۔

کیا تک کا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا؟ اس نے ممانت سے کہا۔
”سب کچھ ہی دوست ہو گیا۔ اس کا لہجہ اضطراب انگیز تھا۔ گویا مناسب کچھ بریلو
ہو گیا۔“

”کیا تم یہ کہتا چلے آ رہے ہو۔“ وہ اسے متحیرانہ دیکھ کر لولا کہ تمام جا کیا آخرت کو فنا
پڑے۔“

اس نے اسے غصے سے دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں کچھ بھی فروخت نہیں کرنا پڑا۔
وہ تلخی سے لولا۔ عزت جا کیا دوست کچھ ہی بچ گیا مگر کچھ نہ بچ سکا تو دل ہی نہ بچ سکا۔
میری قسمت کا کارواں عین منزل پر پہنچ کر ٹلے دوست۔“
”کیا شبیلہ کی شادی نہیں اور ہو گئی۔ وہ چونک کر لولا۔

”نہیں نہیں ہوئی ابھی۔“ اس کا لہجہ بے حد برعیدہ تھا۔ مگر جلد ہی ہو جائیگا۔
سجائی جان کے ساتھ۔ سہیل نے آخری جلد اس کے چہرے کو بوند دیکھ کر کہا۔

”راہیل کے ساتھ۔“ ہیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور ہرے پڑا کھنکھائی
”ہاں میرے دوست!۔“ وہ تڑپ گیا نہ کہنا اذیت ناک مرحلہ ہے جو تقدیر
نے مجھ پر تنہا ہے۔ غم سے میرا دلچسپ شوق ہوا جا رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مر جاؤں۔“

"ایسی باتیں نہیں سوچا کرتے۔" اس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔
 "کیا شبیلہ سبھی راتیں سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔"
 "نہیں، وہ بولا۔ "جب ڈیڈی ابراہیم نے شبیلہ اور راحیل کی شادی کا فیصلہ سنایا
 تو اس کے چہرے پر تلخیاں بکھر گئیں۔
 "تو پھر گھبراؤ نہیں؟ اس نے اسے حوصلہ دیا۔ "شبیلہ تمہاری ہے۔" ہاں یہ بتاؤ کہ
 کیا راحیل کو بت ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"
 "بھائی جان کو پہلے تو کچھ معلوم نہیں تھا، لیکن اب میں نے بتا دیلے۔ بڑا تلخ۔۔
 ماحول پیدا ہو گیا تھا، مگر میں مکانی مانگ کر چلا آیا ہوں۔"
 "تو پھر گھبرانے کی کیا بات ہے، وعدہ مسکرایا۔ میں سمجھ لوں فیصلہ تمہارے حق میں ہو گیا۔
 راحیل دل کا برا نہیں ہے۔ اور پھر تم اس کے بہت ہی پیارے بھائی ہو۔ وہ تمہارے
 اہل خانہ کے غم کو اپنی شادی کی سبب نہیں بننے دے گا۔
 کمرے میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

سہیل پوری میں گاڑی کھڑی کر کے تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا اپنے کمرے میں پہنچا۔ رات کے دس بج چکے تھے، مگر شبیلہ اپنے کمرے میں اس کی منتظر تھی۔ انتظار احمد نے امرہ کر کے سب کو روک لیا تھا اور انہیں رات بسر کرنے کے لیے سچے سجائے کرے دیئے تھے۔ کوٹھی میں کروں کی کمی نہ تھی، سب کے ساتھ میں ایک ایک کمرہ آگیا تھا۔ شبیلہ نے ارم سے سہیل کے کمرے کی بابت دریافت کر لیا تھا، اُسے جو کمرہ ملا تھا وہ سہیل کے کمرہ کے بالکل سامنے تھا۔ شبیلہ کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھی اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ صبح سہیل کو اپنے کمرے میں لگے ہوئے چاند منڈ گدڑ لگے تو وہ بھی کرسی سے اٹھ کھڑے ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکلی اس نے اس کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے آنکھیں پونچھ لی تھیں۔ آنکھیں جو شام سے ایک جھیل بن چکی تھیں، آنسوؤں کی جھیل بن گئیں۔

اسے کیا معلوم تھا کہ راحیل کی اس دردناک لگائی ان کی محبت کا راز جاننے کے لیے بھیجی ہیں وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے اسی بات کا تو منتظر تھا۔ وہ یہی تو جانا چاہتا تھا، کہا انہیں ایک دوسرے سے محبت ہے یہی یا نہیں، وہ یقین کرنا چاہتا تھا، کہ کہیں

موت سہیل ہی تو شبلیہ سے محبت نہیں کرتا ؟

اسی اضطراب نے اسے ابھی تک چنگ پر لٹنے نہیں دیا تھا۔ شبلیہ کو سہیل کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ وہ ابھی اس سے محبت کرتی ہے۔

راحیل دل میں ابھرنے والے جذبہ عجبس کے تحت چین میں کھلے دانی کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ کھڑکی سہیل کے کمرے کی تھی مہا میں وہاں کھڑے ہو کر اس کی باقی سنا۔ چلتا تھا شبلیہ کو سہیل کے کمرے میں جاتے دیکھ کر اس کے دل پر زبردست چوڑ پڑی تھی۔ اُسے پریشانوں نے گھیر لیا تھا۔ وہ بہت ہی مضطرب اور اسفردہ حالت میں کھڑا تھا۔ کھڑکی پوری بند نہ تھی معمولی سی کھلی ہوئی تھی۔ راحیل نے درواز پر اپنی ایک آنکھ ٹکا دی

سہیل شبلیہ کے قدموں کی آہٹ پا کر طپا اور اسے غمگین نظروں سے دیکھنے لگا۔ ٹوٹ اتار کر اس نے ایک طرف پھینک دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گلے سے اتاری ہوئی مانی تھی۔ وہ اسے انگلیوں پر پسیٹ رہا تھا۔ شبلیہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئی تھی۔ اس کی چہرہ ادا سیوں اور دیوانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ شدتِ گریہ سے آنکھیں سرخ اور متورم ہو رہی تھی، اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے سہیل کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایک گہرا سانس لیا۔ اور لبوں سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی۔

کمرے میں سکوت پھیلا ہوا تھا۔

”تم رو رہی ہو شاید؟“ سہیل کی غیمت سی آواز ابھری۔

”اب تو شاید زندگی بھر وہی پڑے گا۔“

”تقدیر نے حالات تو ایسے ہی پیدا کر دیے ہیں۔“

”سنا ہے مجھ کو ارادے تقدیر پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔“

”تو کیا تم حالات سے نپٹنے کا فیصلہ کر چکی ہو۔“

انہیں میں پسند کیا ہوں میں تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا اپنا بھی نہیں سکتا جن دو سہایلیوں ہی
تمہاری مخلوق میں تو ایک کا سرگرتا ہے۔ اگر تم سرگرتا دیکھنا چاہتی ہو۔ تو اپنی خدمات
کو مجھ سے منسوب کر لو۔

”کچھ بھی ہو، لیکن — لیکن — اگر تم میرے نہ ہوئے تو میں خودکشی کر لوں گی
میرے مرنے سے تو یہ جھگڑا مٹ جائے گا۔“

”تمہارے مرنے سے ہی یہ جھگڑا نہیں مٹے گا اس کا بوجھ بہت ہی سنگین تھا۔ بلکہ۔
حاندان بھی برباد ہو جائے گا۔ میں بھی زندہ نہ رہ سکوں گا۔“

”تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی آواز یوں کہتا ہے اور وہ سسکیاں
لیتی ہوئی ہنسی۔ اور اس سے لپٹ گئی میری زندگی میں تم سے دور رہ کر مر جائوں گی۔ مرنے
جاؤں گی میں تم سے دور رہ کر۔“ سہیل تم سمجھتے کیوں نہیں؟
نیا کیا بچوں کی طرح رونے لگی ہو۔ حوصلہ کرو۔

”حوصلہ سب لوٹ گئے ہیں۔ وہ اسے زور سے بھینچ کر روٹی بوٹی بولی۔ میں سوچ
آئی اور ابا جان سے کہہ دوں گی مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ حجابات تم نہ کر سکتے وہ
میں کروں گی مجھے انجام کی کوئی فکر نہیں۔“

”اگر تم میں اتنی جرأت تھی تو وہ اسے پیار سے دیکھ کر بولا۔“ تو اسی وقت کمپوں
دال کا کرکھا جب ٹیڈی نے رشتے کی بات کی تھی۔“

”اتنے لوگوں کے سامنے کیسے کہہ دیتی۔ وہ آنسو پختہ ہوئے بولی۔“ اب اتنی
بے مہیا بھی نہ بن سکتی تھی جیسا کہ بھی تو سمجھ رہی ہے آخر۔“

”مجھ کو کہتے ہوئے جھجکا نہ ہو گی۔“ پہلی بار سہیل کے لبوں پر مسکراہٹ کی ہنسی

سی کیرا بھری تھی۔

نہیں! میں تو جانی میں اُس سے بات کروں گی: وہ میری اس تنہا کو کسی حال میں
نہ شکوایں گے؟

ایک ایک سوہیل کی نظریں کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک سایہ کھڑکی کے سلسلے
سے گھر رہا تھا۔ اس نے باہر دیکھا۔ چند قدم کے فاصلے پر راحیل سر جھکا کر چلا جا رہا تھا۔
وہ سب کچھ دیکھ کر چلا تھا۔
سب کچھ دیکھ کر چلا تھا۔

صبح ناشتے کے بعد افتخار احمد اور اشاد احمد کمر لائیں ریری روم میں چلے گئے جو رفتہ رات انہوں نے طے کیا تھا۔ اس کے متعلق باتیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اہلینان سے گتے دار کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اور اپنے اپنے سگریٹ سلائیے۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی قسم کی بات کرتے تصور معنی تلاش کرتا ہوا دباں پہنچ گیا۔ وہ بٹا اور اس اور ابھرا ابھرا دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے اس کے۔ چہرے کو تجسس سے دیکھا۔

”او! — بیوی بیٹے! — افتخار احمد نے مشفقانہ انداز میں کہا۔

”تم کچھ گھبرائے گھبرائے سے لگ رہے ہو؟“

”وہ خاموش بیٹھا رہا۔ کشمکش کے آثار اس کے چہرے پر اور گہرے ہو گئے۔

”جواب دے مایہ! — کیا بات ہے آخر؟“

”اگلا آپ گستاخانہ بھیجیں۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں عرض کروں؟“

”گستاخی کیسی؟“ — افکار احمد نے کہا — ”جو کچھ بھی کہتا ہے بے دھڑک کہو۔“
 اجلات لٹنے کے باوجود بھی وہ چند لمبے چپ رہا — آخر کار اس نے حوصلہ کر ہی لیا۔

”آپ حضرات نے جو فیصلہ رات کیا ہے۔ وہ کچھ درست نہیں۔“
 ”تم کہتا کیا چاہتے ہو؟“ — افکار احمد متعجبانہ بولے، ”شبیلہ اور سہیل کی شادی نہیں ہونی چاہیے۔“
 ”جی اٹکل! اس نے سیدگی سے کہا۔“
 ”کیوں آخر؟“ ارشاد احمد گہرا کر بولے — ”اس میں کیا قہاحت ہے۔“

”سب سے بڑی قہاحت یہ ہے۔“ کہ یہ شادی شبیلہ کی مرضی کے خلاف ہے۔ ”وہ نظریں جھٹکا کر بولا۔“
 ”شبیلہ کی مرضی کے کیوں خلاف ہے۔ ارشاد احمد پریشانی سے بولے۔“
 ”وہ سہیل کو چاہتی ہے۔“ لقمہ لے، ”بالآخر وہ مجھے ہی کہہ رہی دیا۔“

ارشاد احمد پر یہ خبر بھلی کی طرح گری۔ ان کا رنگ پہلے زرد ہوا۔ پھر لکڑی و مہر صرغ ہو گیا۔ ان کی آنکھیں لال انگارے کی مانند ہو گئیں۔ چہرے پر غم غلطی کے نشانات پھیل گئے۔
 افکار احمد بھی اس خبر سے ہلکا ہوا۔

”تھوڑا ———“ وہ جوشیلے لہجے میں بولے : ”تم ہوش میں تو ہو۔“
 ”جی چھا جان! ———“ وہ سکون سے بولا۔ ”میں پورے ہوش و
 حواس میں ہوں۔“

”وہ بد بخت اتنی خود سر ہو گئی ہے۔“ ارشاد احمد غضب
 ناک لہجے میں بولے۔

وہ غصہ میں بھر کر اٹھے اور کلبہ کی طرف جانے لگے۔
 افتخار احمد نے لپک کر انھیں پکڑ لیا۔ اور زبردستی کرسی پر بٹھادیا۔
 ”پاگل ہو گئے ہو ارشاد! ———“ انہوں نے اپنائیت بھرے لہجے میں
 کہا : ”ماہیل نہ بھی سہیل سہی۔ دونوں میرے بیٹے ہیں۔ دونوں تمہارے بھتیجے ہیں۔
 تمہارا خون ہے۔ گھر کی بات گھر میں رہنی چاہیے۔ کسی غیر نے تو ابھی رشتے کی بات نہیں
 سنی۔ ہم ابھی اعلان کر دیتے ہیں کہ شہیلہ کا رشتہ سہیل سے ہو گا۔
 میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اتنی خود سر ہو جائے گی : اُن کا لہجہ بہت
 رنجیدہ تھا۔

”سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ سب کچھ ہوا کیونکر۔“

ارشاد احمد بہت ہی رنجیدہ خاطر تھے۔

دفعہ ارجل کمرے میں داخل ہوا۔ وہ دروازے پر کھڑا ہو کسان کے مابین
 ہونے والی تمام گفتگو سن چکا تھا۔ وہ انھیں تلاش کرتا ہوا دہاں اس لیے آیا تھا۔
 کہ شہیلہ کو اپنی شریک حیات بنانے سے انکار کر دے مگر اس کی توقع کے خلاف
 اندر پہلے ہی اس موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ سب کچھ سن چکا تھا۔ اب اس

لاہور دانے پر گھرا رہا ہے کار تھا وہ آہستہ آہستہ عدم اسٹا۔ ان کے قریب پہنچ کر ٹھہر گیا
ان کی نگاہیں اسی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

بچا جان! ———۔ راجیل ارشاد احمد کی طرف دیکھ کر کہہ لایا۔ میں بتا رہا ہوں
آپ کو، یہ سب کچھ ٹھیک تھا، شبیلہ نے ہماری فرم موٹر ٹریڈرز میں ملازمت کی
تھی۔ رام کے سلسلے میں شبیلہ سہیل کے پاس بھی آتی ماتی تھی۔ میں جوں سے
محبت کا جو مانا ایک فطری امر ہے۔ پھر اس نے نظریں جھکا لیں۔ اس سے
آگے اور میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مجھے بھی معلوم ہو چکا ہے۔ میں ان کی باتیں سن
چکا ہوں۔ وہ واقعی ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اور مجھے اس سے خوشی ہوگی
کہ وہ شریک زندگی بن جائیں؟

اب کسی کے پاس بھی کچھ کہنے کو نہیں رہ گیا تھا۔

پنجابی سہیل اور شبیلہ کے رشتے کے بارے میں سب کو بتایا گیا۔ سب نے
حیرت کا اظہار کیا۔ مگر جلد ہی سہیل اور شبیلہ کو مسکراتے دیکھ کر اس رشتے کی نوعیت
کو سمجھ لیا گیا۔ ———۔ سب حیرت کے بجائے شادمانی کا اظہار کرنے لگے لیکن
ان مسرتوں اور شادمانیوں کے بیچ کچھ انسر دگیاں بھی تھیں۔

دو چہرے ایسے بھی تھے جو تاریک اور دیوانہ تھے جن کے لیے یہ خبر
اندوہناک بن گئی تھی۔

ایک چہرہ نافذ کا اور دوسرا چہرہ اس کی امی رشیدہ بیگم کا تھا۔
وہ نافذ کے لیے سہیل کی آس نکالنے بیٹھی تھیں۔ ان کی یہ آس

جلد دم توڑ گئی

نازہ کے ذہن میں امید کا چسراغ جو راسخ اور تنہید کے رشتے
کاسن کر روشن ہوا تھا بجھ گیا۔

نازہ پریشان اور اندر دہ ، اور دل پر داغ سی ہو کر سب بھانوں
سے پھٹ اپنی امی کے ساتھ اٹھی اور سب سے اجازت لی ۔ اس کی امی
آگے تھیں اور وہ ذرا پیچھے ، سہیل ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہا تھا ۔
نازہ سے اس کی نظریں ملیں ۔ نازہ کی نظروں میں گہرا غم تھا ۔
بچے ہوئے چراغ سے دھواں اٹھ رہا تھا ۔

”یہ اچانک کامیابی مبارک ہو۔“

اس نے تلخ ہلچے میں کہا ۔

”تمہیں بھی۔“

وہ مسکرایا ۔

”یہ کہنے سے بہتر تھا کہ تم میرے سینے میں خنجر اٹھا دیتے تے“

وہ زہرا لہجے میں بولی ۔

اور

جھٹائی ہوئی دردانے سے باہر نکل گئی

سہیل کچھا سمجھ کر رہ گیا ۔

پھر ایک عجیب سی ٹسکا ہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی ۔

مسکراہٹ۔

جس میں نغمہ مندی کا نشہ تھا۔

محبت کا غرور تھا۔

اور

کامیابی و کامرانی کا اثر۔

نہیما — ایک مترنم لفظ خود بخود اس کی زبان پہ آگیا۔

—————

خاتمہ شد

